چشم و چراغِ کربلا

حضرت امام زین العابدینؑ کے فضائل و سوانح

پروفیسر مرزا حیدر عباس

چشم و چراغِ کربلا

حضرت امام زین العابدینؑ کے فضائل و سوانح

پروفیسر مرزا حیدر عباس

ناشر .... محفوظ بک ایجنسی مارٹن روڈ کراچی

طابع .... احمد برادرز ناظم آباد کراچی

طبع اول .... نومبر ۱۹۹۵ء

تعداد اشاعت .... پانچ سو ۵۰۰

قیمت .... ایک سو بیس روپے /۱۲۰

انتساب

اپنے والد مرزا ابرار حسین صاحب

اور تایا مولانا غضنفر حسین عروج بھرتپوری صاحب

کے نام

جن کے فیض تربیت کا اثر یہ کتاب ہے

ان مرحومین کی خدمت میں اس سے بہتر تحفہ کیا ہو سکتا ہے

دعا

یا الٰہی

یہ ناچیز ہدیہ اس کے دربار میں قبول ہو جائے جس کا تذکرہ ہے

الٰہی عبیدک بفنائک و مسکینک بفنائک و فقیرک بفنائک و صغیرک بفنائک

وفقیرک بفنائک

الٰہی اس کتاب کو لکھنے والے کیلئے بھی اور تمام پڑھنے والوں کیلئے بھی

باعث برکت و سعادت بنا

فہرست

تقریظ

از علامہ طالب جوہری

مرزا حیدر عباس ایک تجربہ کار اور منجھے ہوئے قلم کار ہیں انہیں نظم اور نثر دونوں صنفوں پر یکساں دسترس حاصل ہے جس کا ثبوت ان کی وہ مطبوعات ہیں۔ جو قارئین سے دادِ تحسین پا چکی ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زیرِ نظر تحریر سے قبل ان کی ساری مساعی خالصتاً ادبی میدانوں تک محدود رہی ہیں۔ البتہ موجودہ تحریر کیلئے انہوں نے ایک مذہبی موضوع کو منتخب کیا ہے۔ اور وہ ہے امام زین العابدین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت مبارکہ۔

سیرت نویسی مسلمانوں کا ایک قدیم علمی ورثہ ہے اور اس کا آغاز پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کی نگارشات سے ہوتا ہے یہی سبب ہے کہ آج جب سیرت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات ہوتے ہیں۔ رسول اکرم کی سیرت کے بعد دوسرے مرحلے میں ان اکابرین اسلام کی سیرتوں کی تدوین ہے جن کی ذات نور اول کا تسلسل اور جن کا کردار نبوت سے استفادہ ہے۔ اس فن کے مصنفین نے ماضی میں جو کچھ بھی تحریر کیا ہے وہ پورا ذخیرہ ان مصنفین کے ذاتی رجحانات و میلانات کا آئینہ دار ہے اور یہ فطری بات ہے اس لئے کہ دنیا کی کسی بھی تخلیق کو اس کے تخلیق کار سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ کسی گروہ نے اپنی تخلیق میں بیشتر توانائی اس پر صرف کی ہے کہ کونسا واقعہ کب وقوع پذیر ہوا گویا تحقیق کا محور سنین و شہور اور اعداد و شمار ہیں یہ سوانح نویسی کا عمل ہے۔ سیرت نگاروں کے دوسرے گروہ نے صاحب سیرت کے ذاتی اخلاق و کردار کے نمونوں کو جمع کیا۔ یہ شخصیت نویسی کا عمل ہے۔ تیسرے گروہ نے مختلف رشتوں اور حوالوں سے صاحب سیرت کے حالات تحریر کیئے یہ واقعات نگاری کا عمل ہے۔

آج جبکہ علم کے ہر شعبہ میں ترقی ہوئی ہے اور سیرت نگاری کے خدوخال بھی تبدیل ہو گئے ہیں آج سنین و شہور اور واقعات فن اور تجرید واقعات فن سیرت نگاری میں ثانوی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور ان کی جگہ تحلیل و تجزیہ نے لے لی ہے۔ اب واقعات سے استنباط کیا جاتا ہے۔ شخصیت کی مختلف جہتوں سے تحلیل کی جاتی ہے اور اس کے نفسیات کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے اور یہ طریقہ اس لئے زیادہ مفید ہے اس سے قاری کو انفرادی طور پر اور قارئین کو اجتماعی اور معاشرتی طور پر اپنی شخصیت یا شخصیتوں کی تشکیل میں بہت مدد ملتی ہے یہ جملہ ایک پوری بحث کا متقاضی ہے۔

زیر نظر کتاب ایک ایسی شخصیت کے بارے میں ہے۔ جس کی جہات کا احاطہ انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اس کے باوجود قلم کاروں نے اپنی استطاعت اور اپنے ظرف کے مطابق ان میدانوں میں اشہب قلم کو جولان کیا ہے اور خوب کیا ہے۔

مرزا حیدر عباس نے سید سجاد علیہ السلام کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو سامنے رکھ کر بڑی پر مغز اور نفیس علمی بحث کی ہے۔ اگرچہ اس پوری کتاب کے مطالعہ سے صاحب سیرت کی پوری زندگی کا خاکہ ذہن میں مرتسم ہو جاتا ہے لیکن بعض خصوصی جہتیں ذہن پر دوامی اور لازوال نقش بنا دیتی ہیں۔ قاری کو بعض مقامات پر مصنف سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مصنف کے اس جذبہ سے اختلاف ممکن نہیں جس کے تحت یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

مجھے امید ہے کہ کردار آل محمد علیہم السلام کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک اچھا سہارا ثابت ہوگی اور علمی و دینی حلقوں میں اس کی کماحقہ پذیرائی کی جائے گی۔

مرزا حیدر عباس قابل تحسین ہیں کہ انہوں نے اپنے قلم کی توانائیوں کو ایک مفید کام میں صرف کیا ہے اور ان سے بجا طور پر یہ امید ہے کہ وہ مستقبل میں بھی اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔

مقدمہ

قدرت نے انسان کے خمیر میں خیر بھی شامل کیا ہے اور شر بھی۔ نیکی بھی ودیعت کی ہے بدی بھی۔ گناہ کی رغبت بھی ہے ثواب کی بھی۔ خمیر انسانی میں جب یہ دونوں عناصر گندھے ہوئے ہیں تو کشمکش لازمی ہے۔ پھر دنیا کے در و بام۔ ترغیبات کے نقش و نگار سے سجے ہوئے بھی ہیں۔ ہر لذت ہر معصیت دامن دل کھینچتی ہے۔ گویا نفس انسانی جدھر بھی نظریں دوڑاتا ہے دلدل ہی نظر آتی ہے۔ گناہوں کی دلدل۔ لیکن قدرت نے ہمیں اس آزمائش گاہ دنیا میں برائیوں کی دلدل کے بیچ میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑ دیا ہے۔ اس نے محفوظ راستے بھی بتائے ہیں۔ اس نے ہدایت بھی نازل کی ہے۔ صامت ہدایت جو آسمانی صحیفوں کی شکل میں ہے اور ناطق ہدایت جو رسولوں کی شکل میں ہے۔ اور انسان زمین پر اپنے ورود سے آج تک اسی کشمکش میں گرفتار ہے کہ۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

دنیا کی ظاہری خوبصورتی آدمی کا دل لبھاتی ہے۔ دنیا کی راحتیں لذتیں عیش و آرام انسان کو دیوانہ بناتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ جب دنیا میں رہنا ہی ہے تو کیوں نہ مزے سے رہا جائے۔ لذیذ کھانے کھائے جائیں۔ اعلیٰ درجے کے لباس پہنے جائیں۔ شاندار مکانات تعمیر کیے جائیں۔ دولت اکٹھی کی جائے۔ ملکیت بڑھائی جائے۔ اقتدار ہو۔ غلبہ ہو۔ یہ خیالات جب عمل کا روپ دھارتے ہیں تو آدمی دنیاوی فائدے نفع، خوشی، کامیابی اور کامرانی کی طرف بڑھتا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا سفر ہے جسکی

کوئی آخری منزل نہیں ۔ کوئی انتہا نہیں ۔ خواہشیں بڑھتی جاتی ہیں ۔ ہر کوشش ہر مہم سر ہونے کے بعد ایک نئی مہم کا خاکہ تصور میں آجاتا ہے ۔ کامیابی کی ہر منزل پر پہنچتے ہی آدمی کی ہوس اسے ایک نئی اور دور افتادہ منزل کا پتہ دیتی ہے ۔ آدمی یہ بھول جاتا ہے کہ اسکی بنیادی ضرورتیں بہت کم ہیں ۔ دو روٹیاں ایک جوڑا کپڑا ۔ ایک پلنگ ۔ اسکا دسترخوان دراز سے دراز تر ہوتا جاتا ہے ۔ محل اسکی ہوس خواب کیلئے چھوٹا پڑجاتا ہے جو عیش حاصل ہیں انہیں ضرورت سمجھتا ہے اور اس طرح اپنے عیش کے دائرے کو تخیل کی طرح وسیع کرتا جاتا ہے ۔ جب آدمی کی طلب اتنی بڑھ جاتی ہے تو وہ لازمی طور پر دوسروں کا حق مارتا ہے ۔ جتنا بھی اسکے مال و دولت کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا ہے اتنی ہی دوسروں کی محرومی اور مایوسی بڑھتی جاتی ہے ۔ کیونکہ کہیں سونے چاندی کے ڈھیر پائے ہی نہیں جاسکتے جب تک ان کے نیچے تلف شدہ حقوق نہ پڑے ہوں ۔ جب ایک بادشاہ کے دسترخوان کی لذتیں جدتوں کا روپ بدلتی ہیں کھانوں میں نزاکتیں اور صناعیاں در آتی ہیں ۔ جب ہدہد کا مغز بطخ کی آنتوں میں رکھکر بادام کے تیل میں تل کر دسترخوان کی زینت بڑھاتا ہے تو کتنے گھروں میں لوگوں کو پیٹ بھر کر کھجور بھی نصیب نہیں ہوتی ۔ جب محل پر محل بنتے ہیں، کاخ خضرا تعمیر ہوتے ہیں تو کتنے لوگوں کے سر سے وہ چھت چھن جاتی ہے جو انھیں نصیب ہوسکتی تھی ۔ جب وہ پانچ کروڑ درہم جو ملک کے خزانے میں جمع ہونے چاہیئے تھے، سربراہ مملکت اپنے داماد کو دیدیتا ہے تو ہزاروں عام لوگوں کی ضروریات تشنہ رہ جاتی ہیں ۔ جب ایک آدمی مرتا ہے اور اسکا چھوڑا ہوا مال و دولت کا ڈھیر دربار میں لاکر رکھا جاتا ہے ۔ اتنا بڑا ڈھیر کہ ادھر کا آدمی ادھر سے نظر نہ آئے ۔ اور اسکی بخشش کی دعا مانگی جاتی ہے اور اسکی دینداری کی تعریف کی جاتی ہے تو اس ڈھیر کے نیچے کتنے لوگوں کی سسکیاں ہوتی ہیں جنکا حق مال جمع کرنے کی ہوس میں چھین لیا گیا تھا ۔

ہوس کا مرض تو ایسا ہوتا ہے کہ اسکے بعد آدمی دریا بھی پی جائے مگر پیاسا

رہتا ہے ۔ قارون نے اتنا مال جمع کر لیا تھا کہ اسکے خزانے کی کنجیاں چالیس اونٹوں پر بار ہوتی تھیں ۔ کیا دولت کی اس انتہا نے اسے ذہنی سکون دیا ۔ اطمینان قلب بہم پہنچایا ۔ نہیں ۔ ایک پل کے لئے بھی نہیں ۔ چنگیز خان نے آدھی دنیا فتح کر لی تھی ۔ اس کوشش میں اسے خون کی ندیاں بہانی پڑی تھیں، سروں کے مینار بنانے پڑے تھے ۔ شہروں کو مسمار، ملکوں کو برباد اور انسانیت کو سوگوار کرنا پڑا تھا ۔ کیا اپنے اس لمحے میں بھی جب اسکی روح بدن سے نکلنے والی تھی اسے یہ خیال آیا کہ اتنی زمین جتنی اس نے فتح کر لی ہے کافی ہے ۔ نہیں ۔ اس نے کہا کہ سفر جاری رکھا جائے ۔ اور ملک خطا کو ضرور فتح کیا جائے ۔ گویا عمر ختم ہو گئی لیکن ہوس ختم نہیں ہوئی ۔ ذہنی سکون نہ ملا ۔ دل کا اطمینان حاصل نہ ہوا ۔

پھر عمر بھر کی اس تگ و دو کا حاصل کیا ہوا ۔ جو لوگ دنیا کی ہوس میں مبتلا رہے اور جن کی تمام عمر کی سرگرمیوں کا مرکز و محور دُنیاوی لذتیں حاصل کرنا اور مال و دولت جمع کرنا تھا ان کی تمام کامیابیوں کو موت نے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ۔ اور موت تو آنی ہی تھی ۔ کوئی چیز اسکے راستے کی دیوار نہیں بن سکتی ۔ نہ اس سے بھاگنا ممکن ہے نہ اسے ٹالنا ۔ اور موت کے بعد سارا مال دنیا ، سونا ، چاندی ، جواہرات ، تاج و تخت ، بادشاہت ، اقتدار ، دولت ، جسمانی طاقت ، شہرت ۔ کوئی چیز فائدہ نہیں دے سکتی ۔ جسم کے مٹی میں دبا دینے کے ساتھ ہی تمام چیزیں بھی جن کے لئے آدمی نے اپنی ساری عمر صرف کی ، ساری توانائیاں خرچ کیں، تمام مصیبتیں سر پہ لیں، پریشانیاں اٹھائیں، تگ و دو کی ، کم از کم اس آدمی کے لئے خاک ہی ہو جاتی ہیں ۔

ہر آدمی یہ بات جانتا ہے اور سمجھتا ہے ۔ اسی لئے تو اسے دنیا سے جتنی محبت ہوتی ہے موت اسے اتنی ہی شاق لگتی ہے ۔ موت کا خیال ہی اس پر لرزہ طاری کر دیتا ہے کیونکہ موت کے ساتھ ہی یہ تمام چیزیں اس سے چھن جائیں گی جن کو اس

نے ایک عمر کی جدوجہد کے بعد جمع کیا تھا۔ لیکن یہ صرف کم سواد لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جن کی عقلیں کوتاہ ہوتی ہیں، جنکی سوچنے کی صلاحیتیں زنگ آلود ہیں۔

اہل حق کے لئے موت کا لمحہ ہی سب سے بڑا لمحہ مسرت ہوتا ہے۔ جبھی تو مرد مومن مسکراتے ہوئے اس دنیا سے جاتا ہے۔ اسے خوشی ہوتی ہے کہ وہ اپنے رفیق اعلیٰ کی طرف سفر کر رہا ہے۔ اسے مسرت ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی آزمائش گاہ سے سرخرو ہو کر جا رہا ہے۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ وہ دنیا میں رہا۔ لیکن اس نے دنیا سے دل نہیں لگایا۔ دنیا اس کے سامنے بہت سج بن کے آئی، بہت سنور کے آئی لیکن اس نے ہر دفعہ دنیا کو طلاق دی۔ اس کی زندگی کا ایک لمحہ بھی عبادت سے خالی نہیں تھا۔ کیونکہ اس نے جو کچھ کیا وہ حکم خدا و رسول کے مطابق تھا۔ اس نے جس سے محبت کی خدا کے لئے کی، جس سے نفرت کی خدا کے لئے کی، کسی کو قتل کیا تو اسلام کی خاطر اور کسی کو معاف کر دیا تو اسلام کی خاطر۔ اس نے کبھی کوئی کام اپنے نفس کی خوشی کے لئے نہیں کیا کیونکہ وہ خدا اور اس کے رسول کو عزیز تر رکھتا تھا۔ اپنی جان سے۔ اپنے ماں باپ سے۔ اپنی اولاد سے۔

ایسے انسان کو جس نے دنیا میں صرف عمل نیک کیا۔ زندگی کی ہر ساعت میں آخرت کو یاد رکھا۔ دنیا کو ہیچ سمجھا۔ بے حقیقت سمجھا۔ اسکی بنیاد کو ناپائدار خیال کیا۔ اسکی لذتوں کو عارضی جانا۔ اسکے فائدوں کو جلد ختم ہو جانے والا سمجھا۔ اسکے عیش کو فانی مانا۔ اور اسکی ملکیتوں کو حقیر تصور کیا۔ صرف آخرت کو اہمیت دی۔ صرف عقبیٰ کو وقعت دی۔ تقویٰ کو زندگی کا اصول بنایا۔ خوف خدا کو اپنے عمل کی بنیاد قرار دیا۔ فقر پر فخر کیا۔ فاقے پر شکر کیا۔ خود بھوکا رہا لیکن کسی سائل کا بھوکا رہنا گوارا نہ کیا۔ ایسے انسان کو جب موت کا قاصد یہ پیغام دے کہ خدا نے اسے اپنے حضور طلب کیا ہے تو کیا وہ یہ نہ کہے گا کہ خدا کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ کیونکہ اس نے جو زندگی

گزاری ہے وہ اس کے سامنے ہے اور رحمت الٰہی کے ثمرات اس کے پیش نظر ہیں۔ تقریب پروردگار کی منزل اس کی منتظر ہے۔

ایسا کردار رکھنے والا ہی نفس مطمئنہ کہلاتا ہے۔

اور آج کی دنیا میں ذہنی سکون، اطمنانِ قلب اور روحانی آسودگی صرف اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جو ہوس کے گرداب سے خود کو بچالے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ یہاں اچھے اچھوں کی قوت ارادی متزلزل ہو جاتی ہے۔

اسکی پہلی وجہ یہی ہے کہ عام آدمی کی نفسیات کا تقاضہ ہے کہ وہ وقت کے دھارے کے ساتھ ہے۔ جس طرح ایک بھیڑ کا منہ کسی طرف اٹھتے ہی دوسری تمام بھیڑیں اسکے پیچھے چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ یہی صورت عوام کے ساتھ ہے۔ جبھی تو کہا جاتا ہے العوام کا الانعام یعنی عوام جانوروں کی طرح ہیں۔ جانور بھی کبھی سوچنے سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اور اپنی بنیادی جبلتوں کے سہارے زندگی گزار جاتے ہیں جنکا سارا زور اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے پر ہوتا ہے۔ عام آدمی بھی یہی کرتے ہیں جیسا دوسرے لوگوں کو کرتے دیکھتے ہیں خود بھی ویسا ہی کرنے لگتے ہیں۔ دوسرے لوگ جو کر رہے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط۔ اس پر کبھی نہیں سوچتے۔ بس اپنی ضروریات پوری کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

معاشرے میں مذہب بھی چونکہ ایک بہت طاقت ور عنصر کے طور پر موجود ہے اس لئے عام لوگ مذہب بھی مانتے ہیں۔ لیکن صرف رسمی طور پر۔ اسکی روح سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ اس لئے کہ مذہب کی روح تک تو آدمی بہت غور و فکر کے بعد پہنچتا ہے۔ جب رسمی مذہب ماننے ہی سے کام چل جاتا ہے تو غور و فکر کی مصیبت کیوں مول لی جائے۔ ویسے بھی غور و فکر کے لئے فرصت درکار ہوتی ہے اور آج کی زندگی جتنی تیز رفتار اور ہنگامہ خیز ہے اس میں حصول دولت کی سرگرمیوں اور زندگی

سے لطف اندوز ہونے کے مشغلوں سے اتنی فرصت کون نکالتا ہے جو غور و فکر کرے۔

بطور ایک عام آدمی کے ہم جس رسمی مذہب پر یقین رکھتے ہیں اور عمل پیرا ہیں اسکا خاکہ کچھ یوں ہے۔

ہم مسلمان ہیں۔ خدا کو مانتے ہیں۔ رسول کو مانتے ہیں۔ کبھی کبھی نماز بھی پڑھ لیتے ہیں۔ روزہ بھی کبھی کبھی رکھتے ہیں۔ روزے سے زیادہ احترام کے قائل ہیں۔ کوئی کھاتا پیتا نظر آجائے تو پٹائی ضرور کر دیں گے۔ اسی طرح نماز سے زیادہ مسجد کے تقدس کا لحاظ کرتے ہیں۔ مسجد ڈھائی نہیں جا سکتی چاہے وہ غصب کی ہوئی زمین پر ہی بنی ہو۔ قرآن چونکہ بہت مقدس کتاب ہے اور ہم گندے بندے ہیں لہٰذا اسے ہمیشہ گھر میں سب سے اونچے طاق پر، کارنس پر، مچان پر یا الماری کے اوپر رکھتے ہیں۔ سنا ہے کہ جس قرآن پر گرد پڑے گی وہ محشر میں فریاد کرے گا۔ اس لئے اسے جزدان میں لپیٹتے ہیں تاکہ گرد نہ پڑے۔ اس کا پڑھنا ثواب ہے اس لئے رمضان میں تراویح میں تیس پارے تین دن میں ختم کر دیتے ہیں۔ ربیع الاول میں سیرت کے جلسوں میں جاتے ہیں۔ نعتیں سناتے ہیں۔ روشنی کرتے ہیں۔ مولوی صاحب کی تقریر سنتے ہیں۔ کوشش کر کے زیادہ سے زیادہ اچھا مولوی منگواتے ہیں۔ چاہے وہ کتنا ہی مہنگا کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ دوسرے محلے والوں سے بھی مقابلہ کرنا ہے۔ محرم میں مجلسیں کرتے ہیں۔ جلوس نکالتے ہیں۔ زنجیر کا ماتم کرتے ہیں۔ نیاز دلاتے ہیں۔ لنگر کھلاتے ہیں۔ حلیم پکاتے ہیں۔ کالے کپڑے پہنتے ہیں۔ کلاوہ گلے میں ڈالتے ہیں۔ نوحے پڑھتے ہیں۔ محرم کے بعد مسلسل شب بیداریاں کرتے ہیں۔ ساری انجمنیں بلاتے ہیں۔ رات بھر چائے پلاتے ہیں۔ نوحوں کے مقابلے ہوتے ہیں۔ نئی سے نئی طرز لائی جاتی ہے۔ ماتم کی پریکٹس کی جاتی ہے۔ دو مہینوں میں لاکھوں روپے اور اس سے بھی زیادہ قیمتی

وقت امام کے نام پر نثار کر دیتے ہیں۔

مذہب پر اتنا عمل کرنے کے باوجود بھی ہمارا معاشرہ کرپٹ معاشرہ کہلاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم بھلا کیا کر سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے ہم بے ایمانی کرتے ہیں۔ رشوت لیتے ہیں۔ ہیرا پھیری کرتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں۔ لیکن وہ تو سب کر رہے ہیں۔ بجلی کا میٹر الٹا چلانا یا بند کردینا، دفتر سے بچوں کے لئے دو چار پینسلیں اور رجسٹر لے آنا، کپڑا بیچتے ہوئے ذرا سا کم ناپنا، اور سبزی بیچتے ہوئے ذرا سی کم تولنا، کھانے پینے کی چیزوں میں ذرا سی ملاوٹ کر دینا، دوکان داری میں جھوٹی قسم کھا کے زیادہ قیمت بتا دینا، نوکری کے اوقات میں کام کم کرنا، جن کا کام محکمے سے پڑے ان کو ٹالنا تاکہ تنگ آ کے کچھ بچوں کی مٹھائی یا چائے پانی کے نام سے پیش کر جائے۔ آدمی موجود ہو تو اس کی خوشامد کرنا۔ چلاجائے تو گالیاں دینا برائیاں کرنا، غیر ممالک سے آتے ہوئے زیادہ مال لے آنا اور کسی کی سفارش سے یا کسی کی خدمت کر کے اسے نکال لانا، یہ سب باتیں چلتی ہیں۔ انکی کہاں تک پرواہ کریں۔ ویسے ہم جنت میں ضرور جائیں گے اس لئے کہ بحمد اللہ مسلمان ہیں۔ رسول اللہ کی امت ہیں۔

کسی کے دل کو چیر کے تو نہیں دیکھا جا سکتا۔ لیکن آدمی کے افعال اور اعمال سے اس کے عقیدے کا اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے۔

آپ انصاف سے بتائیں۔ ان اعمال، ان افعال، اس کردار کے باوجود کیا ہمارا یہ دعویٰ حق بجانب ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم اللہ اور اس کے رسول کو مانتے ہیں۔ ہم جنت میں جائیں گے۔

ایک ایسا آدمی جو مذہب اسلام کو صرف رسمی طور پر نہیں مانتا بلکہ اس کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اس کا کردار ہمارے کردار سے بالکل مختلف ہوگا۔

اسلام کی روح کے مطابق اسلام کو ماننے والا جب خدا کو مانے گا تو یہ بھی

مانے گا کہ خدا نے بندوں کو یونہی بیکار نہیں پیدا کیا ہے۔

پروردگار نے انسان کو اس دنیا میں اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ زندگی ان اصولوں کے تحت گزارے جو قرآن میں درج کر دیے گئے ہیں اور جن پر رسول نے عمل کر کے دکھایا ہے۔ ان اصولوں کے تحت آدمی تجارت کرے تو عبادت، نوکری کرے تو عبادت، زراعت کرے تو عبادت۔ بچوں کی تربیت کرے تو عبادت۔ بیوی کے لئے معاش کا بندوبست کرے تو عبادت۔

یہ دنیا فانی ہے، ناپائیدار ہے۔ چند روزہ ہے، یہاں ہمیں کچھ عرصے رہنا ہے، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ دنیا میں اس کے قیام کی مدت کیا ہوگی۔ یہاں سے جانا برحق ہے، اور پھر آخرت کی زندگی ہے جو جاوداں ہے، خلد ہے، ہمیشہ کے لئے ہے۔ جب ایک جگہ ہمارا قیام عارضی ہے اور ایک جگہ مستقل۔ تو عقل یہی فیصلہ کرے گی کہ وہاں کی فکر کرو جہاں قیام مستقل ہوگا۔

اب یہ ہمارے اوپر منحصر ہے۔ دنیا کو اختیار کریں یا دین کو۔ اس فانی دنیا میں اگر ہم نے چند دن عیش کر بھی لیا، راحت پا بھی لی۔ لطف اٹھا بھی لئے اور اس کے بدلے عذاب آخرت مول لے لیا جو ہمیشہ رہے گا تو یہ ہماری انتہائی بدنصیبی ہوگی۔ ہاں اگر ہم دین کو اہمیت دیں۔ دنیا میں آخرت کے نقطہ نظر سے رہیں۔ یہاں وہی کام کریں جنکا ثمرہ آخرت میں رحمت خداوندی ہوگا تو پھر یقیناً ہم فلاح پانے والوں میں سے ہیں۔

عقل کا تقاضا یہی ہے کہ ہم گھاٹے کا سودا نہ کریں۔ دنیا میں ہماری زندگی کتنی ہو سکتی ہے؟۔ ساٹھ ستر سال۔ چلیئے سو سال مان لیجیے۔ یہ بھی فرض کر لیا کہ اگر ہم دین اختیار کر لیں تو ہمیں دنیا میں مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا، تکلیفیں سہنی پڑیں گی۔ پریشانیاں ہوں گی۔ غربت و افلاس کے ساتھ گزر ہوگی فقر و فاقہ ہوگا۔ دنیا

کی وہ لذتیں اور نعمتیں ہمیں حاصل نہ ہو سکیں گی جن کا تعلق مال و دولت سے ہے۔
چلیئے یہ سب بھی تسلیم کرلیا۔ اب ایک پلڑے میں سو سال کی زندگی کی تکلیفیں اور پریشانیاں رکھئے اور دوسرے پلڑے میں جنت رکھ دیجئے۔ جنت جو ہمیشہ رہے گی۔ اب دیکھیئے۔ کیا یہ سو سال کی یہ تکلیفیں راحت میں نہیں بدل گئیں۔ دنیا میں کون سی جگہ اتنی حسین ہو سکتی ہے جتنی بہشت بریں ہے۔ دنیا میں کون ایسا خوبصورت محل تعمیر کر سکتا ہے جیسے جنت میں موجود ہیں۔ دنیا کی کس شراب میں وہ سرور ہے جو جام کوثر اور شراب طہور میں موجود ہے۔ دنیا کی کون سی عورت اتنی حسین ہے جو حوروں کے مقابلے میں آسکے۔

آنے والی کل کی راحت کو یقینی بنانے کے لئے آدمی آج زحمتیں اٹھاتا ہے۔ امتحان میں کامیاب ہونے کی خوشی کو حاصل کرنے کے لئے طالب علم کتنی راتیں جاگ کے کاٹتا ہے۔ تنخواہ ملنے کی راحت کو حاصل کرنے کے لئے ملازم کتنے دن مالک کا حکم مانتا ہے۔ ہر طرح کی دوڑ دھوپ کرتا ہے۔

جب جنت سے زیادہ عیش و آرام کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور وہ عیش بھی ایسا جو ہمیشہ باقی رہے گا تو کیا اس کے لئے دنیائے چند روزہ کی کچھ صعوبتیں انسان نہیں اٹھا سکتا۔ دنیا کی تمام مصیبتیں آدمی ہنس کھیل کر برداشت کر سکتا ہے بشرطیکہ اسے آخرت کا یقین ہو۔

اگر انسان کو خدا پر یقین ہے، آخرت پر یقین ہے، جنت و دوزخ پر یقین ہے، تو دنیا کے تمام مصائب و آلام بھی اسے حق کی راہ سے نہیں ہٹا سکتے۔ ہٹانا تو دور کی بات ہے۔ اسکے قدموں میں لرزش بھی نہیں پیدا کر سکتے۔

مسئلہ صرف یقین کا ہے۔

لیکن خدا پر یقین کیسے آئے۔

فلسفیانہ اور منطقی طور پر تو خدا کا وجود ہی ثابت کرنا مشکل ہے۔ یہ بات نہیں کہ وجود خداوندی پر کوئی دلیل نہیں۔ لیکن جب ایک انسان دلیل دیتا ہے تو دوسرا انسان اگر وہ پہلے سے زیادہ ذہین ہے تو اس دلیل کو کاٹ دیتا ہے۔

بہت عام دلیل ہے کہ کوئی چیز بغیر پیدا کرنے والے کے وجود میں نہیں آتی۔ تو یہ کائنات بغیر خدا کے کس طرح وجود میں آسکتی ہے۔ لیکن یہ دلیل آگے بڑھانے سے خود کٹ جاتی ہے۔ جب ہر چیز کے لئے پیدا کرنے والا لازم ہے تو خدا کے لئے بھی پیدا کرنے والا لازم ہے۔

چنانچہ خدا کے وجود کا ثبوت فلسفے اور منطق سے تو نہیں دیا جاسکتا۔ بحث سے یہ ڈور اور الجھتی ہے۔ اس کا سرا نہیں ملتا۔

یہاں آکر میں کافر ہوجاتا اگر تاریخ میں رسول کا کردار اپنے تمام جگمگاتے اور انمٹ نقوش کے ساتھ محفوظ نہ ہوتا۔

خدا کے وجود کا سب سے بڑا اور ناقابل تردید ثبوت محمد مصطفےٰ کا کردار ہے۔

کفار قریش جو رسول اللہ سے بہت ناراض تھے۔ اپنے خداؤں کے جھٹلائے جانے پر اسقدر برہم تھے کہ رسول اللہ کو قتل کرنے کے منصوبے بناتے تھے۔ وہ بھی اپنی تمام دشمنی کے باوجود انہیں صادق اور امین کہتے تھے۔ جس آدمی نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اسکا یہ کہنا کہ لاالہ الااللہ کیسے جھوٹا ہوسکتا ہے۔

یہ طے ہے کہ جب آدمی کوئی جھوٹ بولتا ہے تو اس سے اسے کسی فائدے کی امید ہوتی ہے۔ دنیا کے نقطہ نظر سے سب سے بڑے فائدے اقتدار دولت اور حسین عورت ہیں۔

جب رسولؐ نے اعلان نبوت کیا تو قریش ایک وفد کی صورت میں ابو طالبؑ کے پاس آئے اور کہا کہ ہم اپنی حسین ترین عورتوں سے محمدؐ کی تزویج پر راضی ہیں ۔ ہم انہیں اپنی تمام دولت دینے پر رضامند ہیں ۔ اور ہم انہیں اپنا سردار بنانے کو بھی تیار ہیں ۔ بس شرط یہ ہے کہ محمدؐ ہمارے خداؤں کو برا نہ کہیں ۔

اب دنیا کی ساری نعمتیں اور ساری لذتیں محمدؐ کے زیر قدم ہیں ۔ اور وہ بھی اس وقت جب کہ اعلان نبوت کو زیادہ دن نہیں گزرے ۔ محمدؐ اس پیشکش کو قبول کر لیں اور تمام زندگی عیش و آرام سے گزاریں ۔ تمام عالم عرب کی دولت ، سرداری اور حسین ترین عورتیں ۔ اگر خدا نہیں ہے تو آخرت بھی نہیں ہے ۔ اور آخرت نہیں ہے تو پھر صرف دنیا ہے ۔ اور دنیا کی تمام لذتیں اور نعمتیں کسی کسی ہی کو نصیب ہوتی ہیں ۔

لیکن محمد مصطفےٰ نے دنیا کی ان تمام نعمتوں کو ٹھوکر مار دی ۔ انھوں نے کہا "چچا ! خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو بھی میں اس اعلان سے دستبردار نہ ہوں گا کہ خدا ایک ہے ۔"

محمدؐ نے یہ نہیں کہا کہ عالم عرب کی دولت کافی نہیں ۔ ساری دنیا کی دولت چاہیے ۔ یہ نہیں کہا کہ تمھاری سرداری سے کیا ہوگا ۔ تمام دنیا کا بادشاہ بننا چاہتا ہوں ۔ انھوں نے وہ چیز سامنے رکھی جو ناممکن تھی ۔ اور اسکا تعلق نہ دولت سے تھا ، نہ سرداری سے ، نہ عورتوں سے ۔

محمد مصطفےٰ کا دنیا کی تمام نعمتوں کو ٹھوکر مارنا خدا کے وجود کا سب سے بڑا ثبوت ہے ۔

پھر یہیں بات ختم نہیں ہوئی ۔

رسول نے کفار قریش کی پیشکش کو ٹھکرا کر مصائب کو چیلنج کیا تھا کہ آؤ۔ تمام دنیا کی دشواریاں اس راہ پر ڈال دو۔ لیکن میں خدا کا پیغام پہنچا کر رہوں گا۔ اسکا نام اقصائے عالم میں بلند کر کے رہوں گا۔

لوگ پیٹھ پر اوجھڑی ڈالتے ہیں۔ ڈالیں۔ راستے میں کانٹے بکھیرتے ہیں بکھیریں۔ کوڑا سر پر پڑتا ہے پڑے۔ لوگ پتھر مارتے ہیں۔ ماریں۔ سماجی مقاطعہ ہوتا ہے۔ ہو جائے۔ میرے چہرے پر اطمینان کی روشنی رہے گی اور لبوں پر خدا کے نام کا نور۔

جتنا مشکل کام ہوتا ہے اتنے ہی بڑے آدمی کو سونپا جاتا ہے۔ رسول کا مشن بھی مشکل ترین تھا۔ وحشی جاہل اور اخلاق لحاظ سے تحت الثریٰ میں گرے ہوئے عربوں کا معاشرہ۔ اس میں اسلام کی شمع جلانی اور اپنے عمل سے وہ روشنی پھیلانی کہ جس سے چار دانگ عالم میں اجالا ہوجائے۔ رسولؐ کے پاس اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے نمٹنے کے لئے جو سب سے طاقتور ہتھیار تھا وہ خلق عظیم تھا۔ اسی کے آگے قبائلی عصبیت رکھنے والے عرب بے بس ہو گئے۔ ورنہ تلوار کا مقابلہ ہوتا تو وہ کٹ جاتے، مرجاتے، مگر اپنے اطوار نہ بدلتے۔

رسولؐ رحمۃ للعالمین تھے۔ وہ لوگوں پر تلوار کیسے کھینچ سکتے تھے۔ اور اگر وہ تلوار کے جوہر دکھا کر لوگوں کو اپنا مطیع بناتے تو تاریخ انسانی انہیں عظمت کا یہ تاج پہنانے پر مجبور نہ ہوتی جس کی چھوٹ سے تاریخ جگمگا رہی ہے۔ کیوں کہ تلوار سے تو دنیا کے ہر بادشاہ نے لوگوں کو مطیع بنایا ہے۔

رسولؐ کا تو معجزہ یہی ہے کہ انھوں نے پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹا ہے۔ اور انھوں نے لوگوں کو صرف مطیع بھی نہیں بنایا۔ انھوں نے لوگوں کی سوچ کو بدلا۔

صرف تئیس سال میں ایک وحشی معاشرے کو اخلاق کی معراج پر پہنچا دینا وہ کمال ہے جو صاحب معراج ہی دکھا سکتا ہے۔ رسول نے دماغ وضع کئے۔ دل بنائے۔ وقت کے دھارے کو موڑا۔ طبیعتوں میں نرمی پیدا کی۔ مزاجوں میں ایثار پیدا کیا۔ لوگوں کو فقر پر فخر کرنا سکھایا۔ علم گھٹی میں ڈال دیا۔ خلوص کی لہریں رگ و پے میں دوڑا دیں۔ طاقتور سے ٹکر لیکر اس کے نشہ غرور کو اتارنا سکھایا۔ ایسے لوگ پیدا کئے جو خوف خدا کے علاوہ ہر خوف سے ناواقف تھے۔ جنہیں رضائے الٰہی کے علاوہ زندگی میں کسی چیز کی جستجو نہ تھی۔

رسولؐ کی کامیابی یہ نہیں تھی کہ عرب کا ایک بڑا حصہ انکے زیرنگیں آگیا تھا۔ لاکھوں انسان انکی تعمیل حکم کے منتظر تھے۔ رسولؐ کی عظمت دنیا کے پیمانے سے ناپنے کی غلطی مت کرو۔ ورنہ حکومت کی سرحدوں کے پھیلنے کو اسلام کی شوکت سمجھوگے۔ رسولؐ کی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے وہ معاشرہ تشکیل دیا جہاں کھانا کھانے سے پہلے آدمی یہ سوچے کہ کہیں پڑوسی بھوکا تو نہیں۔ جہاں آدمی دوسروں کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ جہاں آدمی اپنی محنت سے روزی پیدا کرے اور پھر اسے خرچ کرتے وقت دوسروں کی ضرورتیں مقدم رکھے۔ جہاں کا حاکم خود کو معاشی طور سے غریب ترین آدمی کی سطح پر رکھے۔ یہ مکمل امن و سلامتی کا معاشرہ تھا جہاں ہر محبت اور ہر نفرت کی بنیاد خدا کی خوشنودی تھی۔

رسولؐ نے یہ مثالی معاشرہ قائم کر دیا۔ لیکن یہ معاشرہ اپنی صحیح بنیادوں پر اسی وقت تک قائم رہ سکتا تھا جب تک مذہب کی روح پر لوگ عمل پیرا رہیں۔

مذہب کی روح کیا ہے؟۔

مذہب کی روح یہی ہے کہ دنیا کو عقبیٰ کے لئے استعمال کرے۔ عمل دنیا میں کرے نتیجہ عقبیٰ کا پیش نظر رکھے۔ یہاں مصیبت اٹھائے وہاں کی راحت کے لئے

یہاں دے وہاں لینے کے لئے ۔ یہاں ہر قسم کا نقصان اٹھالے ۔ وہاں کے فائدے کے لئے۔ یہاں اپنا حق چھوڑ دے کہ خدا وہاں بہتر جزا دے گا۔ یہاں گلے میں رسی کا پھندا ڈلوالے ۔ وہاں کی سرفرازی کی خاطر۔ یہاں تین دن پیاسا رہے ۔ اس یقین پر کہ وہاں جام کوثر منتظر ہے ۔ یہاں بے کسی کے عالم میں گلا کٹوالے ۔ اس یقین پر کہ رضائے خداوندی کا تاج وہاں ملنے والا ہے ۔

لیکن دنیاوی حکمران تو مذہب کے رسمی پہلو کو اپناتے ہیں ۔ ان کا بس چلتا تو وہ دین کو یکسر ہی مسترد کر دیتے ۔ لیکن انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ اگر ہم نے بالاعلان دین کو مسترد کر دیا تو شاید اقتدار ہی چلا جائے اس لئے صرف اپنے اقتدار کے دائم و قائم رکھنے کی خاطر وہ مذہب کے ظواہر کو مانتے رہتے ہیں ۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل بھی کرتے رہتے ہیں ۔ رات بھر شراب پیتے ہیں۔ صبح نماز پڑھا دیتے ہیں ۔ اور دو کے بجائے چار رکعت پڑھا کر پوچھتے ہیں کہ ازید کم ۔ یعنی اور پڑھا دوں؟ ۔ ان کے نزدیک چونکہ دنیا ہی اہم ہوتی ہے اس لئے جب اقتدار ملتا ہے تو قرآن سے کہہ دیتے ہیں کہ اب تیرا میرا ساتھ ختم ۔ اور تخت پر قدم رکھتے ہی عوام کو صاف صاف لفظوں میں بتا دیتے ہیں کہ اگر کسی نے مجھ سے کہا کہ خدا سے ڈرو تو اس آدمی کو قتل کرادوں گا ۔ انہیں پتہ ہے کہ آسمانی ہدایت قدم قدم پر انہیں اپنی نفسانی خواہشات پورا کرنے سے روکے گی ۔ اور اپنی نفسانی خواہشات کے تو وہ بندے ہیں لہٰذا اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ وہ آسمانی ہدایت کا مفہوم تبدیل کر دیں ۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

وہ دین کا لبادہ اوڑھ کر اس کے حقائق کی روح کو زیر و زبر کر دیتے ہیں ۔ اور اسلام کی شکل اس چغہ کی طرح بنا دیتے ہیں جسے الٹ دیا گیا ہو ۔ حرام خدا کو

حلال اور حلال خدا کو حرام کر دیتے ہیں۔ اس طرح دین کا جسم تو باقی رہتا ہے لیکن روح منقلب ہو جاتی ہے۔ نام لینے والے رہ جاتے ہیں۔ عمل کرنے والے مفقود ہو جاتے ہیں۔

رسولؐ نے اپنے عظیم کردار سے لوگوں کے ذہنوں کو اس طرح تبدیل کر دیا تھا کہ انھوں نے حبِ دنیا دلوں سے نکال پھینکی تھی۔ لیکن رسولؐ کی وفات کے بعد انسانی جبلت نے پھر آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا لوگوں کے ذہنوں میں تربیت کے نقوش دھندلے ہونے لگے۔ اور پھر معاشرے کو حبِ دنیا کے سانپ نے ڈس لیا۔

رسولؐ بھی سیاسی فرماں روا تھے۔ لیکن آپ نے ہمیشہ غریب ترین آدمی کے معیار زندگی کو اپنایا۔ چٹائی پر بیٹھے، معمولی کپڑا پہنا، اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھایا، جو بھی موجود ہوئے انہیں کھانے میں شریک کیا، مسجد میں نشست رکھی تاکہ جو بھی ملنا چاہے آسانی سے مل لے۔ کسی مانگنے والے کو کبھی مایوس نہیں کیا، اپنا ہر معمولی کام خود کیا، اونٹنی کا دودھ دوہا۔ جوتا مرمت کیا۔ کام کے سلسلے میں صحابہ سے مساوات رکھی۔ جنگل سے لکڑیاں بھی اکٹھی کیں۔ خندق بھی کھودی۔ کبھی غریب اور امیر میں تفریق محفل میں روا نہ رکھی۔

لیکن رسولؐ کی عظیم شخصیت کے سائے سے محروم ہونے کے بعد امت نے سیاسی منظر کو بدلتا ہوا دیکھا۔ لوگوں نے معیار زندگی کے لحاظ سے رسولؐ کی پیروی کرنے کے بجائے قیصر و کسریٰ کی پیروی کی۔ تخت شاہی وجود میں آگئے۔ دیبا و حریر پہنے جانے لگے۔ جواہرات کی آرائش اور سجے ہوئے بلند و بالا محلوں کی رہائش اختیار کی گئی۔ حاجب مقرر ہوئے، دربانوں کو در کی نگرانی سونپ کر خود کو عام لوگوں کی دسترس سے دور کر لیا گیا۔ اب عمال کے ظلم کی شکایت کس سے ہو۔ ظالمانہ طریقے

سے محصول وصول کرنے والوں کے خلاف کسے وکیل کیا جائے۔ کس سے منصفی چاہی جائے۔ دسترخوان بڑا ہے لیکن کھانے والے خاص اپنے لوگ ہیں۔ داد و دہش کا بازار بھی گرم ہے لیکن عطایا اور ہدایا انہی کو دیے جا رہے ہیں جن سے سیاسی مصلحتیں وابستہ ہیں۔ خیرات نہیں دی جارہی ہے ایمان خریدے جارہے ہیں۔ زبان بند رکھنے کی رشوت دی جارہی ہے۔

حدیث اب بھی مسلمانوں کے لئے متاع دوجہاں سے عزیز ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسولؐ نے کیا کہا اور کیا کیا۔ کس چیز کی تاکید کی گئی ہے۔ کس چیز سے منع کیا گیا ہے۔ اب ہمارا طرزِ زندگی تو اسوہ رسولؐ سے بہت مختلف ہے۔ بلکہ متضاد ہے۔ پھر کیا کیا جائے۔ ان حدیثوں کا نشر ہونا بند کرادیا جائے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم وہ کام کر رہے جن سے رسولؐ نے منع کیا تھا۔ اب صرف وہ حدیثیں بیان کی جاسکیں گی جو ہماری طرز سیاست کو برا ثابت نہیں کرتیں۔ عبادت سے متعلق حدیثیں نشر کی جاسکتی ہیں۔ ان سے ہماری بادشاہت کو خطرہ نہیں ہے۔ کچھ کرائے کے عالموں کا بندوبست بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایسی حدیثیں تصنیف کریں گے جن سے ہمارا مسلک صحیح ثابت ہو۔ قرآن میں تو تحریف نہیں کی جا سکتی۔ وہاں نئی تاویلوں سے کام چلایا جائے گا۔ جہاں کچھ بس نہیں چلے گا وہاں منطقی مغالطے پیدا کئے جائیں گے۔ عمارؓ کے قتل کی ذمہ داری اس گروہ پر ہے جو انہیں لڑنے کے لئے میدان میں لایا تھا۔ نہ وہ گروہ عمارؓ کو اپنی حمایت میں لڑنے کے لئے لاتا نہ ہمارے سپاہی انہیں قتل کرتے۔

یہاں مذہب کی حیثیت رسم کی سی ہے۔ نماز پڑھنی ضروری ہے۔۔جمعہ کو جنگ ہو رہی ہوگی۔ آؤ ابھی فرصت ہے منگل کو ہی پڑھ لیں۔ شکست ہو رہی ہے۔ اینٹ پتھر جزدانوں میں لپیٹ کر نیزوں پر بلند کر دو۔ اور چلا کر کہو کہ قرآن ہمارے

تمھارے درمیان فیصلہ کرے گا۔ کم از کم اس وقت تو جان بچے گی۔ بعد میں کوئی ترکیب کر لیں گے۔

زمانہ اور آگے بڑھتا ہے۔ اب حکمران مذہب کے خلاف اور زیادہ دیدہ دلیر ہو گئے ہیں۔ منجنیقوں سے کعبہ پر گولہ باری کراتے ہیں پھر بھی امیرالمومنین کہلاتے ہیں۔ قرآن پر تیر مارتے ہیں پھر بھی امیرالمومنین کہلاتے ہیں۔ اپنی لونڈی کو بھیج کر جماعت کی امامت کرا دیتے ہیں۔ ابولیلی کو خلعت بخش دیتے ہیں اور اس وقت تک دربار میں بے لباس بیٹھے رہتے ہیں جب تک دوسرا لباس نہ آجائے۔

سونا اسی وقت تک اپنی قدر و قیمت رکھتا ہے جب تک وہ کھرا ہو۔ مسلمان ہونا اعزاز ہے لیکن اسی وقت جب ہم رسمی اسلام پر عمل نہ کر رہے ہوں۔ کیونکہ رسمی اسلام تو لباس کی طرح ہے۔ ایمان جب تک حلق سے نہ اترے کردار کیا بدلے گا۔ اور اگر کردار وہی ہے تو پھر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آدمی زبانی طور پر خود کو ہندو کہتا ہے یا مسلمان۔ بلکہ

ایسے تو مسلمانوں سے ہندو اچھے

کیونکہ وہ اسلام کو بدنام تو نہیں کرتے۔

وہ لوگ اگر نام کے بھی مسلمان نہ ہوتے تو بہتر تھا جن کے کردار سے غیر اقوام نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مسلمان بے ایمان ہوتے ہیں۔

یہ جاننے کے لئے کہ ہم رسمی مسلمان ہیں یا واقعی ایمان نے ہمارے دل میں سرائیت کی ہے سب سے آسان طریقہ ہے محاسبہ ــــــ ہم غیر جانبداری سے اپنے کردار کو پرکھیں۔ اگر اس میں کردار رسولؐ کی پیروی کی ہلکی سی بھی جھلک نظر آتی ہے تو ماشاءاللہ۔ خدا ہماری توفیقات میں اضافہ کرے۔ لیکن اگر ہم کبھی یہ سوچتے بھی نہیں

کہ اصل اسلام یہی ہے کہ رسولؐ کے کردار کی پیروی کی کوشش کی جائے۔ تو پھر روزِ حشر کی رسوائی یقیناً ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ اور اس رسوائی سے بڑی بدنصیبی کوئی نہیں ہو سکتی۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم اس رسوائی سے بچنے کی صورت سوچیں۔ اچھے اصول سب کو معلوم ہیں۔ لیکن سب ہی یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد

پر طبیعت ادہر نہیں آتی

اور اسکی وجہ یہی ہے کہ زبانی باتوں میں کبھی اتنی قوت نہیں ہوتی کہ دل پر اثر ڈال سکیں۔ جبھی تو رسولؐ نے پہلے عمل کر کے دکھایا پھر دوسروں کو عمل کرنے کا حکم دیا۔ گویا اچھے اصولوں کو اپنے عمل سے تقویت پہنچائی۔

دلوں کو یاد خدا کی طرف موڑنے کے لئے، اور ہدایت کے راستے پر ڈالنے کے لئے ان کے تذکرے پڑھنے ضروری ہیں جنھوں نے اپنی زندگیاں رسول اکرمؐ کے بلند ترین اخلاق اور عظیم ترین کردار کی پیروی کے لئے وقف کر دیں۔

علی ابن الحسینؑ کی زندگی کے مطالعے سے دل زندہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ مطالعہ ہمارے سامنے عبدیت کی ایک زندہ متحرک اور روشن مثال پیش کرتا ہے، ایسی مثال جو سنگ اسود کی طرح سخت اور منحرف دل کو بھی یاد خدا کے آب زم زم میں ڈبو کر اسے حجر اسود کی طرح مقدس کر دیتی ہے۔

علی ابن الحسینؑ کا ذکر یقیناً عبادت ہے کیونکہ یہ عبادت ہی کا ذکر تو ہے۔

سجاد سید سجاد سید الساجدین

عابد زین العبا زین العابدین

ذوالشفنات (جسکی پیشانی پر عبادت سے گھٹے پڑ گئے ہوں)

کیا شان ہوگی اس شخصیت کی جس کے تمام القاب عبادت سے متعلق ہیں

اگر میں یہ کہوں کہ یہ کتاب میں نے ان کے بارے میں لکھی ہے جو شیعوں کے چوتھے امام ہیں تو گویا میں نے ان کی شخصیت کو بہت محدود کر دیا۔ وہ صرف شیعوں کے لئے نہیں، صرف مسلمانوں کے لئے نہیں۔ بلکہ تمام انسانوں کے لئے منارہ نور تھے۔ کسی بھی انسان میں بطور انسان کے جو بہترین خصائل و فضائل ہو سکتے ہیں وہ علی ابن الحسینؑ کی ہمہ گیر شخصیت میں نہ صرف جمع تھے بلکہ کمال معراج کو پہنچے ہوئے تھے۔

انسان کی بڑائی کا اندازہ لگانے کے لئے ایک پیمانہ حسب و نسب ہوتا ہے۔ لیکن دراصل انسانی بزرگی اور شرافت کو آباؤاجداد کی بوسیدہ ہڈیوں میں ڈھونڈنے کے بجائے اسکے کردار میں تلاش کرنا چاہئیے۔ حسب و نسب کے اعتبار سے علی ابن الحسینؑ کو ابن الخیرتین کہا جاتا ہے۔ ماں کی طرف سے ان کا تعلق نوشیرواں عادل بادشاہ ایران سے تھا جس کا عدل آج بھی ضرب المثل ہے اور خود رسولؐ نے اسکے دور میں پیدا ہونے پر اسکی اسی صفت کی بنیاد پر فخر کیا ہے۔ اور باپ کی طرف سے رابطہ اس سے ہے جو فخر عرب و عجم تھا، شہنشاہ کونین تھا، جسے اس کے جانی دشمن بھی صادق و امین کہتے تھے۔ جو علم کا شہر تھا، جو دولت کائنات کا مالک تھا اور پیٹ پر پتھر باندھتا تھا، جو شاہ مدینہ تھا اور اپنے جوتے خود مرمت کرتا تھا، جس نے طائف میں اتنے پتھر کھائے کہ جوتوں میں خون بھر گیا مگر اس نے بد دعا نہیں کی۔ جس نے فتح مکہ پر ان لوگوں کو معاف کردیا جو اس کے خون کے پیاسے رہے تھے۔ جس نے اس بڑھیا کی عیادت کی جو اس کے سر پر روز کوڑا پھینکتی تھی۔ جس نے انتہائی ضعف اور بیماری میں ایک شخص کو یہ اجازت دی کہ اگر اونٹ کو مارتے ہوئے میرا کوڑا تمہیں لگ گیا تھا تو میں قمیض اتارتا ہوں تم انتقام لے لو، جس نے راتوں کو اتنی عبادت کی کہ پیروں پر ورم

آگیا، حالانکہ وہ شفیع المذنبین تھا، گناہ گاروں کی شفاعت کرنے والا۔

حسب و نسب کے پیمانے کو بھی اگر ہم نظرانداز کر دیں (حالانکہ محبوب خدا سے یہ تعلق وہ شرف ہے جس پر کائنات میں سب سے زیادہ فخر زیبا ہے) تو علی ابن الحسینؑ کے کردار کی عظمت ہمیں حیران کر دیتی ہے۔ کیونکہ وہ صرف نسب کے اعتبار سے ہی ورثہ دار رسولؐ نہ تھے بلکہ وہ اخلاق و سیرت میں بھی تصویر رسولؐ تھے۔ انکی زندگی ایک ایسا شاندار مرقع ہے جسکا آب و رنگ ہمیں کردار محمدیؐ کی یاد دلاتا ہے۔ اور رسولؐ کا کردار ہی صراط مستقیم ہے۔ کسی فانی انسان کی زندگی میں وہ لمحہ حاصل زندگی ہوتا ہے جب وہ نقش پائے رسول کو اپنی نگاہوں سے چومتا ہے۔ جب اس کے دل میں کردار رسولؐ کی پیروی کا شوق بیدار ہوتا ہے۔

علی ابن الحسینؑ کی زندگی چونکہ پیروی رسولؐ کی ایسی درخشندہ و تابندہ مثال ہے جس سے صدیوں کی راہیں روشن ہیں۔ اس لئے میں اسے دنیا و آخرت میں انتہائی برکت و سعادت کا باعث سمجھتا ہوں کہ انکی کتاب زندگی کے وہ اوراق آپ کے سامنے بھی پیش کروں جنہیں دیکھنے سے روح وجد میں آتی ہے، ذہن نشۂ عبودیت سے سرشار ہو جاتا ہے، آنکھوں میں معرفت کے دفتر کھل جاتے ہیں، خانہ دل سے ہوس دنیا کافور ہو جاتی ہے۔ شعور کروٹیں لے کر بیدار ہوجاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم اسکے سامنے سر جھکائے حاضر ہیں جسکا دربار سب سے بڑا ہے اور اپنے گناہوں پر ندامت کی وجہ سے ہماری آنکھوں سے وہ آنسو رواں ہیں جو نامہ اعمال کی سیاہی کو دھو دیتے ہیں۔

جب تک ہمارے باطن کو روشنی کی ضرورت ہے ہمیں علی ابن الحسینؑ کی عظمت کردار سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔

اور یہ کتاب اسی سمت میں ایک عاجزانہ کوشش ہے۔

عظمت انسانی کا معیار کیا ہے

دنیا میں صرف تین طرح کے لوگ ہوتے ہیں ۔ ایک وہ جو وقت کے دھارے کے ساتھ بہتے ہیں ۔ دوسرے وہ جو وقت کے دھارے میں اپنی جگہ کھڑے رہتے ہیں اور تیسرے وہ جو وقت کے دھارے کو پلٹ دیتے ہیں ۔

جو وقت کے دھارے کے ساتھ بہتے ہیں وہ معمولی لوگ ہوتے ہیں ۔ دنیا میں سب سے بڑی اکثریت انہی لوگوں کی ہوتی ہے ۔ ان کا ذوق گھٹیا، ذہانت معمولی اور اخلاقیات سطحی ہوتی ہے ۔ یہ غور و فکر سے عاری ہوتے ہیں اور بصیرت سے بے نیاز ۔ انکی انفرادیت صفر ہوتی ہے اور ذہنیت سو فیصد مادہ پرست ۔ انکی تمام امیدوں کا محور و مرکز وہی چیزیں ہوتی ہیں جنہیں عقلمندوں نے فتنے کہا ہے یعنی زن ، زر ، زمین ۔ انکی زندگی کی تمام کاوشوں کا نچوڑ یہی ہوتا ہے کہ جتنی بھی دنیا سمیٹی جا سکے سمیٹ لو ۔ بڑے سے بڑا منصب حاصل کرو ۔ زیادہ سے زیادہ جائداد بناؤ ۔ اونچی سے اونچی حیثیت حاصل کرو ۔ ہو سکے تو اقتدار پر قبضہ کر لو ۔ اپنی تعیشات کی فہرست اور فتوحات کے دائرے کو جتنا بڑھا سکو بڑھا لو ۔ چاہے اس کے لئے دوسروں کا حق غصب کرنا پڑے ۔ بے ایمانی کرنی پڑے ۔ جھوٹ بولنا پڑے ۔ ان کے ہاں اس کی اہمیت نہیں ہے کہ جو چیز حاصل کی ہے اس کے ذرائع غلط تھے یا صحیح ۔ یہ کام حلال ہے یا حرام ۔ یہ دراصل حصول دنیا کی دوڑ میں اتنے پاگل پن کے ساتھ منہمک رہتے ہیں کہ انکے پاس یہ سوچنے کی فرصت نہیں ہوتی ۔ ان کے لئے سب سے بڑا معیار یہی ہے کہ دوسرے اس کام کو اچھا سمجھتے ہیں ۔ یہ جو کچھ بھی دیکھتے ہیں دوسروں کی عینک سے دیکھتے ہیں ۔ تقلید بلکہ اندھی تقلید ان کا خاص وصف ہوتا ہے ۔ ان کے نزدیک سب سے بڑی سند یہی ہوتی ہے کہ ساری دنیا یہ کر رہی ہے ۔ وہ کبھی اس بات کی ضرورت محسوس نہیں

کرتے کہ اپنا محاسبہ کریں۔ کبھی اپنے اعمال کو پرکھیں کہ وہ زندگی میں جو کچھ کر رہے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط۔ کبھی ان کا ضمیر انہیں ملامت بھی کرتا ہے تو وہ تاویلوں سے اور منطقی مغالطوں سے اپنے غلط ہی کو صحیح ثابت کر کے ضمیر کو گہری نیند سلا دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کے دل کے نہاں خانے میں یہ بات موجود ہوتی ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ لیکن وہ خود کو فریب دے لیتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ اگر صحیح کو صحیح مان لیں تو دولت و منصب و اقتدار پر جھپٹنے اور دوسروں کا حق ہڑپ کر لینے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا اور دولت واقتدار انھیں اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ " ساری دنیا یہی کر رہی ہے " یا " دنیا نبھانے کے لئے تو ایسا کرنا ہی پڑتا ہے "۔ یہ اور اس قسم کے جملے انہیں ہر حرام کو حلال سمجھ لینے کا فتویٰ فراہم کرتے ہیں۔ اسی ساخت کے لوگ دنیاوی معیار سے سب سے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ بنیادی حیوانی جبلتیں انکے اعمال و افعال کی سمت متعین کرتی ہیں۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر اخلاقی معیار سے یہ لوگ حیوانوں کے درجے میں شمار کئے جانے کے قابل ہوں۔ اس قبیلے میں معمولی چوروں اور ڈاکوؤں سے لے کر فاتحین عالم تک کے نام آتے ہیں۔ ان سب کا پہلا اصول زندگی یہی ہے کہ دوسروں سے سب کچھ چھین لو۔ ہر چیز پر قبضہ جما لو چاہے تمھیں اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔

لاکھوں آدمیوں میں ایک ایسا بھی آدمی ہوتا ہے جو ان معمولی انسانوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کی صرف ایک ہی صفت اسے معمولی آدمیوں کی اس صف سے ممتاز کر دینے کے لئے کافی ہوتی ہے اور وہ صفت یہ ہے کہ وہ سوچتا ہے، غور کرتا ہے، فکر کرتا ہے، اپنی عقل کو استعمال کرتا ہے۔ یہ صفت دانشوروں، فلسفیوں، مفکروں اور عالموں کی صفت ہے۔ انکے پاس عقل کا چراغ ہوتا ہے جس کی روشنی میں یہ دنیا کو پرکھتے ہیں۔ کوئی اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ پوری دنیا ایک اسٹیج ہے اور اس دنیا میں بسنے والے تمام لوگ اداکار۔ کوئی کہتا ہے کہ پوری دنیا دراصل عالم مثال

کی نقل ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ زندگی ایک ایسا قصہ ہے جس کو کسی احمق نے بیان کیا ہے۔ یہ سارے اسلوب مختلف ہیں لیکن ان کی تہہ میں ایک ہی خیال موجزن ہے اور وہ یہ کہ دنیا عارضی ہے، وقتی ہے، ناپائیدار ہے۔ اس کے مزے جلد ختم ہو جانے والے ہیں۔ اس کی شیرینیوں میں تلخی چھپی ہوئی ہے۔ اصل قدروقیمت اس زندگی کی نہیں بلکہ اس زندگی کی ہے جو اس کے بعد شروع ہوگی۔ جس میں جزا اور سزا ملے گی اور جس کو دوام ہوگا۔

جب کوئی انسان اس ذہنی معیار کو حاصل کر لیتا ہے جس کے بعد اس پر فلسفی، مفکر اور دانشور کا خطاب سجتا ہے تو اس پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ دنیا اور اس کی تمام لذتیں ہیچ ہیں۔

عاقبت منزل ما وادی خاموشاں است

ہر انسان کی آخری منزل قبر ہے اور زندگی جیسی قیمتی چیز کو جو صرف ایک بار ملتی ہے دو روزہ عیش کے لئے وقف کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اس کی راہ عام لوگوں سے الگ ہو جاتی ہے۔ مادی فائدے، دنیاوی کامیابیاں، دولت، جائداد، منصب، اقتدار۔۔۔۔ یہ سب اسے چھوٹی اور حقیر چیزیں لگتی ہیں۔ وہی چیزیں جن کے حصول کے لئے معمولی ذہن رکھنے والے لوگ اپنی پوری زندگیاں صرف کر دیتے ہیں اور ان چیزوں کی خاطر دھوکے دیتے ہیں فریب کرتے ہیں۔ بے ایمانی کرتے ہیں۔ دھاندلی کرتے ہیں۔ بے گناہوں کے خون تک سے ہاتھ رنگتے ہیں۔ انہی تمام چیزوں کو یہ لوگ ہیچ و پوچ، فضول، بیکار اور بے قیمت سمجھتے ہیں۔

ان لوگوں کو وقت کا دھارا اپنے ساتھ بہا کر نہیں لے جاتا۔ اس لئے کہ یہ ذہنی اور اخلاقی طور پر غیر معمولی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں

لیکن ان کا دائرہ اثر بہت بڑا ہوتا ہے۔ سینۂ تاریخ پر ان کے قدموں کے نشان صدیوں تک محفوظ رہتے ہیں۔ ان کے پاس محل نہیں ہوتا۔ جھونپڑی میں رہتے ہیں لیکن بادشاہ کو خاطر میں نہیں لاتے۔ کہہ دیتے ہیں کہ میرے لئے بس اتنا ہی کر دو کہ دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جاؤ۔ بادشاہ انہیں بلائے تو جانے سے انکار کر دیتے ہیں اور خود آنا چاہے تو معذرت کر لیتے ہیں۔ بادشاہ کا سپاہی اس بات پر جھلا کر کہ یہ بادشاہ کے بلانے پر جا کیوں نہیں رہا انہیں قتل کر سکتا ہے لیکن بادشاہ کی تمام فوج بھی ان سے یہ بات نہیں منوا سکتی کہ بادشاہ کا بلانا ان کے اقلیدسی مسائل کو حل کرنے سے زیادہ ضروری ہے۔ انکی ایک الگ ہی دنیا ہوتی ہے۔ علم و بصیرت اور غور و فکر کی دنیا۔ انھیں مادی فائدوں کے حصول کے لئے اپنی توانائیاں صرف کرنا لغو کام لگتا ہے۔ قناعت انکے خون میں رچی بسی ہوتی ہے۔ انہیں جو مل جاتا ہے یہ اسے بہت سمجھتے ہیں۔ انکے پاس نہ آرزوؤں کی طویل فہرست ہوتی ہے نہ دنیا سمیٹنے کی ہوس۔ یہ کبھی دوسروں سے کچھ نہیں چھینتے۔ جب آدمی کے دل میں ہوس کا لاوا نہ ابل رہا ہو اور وہ دوسروں کا حق کھا جانے کے چکر میں نہ ہو تو پھر نہ اسے بے ایمانی کرنی پڑتی ہے نہ دھونس اور دھاندلی سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ خود بھی جیتا ہے اور دوسروں کو بھی جینے کا حق دیتا ہے۔ اسے کبھی غلط ذرائع نہیں استعمال کرنے پڑتے۔ وہ کبھی دوسروں کے غلط اعمال کو اپنے غلط اعمال کا جواز نہیں بناتا۔ اس لئے کہ وہ اندھی تقلید کا اسیر نہیں ہوتا۔ اس کے پاس مال دنیا چاہے کچھ نہ ہو لیکن اس کے پاس ایک ایسی چیز ضرور ہوتی ہے جو نہ کروڑپتیوں کو حاصل ہوتی ہے نہ جابر فرمانرواؤں کو اور وہ چیز ہے ذہنی سکون، دل کا اطمینان، روح کی بالیدگی۔ اس صف میں بہت سے لوگ ایسے بھی ملیں گے جو رسمی مذہب کے منکر ہیں جیسے آئن سٹائن یا برٹرینڈ رسل۔ لیکن جہاں تک کردار کا تعلق ہے ان میں کوئی ایسی کھوٹ نہیں ہوتی جو ہمیں رسمی مذہب پر بڑے شدومد سے عمل کرنے والے لوگوں کے دلوں میں ہوس زر اور حب جاہ کی

شکل میں نظر آتی ہے۔

جو لوگ صرف اپنی ذات کے فائدے اور زیادہ سے زیادہ اپنی اولاد کے فائدے کے لئے کوششیں کرتے ہیں ان کا نوع انسانی کو اپنی ذات سے فائدہ پہنچانے کا دائرہ سب سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ معمولی لوگوں میں شمار ہوتے ہیں چاہے انھوں نے اپنی فوجوں سے آدھی دنیا کو روند دیا ہو اور قصر الذہب یعنی سونے کے محل تعمیر کر لئے ہوں۔ عالموں، مفکروں، فلسفیوں اور دانشوروں کے ہاں سب سے اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی ذات کے فائدے کے لئے کم سوچتے ہیں۔ دوسروں کے فائدے کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

انسانوں میں سب سے زیادہ عظیم وہی لوگ ہیں جن کا دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا عزم اتنا بڑھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو فائدے پہنچانے کی بات کبھی سوچتے ہی نہیں۔ ان کے سامنے پوری بنی نوع انسانی کا مفاد ہوتا ہے اور بنی نوع انسانی کو فائدے پہنچانے کی خاطر وہ انسانوں کو ان کاموں سے روکتے ہیں جو برے ہیں اور جن سے انتشار پیدا ہوتا ہے یا معاشرے میں ظلم کو تقویت ملتی ہے۔ معاشرے کا وہ طبقہ جو عام لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہوتا ہے اور غریبوں اور کمزوروں پر ظلم کر کے، ان کا خون چوس کے پھل پھول رہا ہوتا ہے وہ طبقہ ہمیشہ ان عظیم لوگوں کے خلاف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان سے اس طبقے کے مفادات کو زک پہنچتی ہے۔ وہ پہلے ان انسانوں کو انکی انقلابی اور اصلاحی سرگرمیوں سے منع کرتے ہیں۔ پھر ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ پھر انہیں مجنوں مشہور کرتے ہیں۔ شاعر مشہور کرتے ہیں۔ اوچھے لوگوں کو ان کے پیچھے لگا دیتے ہیں جو راہ میں کانٹے بچھاتے ہیں، کوڑا کرکٹ سر پر ڈالتے ہیں، برا بھلا کہتے ہیں۔ پتھر مارتے ہیں۔ لیکن عظیم انسانوں کی قوت برداشت بھی اتنی ہی عظیم ہوتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ سہتے ہیں، برداشت کرتے ہیں اور خندہ

پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ نہ جواب میں برا بھلا کہتے ہیں نہ بددعا کرتے ہیں کیوں کہ وہ انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ لوگوں کے لئے ان کا وجود رحمت ہے۔ وہ سب کے فائدے کی بات کرتے ہیں اور سب کا فائدہ عدل میں ہے، انصاف میں ہے، نیکی میں، سچائی میں ہے۔ انہیں اگر یہ نظر آتا ہے کہ معاشرہ گھٹیا قدروں کو اپنا چکا ہے۔ سارے لوگ ہوس پرست، خود غرض اور بے حس ہو گئے ہیں تو یہ عظیم لوگ وقت کے دھارے کو پلٹا دیتے ہیں۔ مار پیٹ کر کے، زبردستی کر کے، دھونس دیکر، سزا کا خوف پیدا کر کے، قتل کر کے آدمی سے جو چاہے منوایا جا سکتا ہے۔ لیکن محبت سے، پیار سے ہنس بول کر، سمجھا کر، نصیحت کر کے، اپنے اخلاق سے، تحمل سے، بردباری سے، صداقت سے، ایثار سے، کردار سے ایک پورے معاشرے کو بدل دینا اور لوگوں کے دلوں میں اس بات کا یقین پیدا کرنا کہ جن باتوں کو وہ اور ان کے آباؤاجداد صدیوں سے کرتے چلے آرہے تھے اور اچھا سمجھتے تھے وہ سب غلط ہیں، بری ہیں اور چھوڑ دینے کے قابل ہیں، بہت بڑا کام ہے کیونکہ یہ بہت دیرپا ہوتا ہے۔ ان کی تعلیمات لاکھوں کروڑوں لوگوں کو متاثر کرتی ہیں اور صدیوں تک متاثر کرتی ہیں۔ یہ لوگوں کو برائی کی دلدل سے نکال کر بھلائی کے سیدھے راستے پر لاتی ہیں۔ اس راستے پر جسے قرآن صراط مستقیم کہتا ہے۔ جو نیک لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے اور انہیں جنت کے دروازوں تک پہنچانے کا ضامن ہے۔ کسی انسان کے لئے اس سے بڑا نفع اور فائدہ کیا ہو سکتا ہے کہ اسے دنیا کی چند روزہ تعیشات سے بچا کر اس فردوسِ گم گشتہ کا پتہ بتا دیا جائے جہاں کی بہار ہمیشہ رہنے والی ہے۔ جہاں کی خوشیاں جاوداں ہیں اور جہاں کا لطف لازوال ہے۔

نبی، رسول، امام اور معصوم یہی کام سرانجام دیتے ہیں۔ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا ان کا دائرہ انسانوں میں سب سے بڑا ہوتا ہے۔ اس دائرے میں پوری کائنات گم ہو جاتی ہے۔ اسی لئے وہ دنیا کے سب سے بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ

نہ عام انسانوں کی طرح رسوم دنیا کی پیروی کرتے ہیں نہ مفکروں کی طرح رسوم دنیا سے خود کو لاتعلق کر لیتے ہیں۔ بلکہ وہ ان رسوم کو تبدیل کرتے ہیں۔ رواجوں کو بدل دیتے ہیں۔ قدروں کو الٹ دیتے ہیں۔ عقائد کو منقلب کر دیتے ہیں۔ ناری کو نوری بنا دیتے ہیں۔ کافر کو اسلام سے مشرف کر دیتے ہیں اور منافق کا رخ ایمان کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ وہ حکومتیں نہیں بدلتے، سرحدیں نہیں بدلتے۔ دلوں کی دنیا بدل دیتے ہیں۔

انسانوں میں سب سے بڑا درجہ انہی لوگوں کا ہے۔ یہ وقت کے دھارے کو اپنی مستقل مزاجی سے، اپنے حلم سے، اپنی قوت برداشت سے پلٹا دیتے ہیں۔ ان کا صرف ایک رہنما اصول ہوتا ہے اور وہ ہے احکام الٰہی کی تابعداری۔ ان کا ذوق صرف عبودیت ہے۔ ان کی ذہانت صرف اطاعت ہے۔ ان کی اخلاقیات آسمانی ہے، سرمدی ہے، الوہی ہے۔ ان کا علم لدنی ہوتا ہے۔ غور و فکر تو عام انسانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ ان کی رہنمائی کے لئے وحی آتی ہے۔ انہیں نہ دنیا سے علاقہ نہ اس کے لذائز سے سروکار۔ وہ معاشرے میں رہتے صرف اسی لئے ہیں کہ انہیں دنیا کو اپنے عمل سے ایک اعلیٰ نمونہ دکھانا ہے۔ نیکی کا، اخلاق کا، انسانیت کا۔ ان کی تمام امیدوں کا محور و مرکز صرف وہی ذات ہوتی ہے جو زندہ ہے، قائم ہے۔ جس کا دائرہ اقتدار اور احاطہ اختیار انفس و آفاق پر محیط ہے۔ جس کا حکم ہر چیز پر جاری و ساری ہے۔ جو ہر ابتدا سے پہلے تھا اور جو ہر انتہا کے بعد بھی رہے گا۔ جسے کبریائی زیبا ہے۔ یہ اسی سے مانگتے ہیں۔ اسی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہر فیصلہ اسی پر چھوڑتے ہیں اور اس کے قضا و قدر پر ہمیشہ سر تسلیم خم رکھتے ہیں۔ انکی محبت بھی خدا کے لئے ہوتی ہے اور عداوت بھی خدا کے لئے ہوتی ہے۔ ان کے لئے کوئی چیز پر کشش نہیں ہوتی سوائے اس کے جس کا حکم خدا نے دیا ہے۔ اور کسی چیز سے وہ نفرت نہیں کرتے سوائے اس کے جس سے خدا نے روکا ہے۔

ان کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ دیتے ہیں لیتے نہیں ۔ بانٹتے ہیں چھینتے نہیں ۔ نہ انہیں حکومت کی تمنا ہوتی ہے نہ دولت کی پرواہ ۔ ان کی نظر اپنے فرائض پر ہوتی ہے حقوق پر نہیں ۔ یہ آگے بڑھتے ہیں تو صرف ایک چیز کے حصول کے لئے اور وہ ہے ثواب ۔ یہ جس دائرے کو پھیلانا چاہتے ہیں وہ ہے دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا دائرہ ۔ یہ دنیا میں جو کچھ بھی کرتے ہیں عقبیٰ کو پیش نظر رکھ کر کرتے ہیں ۔ ان کے ہاں کامیابی کا یہی تصور ہے کہ اگر زندگی احکام الٰہی کے سانچے میں ڈھال لی تو سمجھو کہ کامیاب رہے ۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا نفس اور ان کا مال سب خدا نے خرید لیا ہے اور اس کے بدلے اپنی مرضی دیدی ہے ۔ یہ نگاہ قدرت کا اشارہ دیکھتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جو مرضی رب کا تقاضا ہوتا ہے ۔ اور اسی لئے انھیں معصوم کہا جاتا ہے ۔ ان کا کردار انھیں ہمیشہ زندہ رکھتا ہے ۔ لوگ ان کے نام پر مر جانے کو سعادت سمجھتے ہیں ۔ ان کے مزار زیارت گاہ خاص و عام ہوتے ہیں ۔ بادشاہ ان کی چوکھٹ چومنے کو باعث عزت سمجھتے ہیں ۔ جن لوگوں نے اپنے نام کی ہیبت اور فتوحات کی وسعت سے ایک دنیا کو حیران رکھا ان کے مدفن بے چراغ ہیں، ویران ہیں اور ان اللہ والوں کے مزاروں پر تسبیح و تہلیل و تقدیس و درود و سلام کی وہ گونج ہے جس سے دل زندہ اور ایمان تازہ ہوتے ہیں ۔

آل محمد کا اختصاص

یوں تو دنیا کے تمام انسانوں میں رتبہ و فضیلت ، دولت و ثروت ، قوت و طاقت ، عظمت و حشمت اور اقتدار و اختیار کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے ۔ اور یہ فرق زندگی بھر رہتا ہے لیکن موت ہر فرق کو مٹا ڈالتی ہے۔

مرنے کے بعد آدمی کیلئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ سو سال کی عمر تک جیا ۔ یا نوجوانی میں مرگیا ۔ اس نے زندگی فاقوں میں کاٹی یا عیش و نشاط میں گزاری ۔ وہ محل میں رہتا تھا یا جھونپڑی میں ۔ اسکے بدن پر لباس فاخرہ ہوتا تھا یا چیتھڑے ۔ روکھی سوکھی روٹی کھاتا تھا یا اسے انتہائی لذیذ غذائیں میسر تھیں ۔ عالم تھا یا جاہل ۔ بادشاہ تھا یا فقیر، نیکو کردار تھا یا بد کردار ، کمزور تھا یا طاقت ور ۔ شریف تھا یا رذیل ۔ عام آدمی تھا یا خاص ۔ مشہور تھا یا گمنام ۔ موت کی لکیر پھلانگ کر سب آدمی برابر ہو جاتے ہیں ۔ اور موت سب کو آنی ہے ۔ اسکا ذائقہ سب کیلئے برحق ہے ۔ جو خلق ہوا ہے اسے فنا ہونا ہے ۔ جس نے ہستی کا لباس پہنا ہے اسے عدم کا مسافر بننا ہے ۔ بچ کوئی نہیں سکتا ۔

جب احمد مرسل نہ رہے کون رہے گا

مرنے کے بعد آدمی کی روح آسمان پر چلی جاتی ہے ۔ جسم سپرد خاک کردیا جاتا ہے ۔ اعمال خدا کے سامنے پیش کردئے جاتے ہیں ۔ جائیداد بٹ جاتی ہے ۔ دولت تقسیم ہو جاتی ہے ۔ اسکی بیکار چیزیں پھینک دی جاتی ہیں ۔ کارآمد پر لوگ قبضہ کر لیتے ہیں ۔ انسان کی صرف ایک چیز باقی رہ جاتی ہے ۔ اسکا تذکرہ ۔ صرف تذکرہ ۔ اگر وہ نیک تھا تو لوگ اسے اچھے الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور برا تھا تو لوگ اسکے عیب گنواتے ہیں کیونکہ وہ اسی لائق تھا ۔

اور یہ ذکر بھی کچھ عرصے ہی باقی رہتا ہے ۔ آہستہ آہستہ حافظے کی لوح سے اسکا نام محو ہو جاتا ہے ۔ ہاں جنھوں نے اس فانی دنیا میں کچھ عرصے باقی رہنے والے کارنامے انجام دیئے انکے نام مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں ۔ گزرتی ہوئی صدیاں لوگوں کے نام اور تذکروں کو اس طرح ختم کردیتی ہیں جیسے آندھی کے جھکڑ ریت پر بنے ہوئے قدموں کے نشانوں کو ۔ لیکن اہل کمال کے نام صدیوں کی رگوں میں سرائیت کر جاتے ہیں ۔ اور انکے خاک ہو جانے کے سیکڑوں سال بعد بھی ان کا نام وقت کی پیشانی پر جگمگاتا رہتا ہے ۔ کیونکہ وہ اہم تھے ۔ بڑے تھے ۔ عظیم تھے ۔ صاحبِ صلاحیت تھے ۔ انھوں نے اپنے پیچھے وہ آثار چھوڑے جنھیں وقت کا ظالم ہاتھ بھی مٹا نہ سکا ۔

یہ تمام اہم مشہور مقبول عظیم اور صاحب کمال لوگ اپنی کسی خاص صفت کے سہارے تاریخ کے زرنگار ایوان میں داخل ہوتے ہیں ۔ اور وہی صفت انھیں موت کے بعد زندہ رکھتی ہے ۔ ان میں وہ صفت یقیناً درجہ اشرفیت پر پائی جاتی ہے ۔ لیکن چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مجسم وہ صفت بن جاتے ہیں ۔ انکی پوری شخصیت اس صفت میں گم ہو جاتی ہے ۔ ان کا نام اس صفت کا استعارہ بن جاتا ہے ۔ وہ صفت ان کی ایسی پہچان بن جاتی ہے کہ صفت کا تذکرہ چھڑتے ہی ان کا نام یاد آجاتا ہے جیسے سخاوت میں حاتم ، شجاعت میں رستم ، عدالت میں نوشیرواں ، حکومت میں سکندر ، حکمت میں بو علی سینا ، صبر میں ایوب ، مسیحائی میں عیسیٰ ، جلال میں موسیٰ ، بکا میں آدم ، فیصلے میں دانیال ، عقلمندی میں لقمان ، علم میں سقراط ، خطابت میں ڈیموستھنیز ۔

اپنی ان صفات کے حوالے سے یہ لوگ لاکھوں میں ایک تھے تو کروڑوں میں فرد تھے ۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کو ایک ہی صفت میں معراج کمال حاصل تھی ۔ جسے کتابوں سے دلچسپی تھی اس نے فن حرب کی طرف کبھی دھیان نہ دیا ۔ جو طبابت

میں طاق تھا اسے سخاوت سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ جو عقلمند تھا اس میں جمال نہ تھا۔ جو لوگوں کو اخلاق سے بندہ بے دام بناتا تھا وہ طاقت کے لحاظ سے زبردست نہ تھا۔ کوئی بہادر تھا تو اسے خطابت کے فن سے کوئی مناسبت نہ تھی۔

اگرچہ درجنوں اچھی صفات ہیں جو انسانوں میں تھوڑی پائی جاسکتی ہیں لیکن کسی انسان میں بھی کوئی دو صفتیں اس اعلیٰ معیار پر نہیں پائی جاسکتیں کہ اسکی پہچان بن جائیں۔

یہ اختصاص اور امتیاز پوری کائنات میں صرف آل محمد کو حاصل ہے کہ ان میں ہر وہ اچھی صفت موجود تھی جو کسی انسان میں پائی جاسکتی ہے۔ اور ہر صفت اپنے اس انتہائی نقطہ عروج پر موجود تھی جو فانی انسان میں ممکن ہے۔

آل محمد کا دوسرا معجزہ یہ ہے کہ ان کے ہاں اعلیٰ صفات کا اعلیٰ ترین پیمانے پر پایا جانا ایک مسلسل عمل ہے۔ اور یہ تسلسل گیارہ نسلوں تک پایا جاتا ہے۔ آخری پیغمبر سے آخری امام تک۔ تاریخ انسانی کھنگال ڈالئے۔ آپ کو کوئی خاندان ایسا نہیں ملے گا جہاں تمام اعلیٰ اور ارفع انسانی خصوصیات اس شان امتیاز کے ساتھ نسلوں میں سفر کرتی نظر آئیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ علی میں شجاعت زیادہ تھی۔ حسن میں حلم بہت تھا۔ حسین صبر میں کامل تھے۔ زین العابدین عبادت میں حرف آخر تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ

سب محمد تھے محمد کے گھر والے۔

صفات سب میں وہی تھیں اور اسی معیار کی تھیں۔ ہاں۔ حالات مختلف تھے۔ اور ہر ایک زمانے کے حالات و واقعات کی مناسبت سے انکے مقاصد کے حصول کیلئے جس چیز کی ضرورت تھی وہ ان سے ظاہر ہوئی۔ اور ان کی وجہ شہرت بن گئی۔

حالات مختلف سہی کردار ایک تھا۔

رسول خدا سے امام آخرالزماں تک ہر ایک فرد کی سیرت کے نقوش اپنی پوری جہاں تابی اور ضیاء پاشی کے ساتھ کتابوں میں محفوظ ہیں۔ اور ایسی چند کتابیں نہیں ہیں۔ لائبریریاں بھری پڑی ہیں۔ ان کی مقدس و متبرک زندگیوں کا کوئی گوشہ بھی پردہ خفا میں لپٹا ہوا نہیں ہے۔ چھپایا تو لوگوں نے بہت۔ لیکن جس طرح باطل مٹنے ھی کیلئے ہوتا ہے۔ اسی طرح حق ظاہر ہونے کیلئے ہی ہوتا ہے۔

آل محمد کے اول سے لیکر آل محمد کے آخر تک کسی کی زندگی میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب وہ ان تمام اوصاف کی معراج کمال پر نہ نظر آیا ہو۔ علم کو لیجیے تو مدینہ علم سے لیکر آخری وارث علم لدنی تک ہر ایک نے زندگی بھر سوال کرنے والوں کے ہر سوال کا جواب دیا۔ نہ کبھی وہ جواب دینے میں ہچکچائے۔ نہ یہ کہا کہ یاد نہیں۔ نہ یہ عذر کیا کہ معلوم نہیں۔ نہ کبھی ان کا کوئی جواب غلط ہوا۔ نہ کبھی ایسا ہوا کہ جواب پر دلیل نہ لاسکے ہوں۔ اور نہ کبھی یہ ہوا کہ وہ دلیل قرآن سے نہو جو علم و دانش کا سب سے لازوال اور لامتناھی خزانہ ہے۔

اور بات علم تک محدود نہیں۔ کسی بھی اچھی صفت کو لے لیجیے۔ ہر صفت میں یگانہ روزگار تھے۔ حلم دیکھیں۔ سخاوت دیکھیں۔ شجاعت دیکھیں۔ عدل و انصاف دیکھیں۔ فیصلے کی قوت دیکھیں۔ دین کی سمجھ دیکھیں۔ اکل حلال میں محنتیں دیکھیں۔ عبادتوں میں ریاضتیں دیکھیں۔ صدق مقال کے حوصلے دیکھیں۔ حق پر ڈٹے رہنے کے ولولے دیکھیں۔ دنیا نے ان کی مخالفت میں پورا زور صرف کردیا لیکن یہ نہ کبھی نیکی کا حکم دینے سے رکے۔ نہ برائی کی مذمت سے باز رہے۔ خاموش رہے تو کوہ گراں تھے۔ بولے تو شعلہ فشاں خطابت کی اعلیٰ ترین مثال بن گئے۔ میراث کا سوال پوچھا گیا تو یہ نہیں کہا کہ میں نے رسولؐ سے معلوم نہیں کیا تھا۔

اور پھر یہ نہیں کہ ایک خاص عمر پر ان میں یہ وسعت مطالعہ بلوغ نظری اور تدبر پیدا ہوتا تھا۔ دس سال کی عمر میں جب ان سے اکھتر سال کا قاضی القضاہ سوال کرتا ہے تو اسکے سوال میں وہ باریکیاں نکالتے ہیں کہ پوچھنے والا ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ اور ہر اس صورت کا جس میں باریک سا فرق ہے الگ الگ شافی و کافی و وافی جواب دیتے ہیں۔ اور پھر جب خود سوال کرتے ہیں تو سوال سن کر ہی اراکین دربار کے ہوش اڑجاتے ہیں۔ اور اسکا بھی حل بتاتے ہیں۔ لطف کی بات یہ کہ کسی کے پڑھائے ہوئے نہیں ہیں۔ کسی سے سیکھا نہیں ہے۔ کسی کے آگے زانوئے تمیذ تہہ نہیں کیا ہے۔ کسی کے شاگرد نہیں ہوئے ہیں۔ جسکا شاگرد جبرئیل ہو اسے کسی کی شاگردی کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔

رسول خداؐ نے فرمایا کہ میں اسلئے مبعوث کیا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔ تو جو رسول کے سچے جانشین تھے، برحق وصی تھے وہ کیوں وارث خلق عظیم نہ ہوتے۔

رسول اکرمؐ کی رسالت کی دلیل تخت و تاج نہ تھا بلکہ مسند فقر تھی سلطنت کی وسیع و عریض حدیں نہ تھیں بلکہ رحمت پروردگار کی طرح پھیلی ہوئی محبت تھی۔ وہ مجبور کرکے لوگوں کی گردنوں پر حکومت نہ کرتے تھے بلکہ اپنے خلق عظیم سے دلوں کو فتح کرتے تھے۔ ان کے دشمن بھی ان صفات کے قصیدہ خواں تھے۔ راستے میں کانٹے بچھاتے تھے۔ پتھر مارتے تھے۔ قتل کی تدبیریں سوچتے تھے لیکن امانتیں انہی کے پاس رکھواتے تھے۔ اور فیصلے بھی انہی سے کرواتے تھے۔ اس لئے کہ آپ سے زیادہ صادق اور امین شخص کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ رسول کی مسند عزت کے تمام وارث بھی ایسی ہی پاک و پاکیزہ اور ہر عیب و رجس سے منزہ زندگی گزار گئے کہ

دشمنوں نے قتل کرادیا زہر دیدیا لیکن ان کے کردار پر وار نہ کرسکے۔

جب ایک شخص اچھائی کا حکم دے تو لازم ہے کہ وہ خود بھی اس اچھائی پر عامل ہو ورنہ بات بے اثر رہے گی۔ اور کردار ادھورا۔ رسول نے انسان کو معراج انسانیت اور کمال شرافت پر پہنچانے کیلئے ہر اچھی بات کا حکم دیا۔ اور ہر بری بات سے روکا۔ اور اپنے ہر قول کو عمل سے قوت دی تاکہ دنیا تقلید کرسکے۔ یہ خصوصیت تمام وارثان رسالت میں مشترک ہے۔ وہ تمام نفوس قدسیہ اپنے کردار اور عمل میں ہوبہو رسول کی تصویر تھے۔ ہر امام نے اپنی زندگی کا مرکز اسی نکتے کو قرار دیا کہ ہر امر پر عمل کرے۔ ہر نہی سے بچ کے دکھائے۔ ہر فرض کو ادا کرے۔ ہر سنت کو زندہ کرے۔ دین میں ہر تبدیلی اور تغیر پر نگاہ رکھے۔ ہر غلط تاویل کی مخالفت کرے۔ ہر فاسد عقیدے کی تردید کرے۔ اور ہر عمل نیک کو سب سے زیادہ کرکے دکھائے۔

ہمارے رسولؐ نے اپنی زندگی میں ہزاروں معجزے دکھائے لیکن ان میں دو معجزے ایسے ہیں جن پر ساری دنیا حیران تھی اور قیامت تک حیران رہے گی۔ ایک قرآن اور دوسرے رسول کی سیرت۔

آج بھی قرآن کا یہ دعوی اپنی جگہ موجود ہے کہ تم سب کے سب جو اسکے کلام خدا ہونے سے انکار کررہے ہو اس جیسا پورا قرآن نہیں تو ایک آیت ہی لکھ لاؤ۔ اور اس زمانے کے عرب کے فصیحوں کی طرح آج کا انسان بھی قرآن کی فصاحت کا کلمہ پڑھتا ہے۔ اور لاھذا کلام البشر کا ورد کرتا ہے۔ آج بھی کائنات میں کسی انسان کی مجال نہیں کہ وہ اسکی ایک ہی آیت کا جواب لکھ لائے۔ جبکہ قرآن کا اعجاز صرف فصاحت پر ہی مشتمل نہیں ہے۔ اس میں فصاحت بے مثال کے علاوہ علم لازوال بھی ہے۔ معانی کی تہیں ہیں جن تک کسی کی عقل کی رسائی بغیر اذن خداوندی ممکن نہیں ہے۔ اور ان میں وہ اثرات پوشیدہ ہیں جو پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلادیں اور بہتے دریا

کو روک دیں۔ کا

رسولؐ کا کردار اپنی جگہ ایک جلیل القدر معجزہ ہے۔ دشمنوں نے رسالت کا انکار کیا۔ رسولؐ کے حسن خلق کا انکار نہیں کیا۔ وارثان رسول کی سیرت بھی معجزہ ہے۔ انھوں نے اپنے عمل سے قرآن کو مکمل ضابطہ حیات ثابت کیا۔ انھوں نے اپنے عمل سے وہ باکمال نمونہ پیش کیا جس کی تاسی تقلید اور پیروی کر کے ہم راہ نجات پا سکتے ہیں۔

جس طرح خدائے بزرگ و برتر کی عنایات بے پایاں کا دعوی ہے کہ کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ اسی طرح امام زین العابدینؑ کے سورج کی طرح جگمگاتے کردار کو دیکھکر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر وہی رہ سکتا ہے جو عقل و شعور سے بالکل بیگانہ بلکہ ہوش و خرد کا دشمن ہو۔

آئیے چشم تصور سے امام زین العابدینؑ کے کردار کی زیارت کریں۔

سب سے پہلے عبادت ملاحظہ ہو۔

عبادت

دنیا میں آج تک جتنے بھی مسلمان گذرے ہیں سبھی نے کسی نہ کسی حد تک عبادت کی ہے۔ لیکن دنیا میں ایسا صرف ایک ہی انسان گذرا ہے جس کی شخصیت سے عبادت کو اتنا گہرا ربط رہا ہو کہ اس کے تمام القاب اور خطاب اسی ایک صفت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

سجاد، سید سجاد، سید الساجدین، عابد، زین العبا، زین العابدین، سیدالعابدین، زین الصالحین۔

علی ابن الحسین ...... تمھارے علاوہ کسی شخصیت پر یہ خطابات نہیں سجتے۔ تمھاری عبادت مقدار میں اتنی ہے کہ اس کا تصور کر کے عبادت گزاروں کی پیشانیاں عرقِ ندامت سے تر ہو جاتی ہیں۔ اور تمھاری عبادت معیار میں ایسی ہے کہ زمانے بھر کا خضوع و خشوع، رقت قلب، اور خلوص بندگی جمع کر لینے کے بعد بھی اس کا پاسنگ نہیں ٹھہرتا۔ اور کیوں نہ ہو...... تم ہو بھی تو خانوادہ رسول کے چشم و چراغ۔ جہاں لوگ عبادت کو زندگی کا حصہ نہیں سمجھتے بلکہ عبادت ہی کو پوری زندگی سمجھتے ہیں۔ تمھارے نانا جو اللہ کے محبوب تھے انکی عبادت کی یہ شان تھی کہ خدا کو قرآن میں کہنا پڑا کہ رات کو اتنی عبادت نہ کیا کرو۔ کیونکہ وہ رات رات بھر محراب عبادت میں کھڑے رہتے تھے جس سے پیروں پر ورم آ جاتا تھا۔ تمھارے دادا علی مرتضی کا عبادت الٰہی میں یہ استغراق تھا کہ پیر سے تیر نکال لیا گیا اور انھیں خبر نہ ہوئی۔ اندھیری راتوں میں غلاف کعبہ کو پکڑ کے درگاہ الٰہی میں مناجات کرتے تھے۔ ایک بار تو علی کے ایک صحابی گھبرا کے در فاطمہ زہرا پر پہنچ گئے تھے اور کہا تھا کہ جلدی چلیں۔ علی اس طرح تڑپ رہے ہیں جس طرح سانپ کا کاٹا تڑپتا ہے۔ اور فاطمہ نے کہا تھا کہ گھبراؤ نہیں۔

علی پر دوران عبادت ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ تمھارے باپ حسین کی عبادت کا یہ عالم تھا کہ اہل مدینہ ہر رات ایک ہزار تکبیروں کی آواز سنتے تھے۔ اور حسین نے تو زیر خنجر بھی طاعت معبود کا حق ادا کر دیا۔

ہر بندۂ مومن کی ہے معراج نماز
معراج نماز کی ہے ذوقِ سجدہ
شبیر نے سر دے کے بتایا ہے یہ راز
سجدے کی بھی معراج ہے نوکِ نیزہ

تمھارے خاندان میں تو زندگی گزارنے کا ایک ہی طریقہ رائج ہے۔ تمھارے ہاں عبادت کی وہی کیفیت ہے جو دنیا والوں میں سانس کی آمدوشد کی ہوتی ہے۔ جس طرح لوگ سانس کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتے اسی طرح تم عبادت کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتے۔ حالات کتنے بھی بگڑے ہوئے ہوں۔ وقت کے تیور کتنے بھی بدلے ہوئے ہوں۔ لیکن عبادت میں کوئی کمی ممکن نہیں۔ کیونکہ عاشور کی شام کو بھی جب دوپہر میں تمھارا بھرا گھر اجڑ چکا تھا، تمھیں خدا کی ذات پر اتنا ہی اعتماد و یقین تھا جتنا اچھے حالات میں ہو سکتا ہے۔ تین دن کی پیاس سے جگر جل رہا تھا لیکن ہونٹ پھر بھی زمزمہ شکر سے تر تھے۔ اور جب دن ڈھل چکا۔ شام غریباں نے اپنے بال پریشاں کر لئے۔ پھر ہر طرف تاریکیوں نے ڈیرے ڈال دیے۔ رات آ گئی۔ مصیبتوں کی رات۔ ابتلا کی رات۔ لٹا ہوا قافلا جلے ہوئے خیام، رن میں ہمیشہ کی نیند سوئے ہوئے عزیز و اقربا، سہمے ہوئے، سسکتے ہوئے بچے، پرہول سناٹا، سُونا بن، ہر طرف اندھیرا، ہر سو ویرانی۔ اس رات میں، ان حالات میں، مصائب و آلام کے اس ہجوم میں جو اعصاب کو چٹخا دیتا ہے، حواس کو گم کر دیتا ہے اور مزاج کو آشفتہ بنا دیتا ہے۔ ایسے میں نماز شب یہ کارنامہ اے ورثہ دار رسول تم ہی دکھا سکتے تھے۔

صحن مسجد یا گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر خدا کی عبادت کرنا بہت آسان ہے۔ لیکن ایسے وقت میں جب دل کے پیاروں اور کلیجے کے ٹکڑوں کی لاشیں خون میں غلطاں ریگ گرم پر پڑی ہوں، بیواؤں کی دلخراش آہوں اور بچوں کی العطش کی پکار دل ہلائے دے رہی ہو۔ ایسے عالم میں اپنے دل کے زخموں کو فراموش کر کے سجدہ حق میں کمال اطمینان کے ساتھ جھک جانا وہ عبادت ہے جس پر سارے جہان کی عبادتیں نثار ہو جائیں۔ عبادت کا یہ انداز سید الساجدین تم ہی سے مخصوص ہے۔

کچھ لوگ جہنم کے خوف سے عبادت کرتے ہیں۔ یہ غلاموں کی عبادت ہے۔ کچھ لوگ جنت کے لالچ میں عبادت کرتے ہیں۔ یہ تاجروں کی عبادت ہے۔ اس انداز کی عبادتیں دنیا والوں کی عبادتیں ہیں۔ انھیں اس عبادت سے کیا نسبت جو اس لئے کی جاتی ہے کہ خدا ہے ہی عبادت کے لائق۔ جسکا مقصد یہی ہے کہ خوشنودی خداوندی حاصل ہو۔ پروردگار کی نظر رحمت ہی جس کی طلب کا محور و مرکز ہوتی ہے۔

کس قدر بلند ہو گی وہ شخصیت جسکی زندگی کا ہر مرحلہ سجدوں کی زیب و زین سے جگمگاتا تھا۔ نعمت نازل ہوتی تھی تو سجدے کرتے تھے۔ آفت نازل ہوتی تھی تو سجدہ کرتے تھے۔ آیت پڑھتے تھے تو سجدہ کرتے تھے۔ نماز ختم کرتے تھے تو سجدہ کرتے تھے۔ خوف اور اندیشے سر اٹھاتے تو سجدہ کرتے تھے۔ مصیبت سے نجات پاتے تو سجدہ کرتے تھے۔ گویا کوئی حال ہو رابطہ رکھتے تھے تو خداوند عالم سے۔ رجوع کرتے تھے تو ذات الہی کی طرف۔ اسی کی پناہ مانگتے تھے اسی کی مدد چاہتے تھے اور اسی کا شکر ادا کرتے تھے۔ خدا کی ہر رضا پر سر تسلیم خم رکھتے تھے۔ ہر نمازی کے ماتھے پر سجدے کا نشان اسکی اطاعت کی شہادت دیتا ہے۔ زین العابدین کی زندگی میں تو سجدوں کا تواتر اور تسلسل دیدنی تھا۔ تمام اعضائے سجود پر گٹے پڑ گئے تھے جنہیں سال میں دو مرتبہ ترشوایا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے آپ کا ایک لقب ذوالثفنات بھی ہے جس کا مطلب ہے "گٹوں والا"۔

آپ ہر شب ایک ہزار رکعت نماز ادا کرتے تھے۔ اور سجدوں کا تو شمار ہی نہ تھا۔ ہر نماز کو اس ذوق و شوق سے ادا کرتے جیسے یہ آخری نماز ہو۔ وضو کے ارادے کے ساتھ ہی رگ و پے میں خوف خدا کے اثرات نمایاں ہو جاتے۔ بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ خوف خدا میں روتے روتے آنکھیں سوج گئی تھیں۔ پنڈلیوں پر ورم آگیا تھا۔ کثرت سجدہ سے ناک اور پیشانی زخمی ہو جایا کرتی تھی۔ نماز میں اتنا روتے تھے کہ زمین آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔

لوگوں کی عقلیں حیران تھیں کہ آخر سید سجاد اتنی عبادت کیوں کرتے ہیں۔ اتنی محنت انھیں ہلاکت کے قریب نہ پہنچا دے۔ کسی کسی نے تو کہہ بھی دیا کہ آپ فرزند رسول ہیں۔ آپ عاقبت کی اتنی فکر کیوں کرتے ہیں۔ آپ کو عبادت میں اتنی سختی برداشت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ خدا کی رحمت آپ کا سہارا ہو گی۔ رسول کی شفاعت آپ کا وسیلہ ہو گی۔ مغفرت آپ پر سایہ فگن ہونے کو مشتاق اور جنت کی فضائیں آپ کی منتظر ہیں۔

یہ ساری باتیں دردمندی کے ساتھ کہی گئی تھیں۔ ہمدردی میں کہی گئی تھیں۔ ان لوگوں نے کہی تھیں جنھیں آپ سے محبت تھی۔ مودت تھی۔ عقیدت تھی۔ آپ نے ہر ایک کو اس کی سمجھ کے مطابق، اس کے معیار کے مطابق جواب دیا۔

اپنے بیٹے محمد باقر سے کہا "جان پدر! کیا تم اس پر راضی نہیں کہ مجھے تقرب پروردگار حاصل ہو"۔ پھر ان سے وہ کتابیں منگوائیں جن میں حضرت علی کی عبادت کا حال لکھا تھا۔ چند صفحے پڑھے اور کہا "کس میں ہمت ہے کہ امیرالمومنین کی سی عبادت کر سکے"۔

صحابی رسول جابر ابن عبداللہ انصاری کو جواب دیا "اے جابر۔ تمھیں معلوم ہے کہ رسول اللہ معصوم تھے۔ رحمت عالم تھے۔ حبیب خدا تھے۔ کتنا عظیم مرتبہ تھا ان

کا۔ اس عظیم مرتبے کے باوجود، خدا کا جو تقرب انہیں حاصل تھا اس کے باوجود۔ آپ اتنی عبادت کرتے تھے کہ پنڈلیوں پر ورم آگیا تھا۔ یہی طریق عبادت ہمارے بزرگوں کا شعار ہے۔ اور ہم اسی پر قائم ہیں"۔

اپنے صحابی طاؤس یمانی سے کہا "قرآن میں لکھا ہے کہ روز قیامت نسب نہ رہیں گے۔ اور نہ اس کی بابت پوچھا جائے گا۔ شفاعت رسول اسی کو حاصل ہوگی جس سے اللہ راضی ہو گا۔ اور اللہ اسی سے راضی ہو گا جو نیکوکار ہیں۔ میرے پاس عبادت کے سوا چارہ کیا ہے۔

یہ تربیت کے مختلف درجے ہیں۔ تعلیم کے مختلف انداز ہیں۔ خود فرزند رسول ہیں اور نسب کے اعتبار سے اس سے بڑا شرف ممکن نہیں۔ لیکن اپنے عمل سے دنیا کو بتا رہے ہیں کہ صرف نسب پر تکیہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ جس کی وراثت کا دعوی ہے اس کے کردار کی جھلک بھی تو ہونی چاہیے۔ عمل بھی تو اس کے دیئے ہوئے اصولوں پر ہونا چاہیے۔ نسب کا شرف کسی کو عبادت سے مستثنی نہیں کرتا۔ وہاں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا آخرت میں نیک عمل کے سوائے کوئی چیز کسی کو فائدہ نہ پہنچائے گی۔ خدا نے جنت اپنے اطاعت گزار بندوں کے لئے خلق کی ہے اور جہنم نافرمانوں کے لئے۔ تمھارا عمل جیسا ہوگا ویسی ہی جگہ تمھیں پہنچائے گا۔ اور اس سے کوئی فرق نہ پڑے گا کہ تم حبشی غلام ہو یا قریش کے کسی رئیس کی اولاد۔

ایک بار امام زین العابدین نماز میں معروف تھے کہ گھر میں آگ لگ گئی۔ ایسے موقع پر گھر میں جو کہرام بپا ہو سکتا تھا وہ ہوا۔ خواتین چیخیں چلائیں۔ بچے گھبرائے۔ مردوں نے اور غلاموں نے دوڑ بھاگ کی۔ جلتے ہوئے سامان پر پانی ڈالا۔ باقی سامان کو دور کیا۔ اس تمام شوروغل اور ہنگامے کے باوجود آپ اطمینان قلب کے ساتھ نماز پڑھتے رہے۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں نے تعجب سے پوچھا "کمال

ہے کہ آپ کو خبر بھی نہ ہوئی اور آپ نماز پڑھتے رہے۔ جبکہ باقی سارے لوگ گھبرائے۔ پریشان ہوئے۔ دوڑے بھاگے۔ آپ کو کس چیز نے اس آگ سے بے خبر رکھا"۔ آپ نے مختصر جواب دیا "جہنم کی آگ نے"۔

ایک دفعہ آپ کے صاحبزادے محمد باقر جو بہت چھوٹے تھے اس کنوئیں میں گر پڑے جو آپ کے مکان کے صحن میں تھا۔ بچے کی ماں نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ لوگوں نے بہت سی ترکیبیں کیں کہ بچے کو کوئیں سے نکال لیا جائے لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس تمام عرصے میں امام مکمل سکون قلب کے ساتھ نماز ادا کرتے رہے۔ نماز ختم کرنے کے بعد آپ اٹھے۔ بچے کو ہاتھ ڈال کر کنوئیں سے نکالا اور ماں کی گود میں بچے کو ڈالتے ہوئے کہا "لے کمزور ایمان والی۔ اپنا بچہ سنبھال"۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نے کیوں پہلے توجہ نہ کی۔ تو جواب دیا کہ جس کے حضور میں حاضر تھا اس کی طرف سے کیسے منہ موڑ لیتا۔

یہ جواب اسی انداز کا ہے کہ جب حضرت ابراہیم کو نمرود کے حکم سے آگ میں پھینکا گیا تو اس وقت جبریل نے حاضر ہو کر پوچھا "اے اللہ کے نبی کوئی حاجت ہے؟" اور حضرت ابراہیم نے جواب دیا تھا کہ ہے مگر تم سے نہیں۔ اس سے ہے جو میرے حال سے بھی واقف ہے اور ہر چیز پر قدرت بھی رکھتا ہے۔

اور ایسا جواب انسان کی زبان سے اس وقت نکل سکتا ہے جب وہ یقین کی معراج پر ہو۔ محراب عبادت میں کھڑے ہونے کے بعد خدا کے علاوہ کسی کا خیال اس کے ذہن تک نہ پہنچ سکے۔ خداوند قدوس کی عظمت و بزرگی اور جلال و جبروت کا تاثر اس کے ذہن پر چھایا ہوا ہو۔ اپنی عاجزی اور فروتنی کا اسے احساس ہو۔ اس مالک الملک حیّ و قیوم اور قہار و جبار کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے بعد خدا کے علاوہ سب

سے اس کا رابطہ منقطع ہو چکا ہو۔ نہ کوئی اس کا سہارا ہو نہ امید۔ اس کے خیالات اور آرزوؤں کا محور و مرکز صرف وہی ذات بابرکات ہو جس کا نہ کوئی ثانی ہے نہ شریک۔ اور جس کے علاوہ کسی کو بڑائی کا دعویٰ زیب نہیں دیتا۔

سخاوت

رات زیادہ ہو چکی ہے۔ مدینے کی گلیاں سنسان پڑی ہیں۔ شہر سو چکا ہے۔ دریچے بام و در سب اندھیرے کی چادر میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ہر طرف خاموشی ہے۔ ملگجے اندھیرے میں اچانک کوئی سایہ سا حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ اسکی پشت پر کوئی بوجھ ہے۔ بڑا سا تھیلا ہے یا شاید بوری ہو۔ اس نے ایک دروازے پر رک کر دستک دی۔ آہستہ سے۔ تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا۔ کوئی آدمی نکلا۔ "تم آ گئے بھائی"۔ گھر سے برآمد ہونے والے نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں یہ لو۔ یہ تھوڑا سا کھانا ہے اور یہ کچھ روپیہ۔ اس سے اپنی ضرورتیں پوری کرو"۔ آنے والے نے کہا اور اپنی پشت سے تھیلا اتار کر اس میں سے روٹیاں نکالیں اور جیب سے درہم و دینار بھی۔

"تم کتنے اچھے ہو بھائی۔ کتنے نیک ہو۔ اللہ تمیں جزائے خیر دے۔ تم غریبوں کے کام آتے ہو۔ یوں روز راتوں کو چھپ چھپ کر ہمارے لئے کھانا لاتے ہو اور مال بھی دیتے ہو۔ تمھیں پتہ ہے کہ علی ابن الحسینؑ کتنے مالدار ہیں۔ کتنے آسودہ ہیں۔ ہم انکے رشتہ دار ہیں۔ قریبی رشتہ دار ہیں۔ وہ ہمیں کبھی کچھ نہیں دیتے۔ خدا انھیں اس کا برا بدلا دے"۔

"اچھا اب میں چلوں"۔ روٹیاں بانٹنے والے نے کہا۔ اور پھر اپنا بوجھ کمر پر لاد کر چل دیا۔

اس نے رات میں تقریباً سو دروازں پر دستک دی۔ ہر گھر میں لوگ اس کے منتظر تھے اور جاگ رہے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے پاس سارا کھانا اور سارے درہم و

دینار ختم ہو گئے۔ اب یہ شخص اپنے گھر کی طرف واپس مڑا۔

یہ آدھی رات میں کیوں نکلتا ہے؟ دن میں ان گھروں پر آکر انھیں یہی چیزیں کیوں نہیں بانٹ دیتا؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ غریب بہت ہیں مگر خوددار بھی بہت ہیں۔ بھوکے مر سکتے ہیں مگر ہاتھ نہیں پھیلا سکتے۔ دن کی روشنی میں جب دینے والا انھیں دے گا تو یہ لیتے ہوئے شرمائیں گے۔ ان کی آنکھ نیچی رہے گی۔ انھیں شرمندگی ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی شرم سے مجبور ہو کر یہ لینے سے ہی انکار کر دیں۔ رات کا اندھیرا ان کا پردہ رکھ لیتا ہے۔ انھیں اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ شخص جو روز رات کے اندھیرے میں آتا ہے اور انھیں چپکے سے کھانے پینے کی چیزیں دے جاتا ہے۔ پیسے دے جاتا ہے۔ یہ انھیں دن کے اجالے میں اچھی طرح پہچانتا بھی ہو گا۔ چونکہ یہ غریب مگر غیرت مند لوگ اسے نہیں پہچانتے ہیں اس لئے وہ بھی کسی احساس کمتری کا شکار نہیں ہونے پاتے۔

مگر یہ شریف آدمی ہے کون جو لوگوں کی ضرورتیں اتنی تکلیف اٹھا کر پوری کرتا ہے۔ صرف انھیں احساس کمتری اور شرمندگی سے بچانے کے لئے رات کا انتظار کرتا ہے۔ اور اندھیرے اور خاموشی کی چادروں میں اپنا دست عطا لپیٹ کر ان کے دل کی دعائیں لیتا ہے۔ اور پھر ایک دو دن کی بات نہیں۔ اس شخص کا یہ عمل، یہ وطیرہ، یہ طریقہ، یہ انداز، یہ شعار برسوں سے ہے۔ بچے اس کی دستک پہچانتے ہیں اور اسے روٹیوں والا کہتے ہیں۔ یہ راز کون کھولے؟ کئی لوگوں نے نام پوچھا ہو گا مگر یہ اپنا نام کسی کو نہیں بتاتا۔

یہ راز اس کی موت کے بعد کھلا۔

جب رات گزر گئی اور وہ نہیں آیا۔ لوگوں نے سوچا، غور کیا، دوسروں سے پوچھا تو اچانک انھیں خیال آیا۔

دن میں انھوں نے سنا تھا یہ آج مدینے کی بہت اہم شخصیت یعنی امام زین العابدین کا انتقال ہو گیا ہے۔

جب انکی میت کو غسل دیا جا رہا تھا تو کسی نے دیکھا ان کی پشت پر ایک سیاہ نشان تھا۔ امام زین العابدین کے لخت جگر محمد باقر سے پوچھا گیا۔ "یہ نشان کیسا ہے"؟ اور بیٹے نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "میرا باپ ہر رات شہر کے غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کے لئے روٹیاں اپنی پشت پر رکھ کر لے جاتا تھا۔ کوئی اگر اتنی رات گئے مل بھی جاتا اور کہتا کہ میں اسے اٹھا کر چلوں تو وہ نرمی سے کہتا "قیامت کے دن ہر ایک کو اپنا بوجھ اٹھانا ہو گا"۔ مسلسل برسوں اپنی پشت پر روٹیاں رکھ کر فقراء و مساکین کے گھروں پر پہنچانے کی وجہ سے یہ نشان پڑ گیا ہے۔)

اب اس شخص کو کتنی ندامت ہے جو روز کہتا تھا کہ ایک تم ہو بھائی کہ نہ ہمارے عزیز ہو نہ رشتہ دار ہو۔ نہ محلہ دار ہو اور اتنا کرم کرتے ہو۔ اور ایک علی ابن الحسین ہیں وہ ہمارا کوئی خیال ہی نہیں کرتے۔

علی ابن الحسین نے برسوں یہ کتنی بار یہ جملہ سنا۔ ایک دفعہ بھی تو نہ کہا کہ ایسا نہ کہو۔

امامؑ کے علاوہ کون اتنا عالی ظرف ہو سکتا ہے؟

جو شخص ایسے فاقہ زدہ لوگوں کو راتوں کے اندھیرے میں کھانا اور پیسہ پہنچاتا ہو جو اپنی غیرت کی وجہ سے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے میں عار محسوس کرتے ہوں وہ بھلا دن کے اجالے میں لوگوں کو اپنے دست عطا کی فیاضیوں سے کیسے محروم کر سکتا تھا۔

سخاوت امام زین العابدین کا ذاتی وصف ہی نہیں خاندان کی پہچان بھی تھی۔

یہ ان کے ہاں کی روایت تھی کہ کبھی کوئی سوالی در سے خالی نہیں لوٹا۔ یہ روایت رسول سے شروع ہوئی تھی جنکے پاس اگر کبھی صرف اتنا ہوتا تھا کہ خود کھا لیتے لیکن کوئی فقیر آجاتا تو آپ اسے دے دیتے اور خود بھوکے رہ جاتے۔ یہ روایت رسول کے بعد رسول کی بیٹی نے آگے بڑھائی۔ ھل اتی اس کی گواہی دے گی۔ کبھی مسکین آگیا، کبھی یتیم نے صدا لگا دی۔ کبھی اسیر نے مانگ لیا اور تین دن کے فاقے کے باوجود فاطمہ کے گھرانے والے اپنی روایت کو نبھاتے رہے۔ کھانا مانگنے والے کو دیدیا۔ خود بھوکے سو گئے۔

علی ابن الحسین اسی روایت کا ورثہ دار ہے۔

جب کوئی شخص سوال کرتا تو آپ خوش ہوتے۔ سائل سے کہتے "خدا تیرا بھلا کرے تو میرا زاد راہ آخرت اٹھانے آگیا"۔ غربا، فقراء اور مساکین کو بلاتے۔ ان کو بڑی عزت سے اپنے دسترخوان پر اپنے ساتھ بٹھاتے۔ یہاں تک ہوتا کہ اندھوں، محتاجوں اور معذوروں کو اپنے ہاتھ سے کھلاتے۔ ان سے پوچھتے گھر میں کتنے لوگ ہیں۔ پھر انکے بچوں اور گھر والوں کے لئے کھانا ساتھ بھی کر دیتے۔

تاریخ میں جو عظیم لوگوں کے افعال و اعمال کی امانت دار ہے، اگر اس سے پوچھا جائے کہ تیری آنکھ نے کوئی ایسا آدمی دیکھا جو فقیر کو صرف خیرات، صدقہ اور مالی امداد ہی نہیں دیتا عزت بھی دیتا ہے۔ یتیم کا پیٹ ہی نہیں بھرتا شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ بھی دھرتا ہے۔ محتاج کی ضرورت ہی پوری نہیں کرتا اس سے محبت بھی کرتا ہے تو صدیوں کے خزینے میں سے تاریخ ایک بھی ایسا فرد پیش نہیں کر سکے گی۔ امام زین العابدین جب سائل کو عطیہ دیتے تو پھر اس سے واپس لے کر اسے چومتے اور کہتے اس طرح میں خدا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہوں۔ مانگنے والے کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو سکوں کی کھنک سے تو بہت لوگوں نے آشنا کیا ہے لیکن اس احساس سے آشنا کسی نے

نہیں کیا کہ اس کی بھی عزت کی جا سکتی ہے۔

موسم گزر جاتا تو لباس فقیروں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اس میں اونی لباس بھی شامل ہوتا تھا اور پوستین بھی۔ کسی نے کبھی ٹوکا بھی کہ پوستن ایک موسم میں کہاں خراب ہوتی ہی۔ نئی سی رہتی ہے۔ چلیں اگر آپ دوسرے موسم میں نہیں پہننا چاہتے تو اتنی قیمتی چیز فقیر کو تو نہ دیں۔ اسے فروخت کر کے اس کی قیمت بانٹ دیا کریں۔ امام نے کہا مجھے شرم آتی ہے کہ میں اس لباس کو بیچوں جس میں میں نے نماز پڑھی ہو۔ سرور کائنات نے کہا تھا جو چیز اپنے لئے پسند کرو وہی دوسرے کے لئے پسند کرو۔ زین العابدین نے اس اصول کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری کیا۔ خیرات اور صدقے کے شعبے میں بھی اپنے اصحاب سے کہتے کہ وہی چیز خیرات کرو جسے خود کھانا زیادہ پسند کرتے ہو۔ اسی لئے اکثر شکر اور بادام خیرات کرتے تھے۔

امام زین العابدینؑ کی عادت تھی کہ جب کھانے کے لئے بیٹھتے تو جتنا کھانا خود کھانا ہوتا اتنا کھانا پہلے راہ خدا میں دیدیتے اور کھانے کے دوران کوئی فقیر صدا دیتا تو پسندیدہ ترین چیز اسے بجھوادیتے۔ ایک بار ایک خوشہ انگور بھی دسترخوان پر تھا۔ کسی فقیر نے صدا دی۔ آپ نے کنیز سے کہا یہ خوشہ انگور اسے دے آؤ۔ کنیز وہ خوشہ اٹھا کر فقیر کو دے آئی لیکن دسترخوان پر دوسرا خوشہ رکھ دیا۔ پھر کسی فقیر کی صدا آئی۔ آپ نے دوسرا خوشہ بھی بجھوا دیا۔ تیسری بار بھی یہی ہوا۔ آخر کنیز نے فقیر کو خوشہ انگور کے بجائے انگور کی قیمت دی۔ تب امام انگور کھا سکے۔ اس پر بے ساختہ وہ واقعہ یاد آجاتا ہے کہ جب سیدہ کونین بیمار تھیں تو حضرت علیؑ نے ان سے کہا "رسول کی بیٹی تم نے زندگی میں مجھ سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک بار تو فرمائش کرو"۔ جناب سیدہ نے کہا "اچھا انار مجھے بہت پسند ہیں"۔ انار کا موسم نہ تھا۔ بڑی مشکل سے حضرت علیؑ نے کہیں سے ایک انار ڈھونڈا۔ گھر آرہے تھے تو راستے میں کوئی فقیر ملا۔

آپ نے اس کا حال پوچھا۔ فقیر نے کہا یا علی۔ بیمار ہوں۔ آپ اس کے پاس بیٹھ گئے۔ عیادت کی۔ تسلی کے کلمات کہے۔ اس سے پوچھا کس چیز کو جی چاہتا ہے؟ اس نے کہا "انار کو"۔ علی نے انار اپنے ہاتھوں سے چھیلا۔ اپنے ہاتھوں سے دانے نکال کر اسے کھلائے اور گھر واپس آگئے۔ فاطمہ سے کہہ دیا کہ انار تو تمہارے لئے لایا تھا لیکن یہ نہ ہو سکا کہ سائل کا سوال رد کر دوں۔

سید سجاد کی رگوں میں اسی علی کا خون گردش کر رہا تھا۔ جبھی تو فرزدق نے کہا تھا کہ اگر تشہد میں لا کا لفظ نہ ہوتا تو انکی زبان سے کبھی "نہیں" کا لفظ نہ نکلتا۔

علی ابن الحسینؑ نے زندگی میں دو بار اپنے مال کا نصف راہ خدا میں دیا اور چار بار راہ خدا میں پورا گھر لٹا دیا۔

کاش ہمارے سر پر انکی خاک پا کا ایک ذرہ ہی پڑ جائے۔

حلم

اہل دنیا کا طریقہ تو یہ ہے کہ اگر ان کے پاس طاقت ہے تو دوسروں کو کچل ڈالتے ہیں۔ ہر طرح کی دھونس، دھاندلی، زبردستی، لوٹ مار اور تعدی اپنی طاقت کے بل پر کرتے ہیں۔ اور اگر دوسرا طاقت ور ہے تو اس کے آگے دم نہیں مارتے۔ اس کی ہر بات بلا چوں و چرا مان لیتے ہیں۔ اور دوسرا ظلم کرے تو روتے ہیں، فریاد کرتے ہیں، احتجاج کرتے ہیں، بددعائیں دیتے ہیں یا پھر گڑگڑانے لگتے ہیں۔

زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو، کوئی بھی مرحلہ ہو، اللہ والوں کا رد عمل دنیا والوں سے بڑا مختلف بلکہ اکثر متضاد ہوتا ہے۔ اگر دوسرا ان کے خلاف طاقت استعمال کرتا ہے تو وہ پہلے اسے سمجھاتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ خون خرابہ نہ ہو۔ لیکن دوسرا اپنی طاقت کے بل پر اور اقتدار کے نشے میں ان سے جنگ شروع کر ہی دے تو وہ کثرت و قلت کا خیال دل میں لائے بغیر اور فتح و شکست کی پروا کئے بغیر باطل سے ٹکرا جاتے ہیں۔ سر دے دیتے ہیں۔ ہاتھ میں ہاتھ نہیں دیتے۔ پھر انھیں شکست ہو جائے تو ظالم کے آگے نہ گڑگڑاتے ہیں نہ روتے ہیں نہ فریاد کرتے ہیں۔ نہ بددعائیں کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انھیں یقین ہوتا ہے کہ خدا ظالم سے ان کا بدلہ خود لے گا۔

اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہو یعنی اللہ والے کے پاس طاقت ہو تو وہ ان سے بھی نرمی، محبت اور شفقت سے بات کرتا ہے جو اس سے دشمنی کرتے ہیں یا اس کا مضحکہ اڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ جگر، یہ ظرف یہ حوصلہ صرف مردان خدا ہی کا ہوتا ہے کہ دوسرا کمزور بھی ہے، بدتمیزی بھی کر رہا ہے یعنی وہ سزا کے قابل بھی ہے اور اسے سزا دی بھی جا سکتی ہے پھر بھی عفو و درگذر کا مظاہرہ کیا جائے۔ یہ حلم کی انتہا ہے۔ اور حلم کی انتہا بھی علم کی طرح ورثہ انبیاء ہے۔

فتح مکہ کا دن حضور سرور کونینؐ کے دنیاوی اقتدار کا اہم دن تھا۔ جن لوگوں نے راستوں میں کانٹے بچھائے تھے، سر پر کوڑا کرکٹ ڈالا تھا، برا بھلا کہا تھا، دھمکیاں دی تھیں، سماجی بائیکاٹ کیا تھا، ستایا تھا، پریشان کیا تھا، بدعہدی کی تھی، فوج کشی کی تھی، آج وہ سب لوگ حضورؐ کے رحم و کرم پر تھے۔ یہ بھی عین عدل ہوتا اگر حضور ان تمام لوگوں کو ان کے اعمال کی سزا دیتے۔ لیکن حلم ورثہ انبیاء ہے، اور آخری نبی کا حلم، سب سے افضل نبی کا حلم بھی تو سارے نبیوں کے حلم سے اعلیٰ ہونا چاہیے۔ رسول نے سب کو معاف کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ ان کی عزت افزائی کی۔ کہا کہ جو ابوسفیان کے گھر چلا جائے اسے بھی امان ہے۔ اپنے سب سے بڑے دشمن کو اتنا بڑا اعزاز دینا۔۔۔ یہی اخلاق اور عالی ظرفی کی معراج ہے۔

علیؑ ۔۔۔ وہی علیؑ جو اسد اللہ کہلاتا تھا۔ جس کی برش شمشیر نے کفار و مشرکین کے چھکے چھڑا دیئے۔ جس نے بدر و احد و خندق و خیبر میں اسلام کی فتح مبین کا پرچم لہرایا۔ ایک دن اسی علیؑ کے گھر پر لوگ جمع ہوگئے۔ اس کا گھر جلانے کی دھمکی دی گئی۔ اس کا دروازہ توڑ دیا گیا۔ اس کے گلے میں رسی باندھی گئی۔ کیا علی اس قدر کمزور ہو گیا تھا؟ کیسے مان لیا جائے۔ جبکہ آخری عمر میں علی کی تلوار پھر نیام سے نکلتی ہے اور صفین اور جمل میں پھر حشر برپا کر دیتی ہے۔ یہ علی کی کمزوری نہیں تھی۔ حلم تھا۔ یہ اسوہ رسول کی پیروی تھی۔ ایک بڑے مقصد کی خاطر، اتحاد اسلامی کی خاطر۔۔۔ ہر مصیبت گوارا۔۔۔ ہر پریشانی قبول۔

یہی ورثہ انبیاء علی ابن الحسینؑ کی بھی فطرت کا جزو ہے۔ لوگ اپنی زبونی فطرت سے باز نہیں آتے اور نیکی کے اس مجسمے کو برا بھلا کہتے ہیں۔ آپ کے اصحاب لڑنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آپ کے غلام مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ امام ہے۔ خلق محمدی کا ورثہ دار ہے۔ کسی انسان کو اس کی غلطی، جہالت اور بے

وقوفی پر یہ کیسے سزا دے سکتا ہے۔ اس نے تو اپنی سواری کے جانور کو بھی کبھی کوڑا نہیں مارا۔

امام زین العابدینؑ اپنے اصحاب کے مجمع میں تشریف رکھتے ہیں۔ حکمت کے پھول کھل رہے ہیں۔ موعظت کے چشمے ابل رہے ہیں۔ اہل محفل پر وجد کا عالم طاری ہے۔ ایسے میں ایک شخص درانہ محفل میں گھس آتا ہے۔ اور امام کو برا بھلا کہنے لگتا ہے۔ امام کے اصحاب غیظ میں آجاتے ہیں اور اسے سزا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن امام ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہیں۔ آدمی بھی اہل محفل کی برہمی محسوس کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ شام کو اسی شخص کے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ وہ دروازہ کھولتا ہے تو ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے۔ سامنے امام زین العابدین کھڑے ہیں اور ان کے پیچھے بہت سے لوگ موجود ہیں جن میں اصحاب بھی ہیں اور امام کے غلام بھی ہیں۔ اس شخص کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ اتنے لوگوں کا میں کیسے مقابلہ کر سکتا ہوں۔ اتنے آدمی تو میری تکا بوٹی کر کے رکھ دیں گے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس صورت حال سے کیسے نمٹے۔ گھبراہٹ اس کے بشرے سے ظاہر ہے۔ پسینہ پیشانی سے پھوٹ نکلا ہے۔ لیکن یہ سب اس کی غلط فہمی کی وجہ سے ہے۔ امام اخلاقی طور پر بہت بلند انسان ہوتا ہے۔ وہ بدلہ نہیں لیتا۔ وہ رحمت اللعالمین کا وارث دار ہے۔ صاحب خلق عظیم کا نواسہ ہے۔ وہ تو فضل کی بارش کرتا ہے۔ کرم کے موتی برساتا ہے۔

"بھائی۔" امام اسے بہت دھیمے لہجے میں مخاطب کرتے ہیں "تم نے تو ہمیں اتنا ہی برا کہا ہے جتنا تمہیں معلوم تھا۔ تمھیں کیا پتہ۔ ہم جانتے ہیں۔ جتنا تم نے کہا ہم اس سے بھی بہت برے ہیں۔ اور ہاں کوئی حاجت ہو تو بیان کرو"۔

حیرانی نے اور حیرانی سے زیادہ ندامت نے، شرمندگی نے اس آدمی کو گنگ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس سے کوئی جواب بن نہیں پڑ رہا۔ امامؑ دوش سے ردا اتارتے

ہیں اور تحفے کے طور پر دے دیتے ہیں۔ اور ردا کے ساتھ ایک ہزار درہم بھی اسے عطا کرتے ہیں۔ جو آدمی کچھ دیر پہلے برائیاں کر رہا تھا اب اسی کی زبان پر قرآن کی یہ آیت ہے کہ خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے۔

ایک بار کسی نے برا بھلا کہا تو اسے جواب دیا "بھائی۔ جو بات تو نے میرے لئے کہی ہے وہ اگر صحیح ہے تو خدا مجھے معاف کرے۔ اور اگر غلط ہے تو خدا تجھے معاف کرے"۔ ایسے ہی ایک اور موقع پر کہا "اگر میں نے جہنم کی گھاٹی کو پار کر لیا تو پرواہ نہیں جو چاہے کہتے رہو۔ اور اگر پار نہ کر سکوں تو پھر اس سے زیادہ برائی کا مستحق ہوں جتنی تم نے کی ہے"۔ ایک اور شخص کو جواب دیا "بھائی۔ میں نے تو تیرا کچھ نہیں بگاڑا۔ بہرحال کوئی حاجت رکھتا ہو تو کہہ"۔

ایک آدمی کو جب کوئی شخص برا بھلا کہتا ہے تو فطری بات ہے کہ آدمی کو برا لگتا ہے۔ غصہ آتا ہے اور جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ اگر غلط ہو، الزام ہو، بہتان ہو، افترا ہو، جھوٹ ہو تو بہت غصہ آتا ہے۔ اور آدمی سزا دینے کی، بدزبانی کا بدلہ لینے کی طاقت بھی رکھتا ہو تو غصے کی حد نہیں رہتی۔۔ لیکن زین العابدین کبھی سزا نہیں دیتے، کبھی بدلہ نہیں لیتے، برا نہیں مانتے، بددعا نہیں دیتے، منع تک نہیں کرتے۔ بڑے نرم انداز میں، میٹھے لہجے میں، خندہ روئی کے ساتھ، معذرت خواہانہ طریقے پر، اس سے پوچھتے ہیں کہ بھائی اس ناراضگی کا سبب کیا ہے؟ اس کی حاجت پوچھتے ہیں، ضرورت معلوم کرتے ہیں۔ مشکل کو حل کرتے ہیں۔

ایک بار مسجد میں ایک شخص نے آپ سے کہا "تمھیں معلوم بھی ہے کہ نماز کیا ہے؟" کیا گستاخانہ انداز ہے۔ اور پھر خطاب کس سے ہے سید الساجدین سے۔ زین العابدین سے۔ ابوحازم اس شخص کو مارنے کے لئے جھپٹتے ہیں۔ امام روک دیتے ہیں۔ "سنو ابوحازم علماء کو تحمل لازم ہے۔ اسے آداب گفتگو نہیں آتے۔ ہمیں تو

جواب کے آداب آتے ہیں"۔ پھر اس آدمی سے کہا "ہاں مجھے معلوم ہے کہ نماز کیا ہے۔ تو جو پوچھنا چاہتا ہو پوچھ"۔ وہ شخص سوال کرتا جاتا ہے امام جواب دیتے جاتے ہیں۔

افتتاح نماز کیا ہے؟

تکبیر

برہان نماز کیا ہے؟

سورہ حمد

خشوع نماز کیا ہے؟

سجدہ گاہ پہ نظر

تحصیل نماز کیا ہے؟

سلام

جوہر نماز کیا ہے؟

سبحان اللہ پڑھنا

نماز کا تمام و کمال کیا ہے؟

محمد و آل محمد پر درود

سائل کو اپنے سوالات کے جوابات پا کر اطمینان قلب تو ہوا ہی۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ جن کا علم بے کراں ہوتا ہے ان کی بردباری، تحمل، نرم گفتاری اور خوش روئی بھی بے پایاں ہوتی ہے۔

دشمنوں سے سلوک

زندگی ایک جنگ ہے، معرکہ ہے، ستیز ہے۔ اور عام لوگ جنگ میں ہر چیز کو جائز سمجھتے ہیں۔ اسی لئے زندہ رہنے کی اس جدوجہد میں جیسا بھی مرحلہ آجائے، حالات جس چیز کا بھی تقاضا کریں، وہی کرنے کو لوگ تیار رہتے ہیں۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ معاشرہ اچھائی بھلائی نیکی اخلاق محبت اور ایثار کے کتنے بھی نعرے لگائے لیکن عملی طور پر اس میں جنگل کا قانون چلتا ہے۔ جس کا داؤ لگے وہ مار جاتا ہے۔ یہ لوگ بھی صورتیں تو انسانی رکھتے ہیں لیکن خود غرضی اور موقع پرستی نے ان کی ذہنی سطح کو جانوروں کی سطح کے برابر کر رکھا ہے۔ انھیں اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ جب دوسرے نے ان کے منھ کا نوالہ نہیں چھینا ہے تو انھیں بھی دوسروں کے منھ کا نوالہ نہیں چھیننا چاہئے۔ انھیں صرف اتنا پتہ ہوتا ہے کہ اپنا پیٹ بھرنا ضروری ہے۔ سو وہ اپنا پیٹ بھرنے بلکہ اسے ضرورت سے زیادہ بھرنے کی وحشیانہ تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے لئے یہ چیز قطعاً توجہ کے لائق نہیں ہے کہ ان کی ہوس کی دراز دستی کے نتیجے میں کتنے لوگ بھوکے مر گئے۔

لیکن اسی بھیڑیوں کے مزاج والی اکثریت میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو انسان بن کے سوچتے ہیں۔ ان کے دل میں انصاف ہے۔ اور فطرت میں شرافت۔ وہ بھی اسی معرکہ زندگی میں حصہ لے رہے ہیں۔ زندہ رہنے کی جدوجہد ان کا بھی مسئلہ ہے۔ کشاکش روزگار ان کے ساتھ بھی لگی ہوئی ہے۔ وہ بھی اپنا پیٹ بھرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اپنی محنت سے۔ وہ دوسرے کے منھ کا نوالہ نہیں چھینتے۔ ہاں کوئی ان کے منھ کا نوالہ چھینے تو اس سے زور آزمائی ضرور کرتے ہیں۔ یہ انسانوں کی سطح ہے۔ ضرورتیں اپنی جگہ اہم ہیں۔ مقدم ہیں۔ لیکن کچھ اصول بھی ہیں۔ دوستوں کے ساتھ

دوستی اور دشمنوں کے ساتھ دشمنی۔

اسی انسانی معاشرے میں بہت تھوڑے سے ، لاکھوں کروڑوں میں چند ، ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو اخلاقی اعتبار سے عظیم ترین انسانوں کی صف میں آتے ہیں۔ یہ صف مقدس لوگوں کی ہے۔ ان لوگوں کی جن کی پیروی میں فلاح ہے۔ جن کی تاسی میں نجات ہے۔ جن کا وجود معاشرے کو وہ توازن بخشتا ہے جو اس کی بقا کی ضمانت ہے۔ عظیم ترین لوگوں کی اس صف میں دنیا کے بادشاہ گھس نہیں سکتے۔ کیونکہ دنیاوی بادشاہ کا فخر اس کا تاج ہوتا ہے اور تاج بادشاہی ان لوگوں کے ہاں ٹھوکر میں رہتا ہے۔ یہ صف اللہ والوں کی ہے۔ رسولوں کی ہے۔ نبیوں کی ہے۔ معصوموں کی ہے۔ اماموں کی ہے۔ ان لوگوں کی ہے جو اپنے منھ کا نوالہ دوسروں کو دے دیتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اسی معاشرے میں سانس لیتے ہیں جس میں خود غرضی ، موقع پرستی اور دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کو عقلمندی سمجھا جاتا ہے۔ جہاں نفسانفسی کا عالم ہے۔ جہاں ہر شخص سارے جہان کی راحتیں ، آسائشیں اور آرام اپنی جھولی میں سمیٹنا چاہتا ہے۔ جہاں ہر ایک دوسرے کو اپنا مقابل ، مخالف اور دشمن جانتا ہے۔ لیکن انہی حالات میں ، اسی ماحول میں ، اسی گردوپیش میں ، اللہ والے اپنی زندگی ایک مختلف انداز سے گزارتے ہیں۔ ان کی جدوجہد کا محور زندہ رہنا نہیں ہوتا۔ ان کی کوششوں کا مرکز خوشنودی کردگار ہوتی ہے۔ یہ لوگ وہ نہیں کرتے جو حالات کا تقاضا ہوتا ہے بلکہ وہ کرتے ہیں جو نیکی اور ایثار کا تقاضا ہوتا ہے۔ یہ اعلیٰ قدروں کے نعرے نہیں لگاتے۔ ان پر عمل کرکے دکھاتے ہیں۔ اور وہ بھی ان حدوں تک جس پر انسان حیرت کرتے ہیں اور ملائکہ فخر و مباہات کرتے ہیں۔ انھیں اپنے لئے کچھ نہیں چاہیے۔ کیونکہ اللہ ان کے لئے کافی ہے۔ اور وہی بہترین کارساز ہے۔ یہ صرف دیتے ہیں۔ اور بدلے میں کچھ نہیں چاہتے۔ اس لئے کہ انھیں اللہ کے وعدے پر یقین ہے جو بہترین جزا دینے والا ہے۔ اپنا پیٹ بھرنا بھی ان کے لئے ضروری نہیں۔ کیونکہ اپنا

کام تو پیٹ پر پتھر باندھ کر بھی چل جاتا ہے۔ ہاں کوئی مانگنے والا، کوئی سوالی، کوئی گداگر، کوئی فقیر، کوئی بے نوا، کوئی مسکین، کوئی یتیم، کوئی اسیر، کوئی ضرورت مند بھوکا نہ رہ جائے۔

ان کے ہاں دوست دشمن کی بھی تفریق نہیں ہے۔ ان کی عطا تو دریا کی طرح ہے۔ جو بھی پیاسا ہو وہ سیراب ہو جائے۔ ان کا فیض بادل کی طرح ہے جو وادی پر بھی برستا ہے اور دشت پر بھی۔ اور کسی سے نہیں کہتا کہ میرا احسان مان۔ دوسروں کی حاجت روائی ان کی خاندانی روایت ہے۔ مشکل کشائی ان کے خمیر میں ہے۔ دوستوں پر تو لطف و عنایت کی بارش اور لوگ بھی کر لیتے ہیں لیکن دشمنوں کے ساتھ مہربانی اور تلطف کے ساتھ پیش آنا بہت مشکل کام ہے۔ اور دشمن بھی ایسے جنھوں نے ایذا دینے، آزار پہنچانے، پریشان کرنے، ستانے اور تکلیفیں دینے کیلئے اپنی زندگیاں اور زندگیوں کی ساری توانائیاں وقف کر دی تھیں۔ یہ بڑی لرزہ خیز منزل ہے۔ اس تہلکہ کو چاہیے فوق البشر کا دل۔ اور اتنا بڑا دل، اتنا وسیع ظرف، اس قدر رحمدلی خاندان رسالت کے علاوہ کہاں پائی جا سکتی ہے۔

واقعہ کربلا کو تین سال گزر چکے تھے۔ جس بات کو بنیاد بنا کر حسینؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کیا تھا۔ اور جسے زبان پر لانے کی ہمت واقعہ کربلا سے پہلے کسی میں نہیں تھی۔ اب وہ بات ہر ایک کی زبان پر تھی۔ ہر ایک کہہ رہا تھا کہ یزید فاسق و فاجر ہے۔ اہل حجاز کے نمائندے یزید کا اسلام اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے تھے۔ اور اس سے سخت متنفر تھے۔ انھیں یوں لگ رہا تھا کہ اگر اب بھی وہ یزید کو خلیفہ مانتے رہے اور اس کی حرکتوں پر اپنی خاموشی سے صاد کرتے رہے تو عذاب نازل ہوگا۔ آسمان سے پتھر برسنے لگیں گے۔ سو اہل مدینہ نے یزید کی بیعت توڑ دی۔ اور عثمان بن محمد بن ابوسفیان کو جو یزید کی طرف سے عامل مدینہ تھا، قصر حکومت

سے نکال باہر کیا۔ اہل مدینہ میں بنی امیہ کے خلاف بڑا جوش و خروش تھا۔ بنی امیہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ انھوں نے اتنے عرصے کے اقتدار میں جو کچھ بویا تھا اب وہی کاٹنے کا وقت آگیا ہے۔ زمانے نے کروٹ بدلی ہے۔ بنی امیہ نے دوسروں پر جو مظالم کئے تھے اب وہی بنی امیہ پر کئے جائیں گے۔

مروان بن حکم نے دیکھا کہ دنیا کا رنگ بدل رہا ہے۔ اب بنی امیہ کے سروں کی کھیتیاں کاٹی جائیں گی۔ اب بنی امیہ کی عورتوں کو ذلیل و رسوا کیا جائے گا۔ اب بنی امیہ سے بدلہ لیا جائے گا۔ ظالم بہت بزدل ہوتا ہے۔ مروان ڈر گیا۔ عبداللہ بن عمر کے پاس گیا۔ ان سے درخواست کی کہ آپ کی مدینہ میں بڑی حیثیت ہے۔ میری بیوی عائشہ عثمان کی بیٹی ہیں۔ آپ اپنے باپ اور میرے سسر کی قربت کا خیال کریں اور اس ہنگامے میں میری مدد کریں۔ میری بیوی کو اور میرے بچوں کو اپنی پناہ میں لے لیں۔ لوگ آپ کا لحاظ کرتے ہیں۔ اور اگر میرے بیوی بچے آپ کی پناہ میں ہوں گے تو بنی امیہ کے خلاف کتنا بھی فتنہ وفساد پھیلے، ان کو گزند نہیں پہنچے گا۔ عبداللہ بن عمر مصلحت اندیش آدمی تھے۔ انھوں نے اس درخواست کو منظور نہ کیا۔ اب مروان کیا کرے۔ اپنی حمایت کے لئے کس کو تلاش کرے۔ کون ایسا ہے جس کی اعلیٰ سماجی حیثیت بھی ہو۔ مدینے والے اس کا لحاظ بھی کرتے ہوں۔ اور اس وقت میں جب سب کی نگاہیں بدل گئی ہیں اور بنی امیہ کے خلاف سخت شورش ہو رہی ہے وہ مروان کے بیوی بچوں کو اپنی پناہ میں لے کر خواہ مخواہ کا خطرہ مول لے۔ بنی امیہ سے ہمدردی کسی کو ہے ہی نہیں۔ اپنے دور اقتدار میں انھوں نے کس کے ساتھ اچھائی کی تھی؟

خوف اور دہشت کے اس اندھیرے میں صرف ایک امید کی کرن تھی۔ امام زین العابدینؑ۔ لیکن بنی امیہ نے تو دنیا میں سب سے زیادہ بنی ہاشم ہی کو ستایا ہے۔

خاندان رسالتؐ پر ہی سب سے زیادہ ظلم توڑے ہیں۔ کربلا کے سانحے کو کتنا عرصہ گزرا ہے۔ ابھی تو زین العابدینؑ کے دل پر اٹھارہ بنی ہاشم کے داغ تازہ ہیں۔ ابھی تو کوفہ و شام کے درباروں اور بازاروں میں ان کی دربدری اور اسیری ان کی نظروں میں گھومتی ہوگی۔ ان سے کس طرح کہا جائے کہ ہم نے تو جی بھر کے آپ پر ظلم توڑے لیکن اس وقت جبکہ ہم مصیبت میں ہیں آپ ہماری دستگیری کریں۔ لیکن غرض بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ بات کتنی بھی غلط ہو لیکن آدمی نہ صرف کہہ دیتا ہے بلکہ امید بھی رکھتا ہے کہ شاید دوسرا سب کچھ بھول کر اس کی بات مان لے۔ مروان بن حکم امام زین العابدینؑ کے پاس گیا۔ اور اپنا مدعا کہا۔ انتہائی سخت دشمن۔ خاندانی دشمن۔ وہ شخص جس کے خاندان نے اہل بیت کا باغ اجاڑ دیا۔ قتل، پامالی، اسیری، تشہیر۔۔۔ اتنے دکھ دیے، اتنے صدمے پہنچائے۔۔۔۔ہاں یہ سب کچھ ہے۔ انصاف کی رو سے یہی صحیح ہے کہ امام اس سے صرف اتنا کہیں کہ کیا تو وہ سارے ظلم و ستم بھول گیا جو تو نے اور تیرے خاندان نے ہم پر کئے۔ اب زمانے کے انقلاب کا مزہ چکھ۔ تاکہ تجھے بھی تو اندازہ ہو کہ جب کسی کے گھر والے قتل ہوتے ہیں اور ان کی بے حرمتی ہوتی ہے تو آدمی کو کیسا لگتا ہے۔

لیکن یہ بنی فاطمہ کا گھر ہے۔ یہاں کبھی کسی سوال کرنے والے کا سوال رد نہیں کیا جاتا۔ مستحق نہیں ہے تو کیا ہوا۔ دیدو۔ اس نے سوال کر کے اپنی عزت ہمارے حوالے کی ہے۔ ہمیں یہ نہیں دیکھنا کہ اس کے خاندان کا شعار کیا رہا ہے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے بزرگوں کا وطیرہ کیا تھا۔ امام نے جواب دیا "ان کو میرے پاس بھیج دے۔ میں ینبوع جا رہا ہوں۔ بہت سے اور بھی خاندان ہیں جنکی عورتیں اور بچے میرے ساتھ ینبوع جا رہے ہیں۔ وہ سب میری پناہ میں رہیں گے۔ میں ان کی حفاظت کا بھی ضامن ہوں اور ان کی کفالت کا بھی۔ تو فکر نہ کر۔ میں انھیں ہر فتنے سے دور رکھوں گا"۔

اہل مدینہ کی بغاوت کو فرو کرنے جب مسلم بن عقبہ کی سربراہی میں دس ہزار کا یزیدی لشکر آیا تو اس نے شہر نبی کے تقدس کو جی بھر کے پامال کیا۔ تین دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ دس ہزار آدمی تہہ تیغ کر دیے گئے جن میں سات سو تو صحابی تھے۔ مہاجرین و انصار کی خواتین بے آبرو کی گئیں۔ گھر لوٹ لئے گئے۔ مسجدیں ویران کر دی گئیں۔ مسجد نبوی میں گھوڑے باندھے گئے۔ لوگوں سے اسی شرط پر بیعت لی گئی کہ ہم یزید کے غلام ہیں۔ چاہے وہ ہمیں قتل کرے یا بیچ دے۔

واقعہ حرہ کے دوران جب اہل مدینہ پر قیامت آئی ہوئی تھی صرف وہ لوگ محفوظ رہے جو امامؑ کی حفاظت میں ینبوع میں تھے۔ ان میں چار سو عورتیں شامل تھیں۔ جس کے گھر والوں کو بے مقنع و چادر بازاروں میں پھرایا گیا وہی اہل مدینہ کی عزتوں کا محافظ بنا۔

چند دن بعد اس قیامت کا رخ مکہ کی طرف پھر گیا۔ مسلم بن عقبہ مر چکا تھا اور اس کی جگہ حصین ابن نمیر نے لے لی تھی۔ لیکن مسلم بن عقبہ حصین ابن نمیر سے کہہ کر مرا تھا کہ نہ مکہ کی حرمت کا خیال کرنا نہ خانہ کعبہ کے تقدس کا۔ یزید کے اقتدار کو سہارا دینا زیادہ ضروری ہے۔ چنانچہ حصین ابن نمیر نے خانہ کعبہ پر گولہ باری کی۔ حرم کو آگ لگا دی اور عمارت کعبہ کو ڈھا دیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ مکہ کی فتح مکمل ہو سکتی یزید کے مرنے کی اطلاع پہنچ گئی۔ سردار کی موت لشکر کو ہمیشہ بد دل اور منتشر کر دیتی ہے کیونکہ فوج تو سردار کے لئے لڑتی ہے۔ جب سردار ہی نہ رہے تو فوج کس کے لئے لڑے۔ یہی اثر یزید کے مرنے کی اطلاع کا فوج یزید پر ہوا۔ حصین ابن نمیر مکہ سے پلٹ گیا۔

بعض اوقات فوج کی تعداد اور اسلحے کی مقدار سے بھی زیادہ اہمیت فوج کے مورال کی ہوتی ہے۔ مکہ سے دمشق واپس جانے والی یہ فوج یہ جنگ جیتی ہے نہ ہاری

ہے۔ اس فوج کے پاس کوئی جذبہ ہوگا بھی کہاں۔ جس کا مقصد کھو گیا ہو۔ یزید ہی نہ رہا۔ اب یزید کی فوج کس کے عزائم پورے کرنے کے لئے لڑے۔ اب یہ فوج نہیں رہی۔ مسلح لوگوں کا گروہ رہ گئی ہے۔ اس فوج کے پاس غذا کم رہ گئی ہے۔ کہیں سے غلہ خریدنا پڑے گا۔

رات کے اندھیرے میں ایک آواز آتی ہے۔ جیسے کوئی شخص اونٹ لئے جا رہا ہے۔ حصین ابن نمیر نے اونٹ والے کو آواز دی۔ اور پوچھا کہ ان اونٹوں پر کیا لدا ہوا ہے۔ جواب ملا کہ غلہ۔ حصین نے کہا میری فوج کو غلے کی ضرورت ہے۔ کیا تم بیچو گے۔ اونٹ والے نے جواب دیا "میں فقرائے مدینہ کے لئے یہ غلہ لے جا رہا تھا۔ اگر تمھیں ضرورت ہے تو تم لے لو۔ میں مفت دیتا ہوں"۔

حصین حیران ہے۔ وہ قیمت دینے کو تیار ہے مگر دوسرا مفت دے رہا ہے۔ حصین نے پوچھا۔ تم کون ہو۔ اونٹ والے نے کہا "علی ابن الحسینؑ"۔

اتنا تعارف کافی ہے۔ حصین ابن نمیر پہچان جاتا ہے کہ یہ امام زین العابدینؑ ہیں۔ پھر سوچتا ہے کہ شاید انھوں نے مجھے پہچانا نہیں۔ کیونکہ پہچانا ہوتا تو ایک ایسے دشمن کے لئے جس نے کربلا میں بوستان رسالت کو تباہ و برباد کرنے میں حصہ لیا ہو علی ابن الحسینؑ مفت نہ دیتے۔

اس نے غلے کی بوریاں اتروالیں۔ چلتے چلتے حصین ابن نمیر سے نہ رہا گیا۔ کہنے لگا "تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں"۔

امامؑ بولے "اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ تو حصین ابن نمیر ہے۔ تو نے ہی میرے بھائی علی اکبرؑ کو برچھی ماری تھی"۔

حصین ابن نمیر پر سکتہ طاری ہے۔

بھائی کے قاتل کے ساتھ پہچاننے پر بھی یہ سلوک؟

اب اسے کون سمجھائے کہ یہی اخلاقی برتری تو ہے جس نے اہل بیتؑ کو مرجع خلق بنا رکھا ہے۔ جس نے ان کے ذکر کو زندہ رکھا ہے۔ اور اس ذکر میں ایسی تازگی رکھی ہے کہ تیرہ صدیوں کے بعد بھی لوگوں کے آنسو رکنے میں نہیں آتے۔

بنی امیہ کے مقرر کئے ہوئے حاکم بھی انہی کے ہم مزاج ہوتے تھے۔ ظالم، جابر، سرکش، بے رحم، خوف خدا سے دور اور اہل بیتؑ نبوت کے دشمن۔ ہشام بن اسماعیل مخزومی مدینہ کا عامل تھا۔ اور ان ہی صفات کا حامل تھا۔ اس کی حکومت کا دور طویل تھا۔ اور اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے مدینے کے مجبور بیکس لوگوں کو جو اس کی رعایا تھے طویل تر معلوم ہوتا تھا۔ ظالم کی سرشت سے فائدہ تو صرف کسی کسی کو ہوتا ہے۔ خلق خدا تو اس سے نالاں ہی رہتی ہے کیونکہ اس کا جبر و جور عام ہوتا ہے۔ مدینے کے تمام شریف لوگ اس سے پریشان تھے۔ اور وہ عذاب الٰہی کی طرح لوگوں کی گردنوں پر مسلط تھا۔ عمر بن عبدالعزیز نے جو نسب کے اعتبار سے تو بنی امیہ ہی میں سے تھے لیکن سرشت کے لحاظ سے نیک اور خدا ترس تھے۔ مسند اقتدار سنبھالتے ہی اہل مدینہ کو ہشام کے شر سے نجات دلا دی۔ انھوں نے نہ صرف اسے معزول کر دیا بلکہ اس کا مال و اسباب ضبط کر کے اسے شہر کے سب سے بارونق بازار میں تماشہ عبرت بنا دیا۔ ہشام کو سر بازار ہتھکڑیاں بیڑیاں پہنا کر کھڑا کر دیا گیا اور مدینے میں عام اعلان کرا دیا گیا کہ ہشام نے جس کے ساتھ بھی ظلم کیا ہو وہ آئے اور بدلہ لے لے۔

کل تک جو شخص شہر کا حاکم تھا اور بڑی تمکنت کے ساتھ اقتدار پر بیٹھتا تھا۔ وہی آج بازار میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ لوگ جوق در جوق اس کا تماشا دیکھنے آ رہے تھے۔ چونکہ اپنے طویل دور حکومت میں اس نے خلق خدا کو آزار ہی پہنچائے تھے۔ دکھ ہی دئے تھے۔ لہذا اب کون اس پر افسوس کرتا۔ کوئی آکے اس پر لعنت کرتا۔

کوئی تھوکتا ۔ کوئی گالیاں دیتا۔ کوئی مارتا ۔ لوگ دیکھتے اور ہنستے ۔ اس بھرے پرے شہر میں جہاں کے سبھی لوگ اسے جانتے پہچانتے تھے ایک بھی ایسا نہ تھا جو اس سے ہمدردی کرتا ۔اور کوئی کرتا بھی کیوں۔ عمل مکافات بڑا بے رحم ہے۔ جو بوؤ گے سو کاٹو گے۔ ہشام بن اسماعیل مخزومی نے کس کے ساتھ شرافت برتی تھی ۔ کس کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔ کس کو سہارا دیا تھا۔ کس کی فریاد سنی تھی ۔ اس نے ظلم کیا تھا۔اور اب وہی عمل اس کے ساتھ دہرایاجا رہا تھا۔

اچانک ہشام کی نظر راستے پر پڑی ۔ ایک بڑا گروہ آ رہا تھا ۔ اور ہشام نے سوچا۔ یہ لوگ بھی تماشہ دیکھنے آ رہے ہوں گے۔ اور ان میں سے بھی کچھ لوگ یقیناً مجھے ماریں گے ۔ ذلیل کریں گے۔ برا بھلا کہیں گے۔ مجمع قریب آیا تو ہشام نے پہچان لیا۔ یہ بنی ہاشم تھے ۔ اب خوف کے مارے ہشام کا رنگ زرد پڑ گیا۔ بدن کانپنے لگا۔ ماتھے سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ قانون مکافات کا سب سے مشکل مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ ہشام نے سب سے زیادہ ظلم تو بنی ہاشم کے ساتھ ہی کیا تھا۔ اور اب ان کی باری آگئی تھی۔ وہ تو اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ڈر کے مارے ہشام نے آنکھیں بند کر لیں ۔ اور منتظر کھڑا رہا کہ اب انتقام کا کون سا طریقہ بنی ہاشم اختیار کرتے ہیں۔

" بھائی ۔ تم پر سلامتی ہو اور رحمت ہو "۔ ایک نرم آواز آئی۔

ہشام کو ایک جھٹکا سا لگا۔ جب پوری دنیا اس کے خلاف ہو رہی ہے۔ سب گالیاں دے رہے ہیں ۔ مار رہے ہیں ۔ جان کے دشمن ہو رہے ہیں ۔ ایسے میں یہ کون ہے جو مجھ کو سلام کر رہا ہے۔ گھبرا کے ہشام نے آنکھیں کھول دیں۔

سامنے امام زین العابدینؑ کھڑے تھے ۔ وہی جن کے ساتھ ہشام نے عرصے تک انتہائی ظالمانہ سلوک روا رکھا تھا۔ لیکن ان کے چہرے پر تو نرمی تھی۔ خوش خلقی تھی۔ انتقام کا جذبہ تو کیا یہاں تو عتاب کی جھلک تک نہ تھی۔

اب ہشام کی نظروں کے سامنے سے عہد رفتہ کے مناظر گزرنے لگے۔ میں نے اس طرح ستایا۔ یہ ظلم کیا۔ یوں تنگ کیا تھا۔ اس طرح ہراساں کیا پریشان کیا۔ اور اب جبکہ میں معتوب ہوں، معزول ہوں، بے اقتدار ہوں۔ مجھ سے معمولی لوگ تک اپنا بدلہ لے رہے ہیں یہ انسان کتنی عظیم الشان عفو و درگذر کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

ہشام چپ تھا۔ سوچ رہا تھا۔

پھر آواز آئی۔" سنو۔ اگر میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں، کسی کام آ سکتا ہوں تو ضرور بتاؤ۔ اور اگر تم سے یہ مواخذہ کسی رقم کے سلسلے میں ہے تو میں اس کا بھی انتظام کردوں گا۔ تم فکر مت کرو۔"

ہشام کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

یہ صبر کی شمشیر کا وار ہے۔ اس کا اثر جسم پر نہیں ہوتا۔ دل پر ہوتا ہے۔ اس سے تن بدن پر چوٹ نہیں آتی۔ ہاں ضمیر چیخ پڑتا ہے۔ اور وہ انسان بھی جس نے اپنی عمر مخالفت میں، عداوت میں گزاری ہو بیساختہ پکار اٹھتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم اولاد رسولؐ ہو۔ بہترین خلق ہو۔

بادشاہوں سے سلوک

بادشاہ طاقت کی علامت ہوتے ہیں۔ قوت کا نشان ہوتے ہیں۔ ان کے پاس ملک ہوتا ہے۔ اقتدار ہوتا ہے۔ خزانہ ہوتا ہے۔ فوج ہوتی ہے۔ اور جس کے پاس یہ سب کچھ ہو اسکا کہا ہوا لفظ قانون ہوتا ہے۔ اسکی مرضی قانون ہوتی ہے۔ وہ مطلق العنان ہوتا ہے۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اسے کوئی روکنے والا نہیں ہوتا۔ ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر وہ کسی سے ناراض ہو جائے تو قتل کروا سکتا ہے جائیداد اور مال و دولت چھین سکتا ہے ہر سزا دے سکتا ہے۔ اور کسی کی مجال نہیں ہوتی اس ملک کے حدود میں یہ کہنے کی کہ اے بادشاہ اسکا جرم چھوٹا تھا۔ سزا بہت بڑی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ حق بات کہنے کی جسارت کرنے والے کو اس سے بھی کڑی سزا ملے۔ اسکے زیر سایہ سب لوگ دائمی خوف کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بادشاہ کے ہاں اسکی مرضی ہی حکمرانی کا دستور ہوتی ہے۔ اسکا سلوک غیر مساوی اور اسکا رویہ غیر منصفانہ ہوتا ہے۔ یہ احساس کہ میں سب کچھ ہوں۔ میرا کوئی مقابل نہیں۔ اسے توازن سے محروم کر دیتا ہے۔ لطیفے پر اتنا مال دے دیتا ہے کہ سینکڑوں مزدور جتنے پیسے سارے دن سخت محنت اور مزدوری کر کے نہیں کما سکتے۔ اور ایک جملے پر آدمی کو زندگی سے محروم کر دیتا ہے۔

جہاں تک سلطنت کی حدود ہوتی ہیں وہاں تک سب بادشاہ سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ کسی میں ہمت نہیں ہوتی کہ اسکی مرضی کے خلاف ایک لفظ منھ سے نکال سکے۔ اور سچ تو کڑوا ہوتا ہے۔ حقیقت تلخ ہوتی ہے۔ جبھی تو سلطان جابر کے سامنے کلمہ

حق کہنا جہاد قرار دیا گیا ہے ۔ اور جو سلطان جابر کے سامنے کلمہ حق کہنے کیلئے کھڑا ہو جاتا ہے اسے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی منزل رسن و دار ہے ۔ اور دار کی منزل واقعی بہت کٹھن ہے ۔ اس راہ میں جو سر سے کفن باندھ لے وہ آئے ۔

اسی لئے سب لوگ بادشاہت کے آگے جھک جاتے ہیں ۔ عوام کا تو مذہب تک بدل جاتا ہے ۔ اور وہی ہو جاتا ہے جو بادشاہ کا مذہب ہوتا ہے ۔ جو مفتی ہوتے ہیں ۔ قاضی ہوتے ہیں ۔ شرع متین کے محافظ ہوتے ہیں ۔ دین و مذہب کے رکھوالے سمجھے جاتے ہیں وہ مذہب کا ظاہر بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور بادشاہ کے آگے جھکنا بھی چاہتے ہیں جسکی مذہب اجازت نہیں دیتا ۔ تو وہ آیتوں اور حدیثوں کے معانی اور مصداق بدل دیتے ہیں ۔ بادشاہ کو ظل اللہ یعنی زمین پر اللہ کے سائے کا خطاب دیتے ہیں اور کھینچ تان کر بادشاہ کیلئے سجدہ روا کر دیتے ہیں کہ وہ دراصل سجدہ تعظیمی ہے ۔ انہیں بھی پتہ ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ غلط ہے لیکن بادشاہ کے ہاتھ میں دو ہتھیار ہوتے ہیں ۔ خوف اور دادو دہش ۔ قتل بھی کرا سکتا ہے اور اتنا مال بھی دے سکتا ہے کہ پشتیں بیٹھ کر کھائیں ۔ جو لوگ تلوار سے قابو میں نہیں آتے زر کی تھیلی ان کی گردن جھکا دیتی ہے ۔ چنانچہ سلطنتوں حکومتوں اور ملوکیتوں کی تاریخ میں بہت کم ایسا منظر نظر آتا ہے کہ کوئی شخص بادشاہ سے اس لہجے میں بات کرے جیسے وہ بادشاہ کو کچھ نہیں سمجھتا ۔ ایسا وہی ہوتا ہے جو دنیا کو ٹھکرا چکا ہو ۔ اور اسکی لذتوں اور مصیبتوں سب ہی کو ہیچ سمجھتا ہو ۔ وہ شاہی کے مقابل اسلئے آتا ہے کہ اسے حق پر ناز ہوتا ہے ۔ اور اپنے اللہ پر پورا بھروسہ ہوتا ہے ۔ اور اللہ پر بھروسہ آدمی کو ہو ہی نہیں سکتا جب تک اہلبیت کے در سے وابستگی ہو ۔

جوشؔ ہم ادنیٰ غلامان علی مرتضیٰؑ

تمکنت سے پیش آتے ہیں جہاں بانی کی ساتھ

جہاں بانی سے ٹکرانے کیلئے اور شاہی کو ٹھکرانے کیلئے دل چاہیے۔ اور وہ بھی عام انسانوں کا دل کہاں۔ اس تہلکے کو چاہیے فوق البشر کا دل۔ یہ فوق البشر ہی کر سکتا ہے ایک عظیم انسان ہی کر سکتا ہے کہ طاقت کے آگے نہ جھکے۔ نہ تلوار کی تیزی اسے جھکا سکے نہ زروسیم کی چمک اسے خرید سکے۔ یہ وہی کر سکتا ہے جو اصلاً شجاع ہو اور شریف ہو۔ جو کمزوروں سے جھک کر ملے۔ چھوٹوں سے تواضع کے ساتھ پیش آئے۔ جو ہر ایک سے منکسر مزاجی کے ساتھ ملے۔ جو یہ کہے کہ دیکھو خبردار۔ اسکے ساتھ کبھی طاقت نہ دکھانا جس کا خدا کے سوا کوئی سہارا نہ ہو۔ جو غریبوں یتیموں ناداروں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہو۔ معذور فقیروں کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتا ہو۔ جو خدا کی خوشنودی کیلئے اپنے سے تمام چھوٹوں اور اپنے سے تمام کمزوروں کے ساتھ عاجزی کے ساتھ پیش آتا ہے اس کو خدا یہ جرأت دیتا ہے کہ وہ بادشاہوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکے کہ تو غلط کہتا ہے۔

سید سجادؑ نے تمام زندگی یہی کیا۔ یزید سے ولید تک شام کے تمام بادشاہ اور مدینے کے تمام والی اسی حسرت میں مر گئے کہ کبھی زین العابدینؑ پر ہم اپنی مرضی مسلط کر سکیں۔ اپنی غلط بات کو ان کے منھ سے صحیح کہلوا لیں۔ اپنی غلط بات کی ان سے تائید کرا لیں۔ اور یہ بھی نہیں تو کم از کم وہ ہماری غلط بات پر ہم کو ٹوکیں نہیں۔ لیکن یہی بات ممکن نہیں تھی۔ حجاج بن یوسف جیسے خون آشام اور ظالم ترین شخص نے عبدالملک کو لکھا تھا کہ جب تک علی ابن الحسینؑ زندہ ہیں تو اپنی من مانی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ لوگ

سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں۔

ابن زیاد کے دربار میں علی ابن الحسینؑ یہ تلواروں سے زیادہ تیز جملہ کہتے نظر آتے ہیں کہ "اے ابن زیاد۔ کیا تو مجھے قتل سے ڈراتا ہے۔ تجھے معلوم ہونا چاہیے

کہ قتل ہونا ہماری عادت ہے اور شہادت ہمارا شرف ہے"۔

شام کے دربار میں جب یزید نے کہا " اس خدا کا شکر جس نے تمہارے باپ کو قتل کیا۔" تو امام زین العابدینؑ نے برجستہ کہا۔" خدا کی لعنت اس شخص پر جس نے میرے باپ کو قتل کیا"۔ اس شخص کے سامنے جسکے حکم سے امامؑ کا کنبہ کا کنبہ قتل کر دیا گیا تھا یہ جملہ کتنا طاقت دنیاوی کو شدید ذلت و حقارت سے دوچار کرنے کے برابر تھا کہ تیرے پاس لاکھ دنیاوی وسائل ہوں لیکن پوری دولت پوری طاقت پوری فوج پورا خزانہ تیرے سارے عمال مل کر بھی ناحق کو حق میں نہیں بدل سکتے۔ اور ہمارے موقف کو غلط ثابت نہیں کر سکتے۔ اور جب یزید نے قتل حسینؑ کو جائز ثابت کرنے کیلئے کہا۔" تمہارے باپ نے میری سلطنت میں جھگڑا ڈالا۔ مجھ سے قطع رحمی کی اور میرا حق نہ مانا تو جو خدا نے کیا وہ تم نے دیکھ لیا۔"

حسینؑ جب یزید سے لڑ رہے تھے تو ان کا موقف یہ تھا کہ یزید ان کے جد کے دین میں خرابی پیدا کر رہا ہے۔ اور یزید جب حسینؑ سے لڑتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حسینؑ نے اس کی حکومت میں جھگڑا ڈالا۔

ایمان والے جب کسی سے محبت کرتے ہیں تو خدا کی وجہ سے۔ اور جب کسی گروہ سے لڑتے ہیں تو خدا کی وجہ سے۔ اسلئے کہ انکی اصل محبت خدا سے ہے۔ دنیا والوں کی اصل محبت دنیا سے ہے۔ جو ان کی دنیا حاصل کرنے کی ہوس کے راستے میں رکاوٹ بنے اسی کے خلاف ہو جاتے ہیں۔

امامؑ نے یزید کے جواب میں کہا۔

"او یزید۔ خدا سے ڈر۔ یہ کام خدا نے نہیں کیا۔ بلکہ تیری فوج نے کیا ہے۔ قتل حسینؑ کا ذمہ دار تو ہے۔ میرے باپ نے ہرگز کوئی فتنہ برپا نہیں کیا تھا۔ میرے باپ نے کسی کے حقوق کو ضبط نہیں کیا"۔

امامؑ نے اسے یہ بھی یاد دلایا کہ دنیا ہمیشہ کی نہیں ہے۔ موت آخر آنی ہے۔ روز جزا و سزا آنا ہے۔ میدان حشر میں گناہوں اور نیک کاموں کا حساب کتاب ہونا ہے۔ آپ نے کہا۔

"او یزید۔ تو اس ذلت کیلئے تیار ہو جا جو قیامت کے دن تجھے ہونے والی ہے"۔

دنیا کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتی۔ سو دنیا نے یزید کے ساتھ بھی وفا نہ کی۔ اور ذات الجنب کے مرض میں وہ ہلاک ہوا۔ اسکی حکومت کے چار سال بھی پورے نہ ہوئے۔ لیکن اتنے کم عرصے میں بھی اس نے کتنے گناہ کمائے۔ قتل حسینؑ۔ مکے اور مدینے کی تباہی۔ اور مکے اور مدینے میں رہنے والے لوگوں کا بے دریغ قتل اور عورتوں کی بے عزتی۔

یزید کے بعد اسکے بیٹے معاویہ کو تخت ملا۔ لیکن اس نے قبول نہ کیا۔ مروان بن حکم بادشاہ بن گیا۔ اس نے بھی بہت تھوڑے عرصے حکومت کا ذائقہ چکھا۔ صرف ایک سال۔ پھر حکومت عبدالملک کو ملی۔ جس سے امامؑ کا کئی بار سامنا ہوا۔

ایک بار حج کا زمانہ تھا عبدالملک بھی حج کیلئے آیا ہوا تھا۔ طواف کرنے میں عبدالملک نے دیکھا کہ امام زین العابدینؑ بھی مصروف طواف ہیں۔ یہ خدا کا گھر تھا اور خدا کی بادشاہت کائنات پر محیط ہے۔ لیکن تنگ ظرف بادشاہوں کا کیا کیا جائے کہ وہ خدا کے گھر میں بھی اپنے ہی کو بادشاہ سمجھتے رہتے ہیں۔طواف سے فارغ ہو کر عبدالملک ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اور اس انتظار میں رہا کہ آخر میں بادشاہ ہوں۔ زین العابدینؑ طواف سے فرصت پائیں گے تو ضرور مجھ سے ملنے آئیں گے۔ لیکن زین العابدینؑ تو سب سے بڑے بادشاہ کے حضور میں تھے۔ اس دربار میں تھے جسکی شوکت کے آگے کرہ ارض کی کوئی حیثیت نہیں۔ جہاں دنیا کی بادشاہت کا اثرو رسوخ

حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے ۔ اب عبدالملک کو خفت سی محسوس ہوئی کہ میں بادشاہ ہو کر ان کا انتظار کر رہا ہوں اور وہ رعایا ہو کر نہیں آ رہے ۔ ناچار بادشاہ نے بلوا لیا ۔ امامؑ تشریف لائے ۔ اب بادشاہ کا غصہ عروج پر تھا ۔ اور بادشاہ کے غصے کا عروج یہی ہوتا ہے کہ قتل کی دھمکی دیتا ہے ۔ اس نے امامؑ سے کہا ۔

تمہارے باپ کو میں نے قتل نہیں کیا تھا ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم مجھ سے ملنے نہیں آئے ۔ اگر میں تم کو قتل کرا دوں تو ۔

امامؑ نے باطمینان کہا ۔ سن ، یزید نے میرے باپ کی دنیا برباد کی ۔ میرے باپ نے یزید کی عقبیٰ برباد کر دی ۔ اگر تجھے بھی یہ بات پسند ہے تو تو بھی شوق سے کر گزر ۔ یہ اسی جملے کی بازگشت ہے جو ابن زیاد کے دربار میں کہا تھا ۔

تو مجھے قتل سے ڈراتا ہے ۔ قتل ہونا ہماری عادت ہے ۔ اور شہادت ہمارے لئے شرف ہے ۔

جب بادشاہ نے دیکھا کہ میری دھمکی کو انہوں نے کوئی اہمیت نہیں دی تو اس نے دوسرا ہتھیار استعمال کرنا چاہا ۔ زر کی تھیلی ۔ کہنے لگا ۔

نہیں نہیں ..... میرا مطلب یہ تھا کہ تم کو ہم سے ملتے رہنا چاہیے ۔ کوئی حاجت ہو تو کہو ہم پوری کرینگے ۔

امام نے جواب دیا

یہ خدا کا گھر ہے ۔ کائنات کے رب کا گھر ہے ۔ ساری دنیا کو پالنے والے کا گھر ہے ۔ یہاں خدا کے علاوہ کسی سے سوال نہیں کیا جا سکتا ۔

امامؑ کے سکون قلب نے شاہی کے دونوں ہتھیار کند کر دیئے اور پھر امامؑ وہاں سے اٹھ کے واپس اپنی عبادتوں میں مصروف ہو گئے ۔

ایک بار عبدالملک کو خیال آیا کہ امام زین العابدینؑ کے پاس رسول اللہؐ کی تلوار ہے۔ اس نے خط لکھا کہ تلوار ہمیں بھیج دو۔ نہیں تو ہم تمہارا وظیفہ بند کر دیں گے۔ ایک امامؑ کے پائے ثبات پر بھلا اس کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ امامؑ نے جواب میں لکھا۔ اللہ نے ہر بندے کا رزق مقرر کیا ہے۔ وہاں سے جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہو۔ اور اللہ کسی ناشکرے، خیانت کار کو دوست نہیں رکھتا۔ اور یہ دیکھ لے کہ اس آیت کے تحت ناشکرا خیانت کار کون ہے۔ عبدالملک چپ ہو کر بیٹھ رہا۔

ایک بار امام زین العابدینؑ کو حجاج بن یوسف کی طرف سے خط ملا جس میں قتل کی دھمکی تھی۔ امامؑ نے اس کے جواب میں لکھا۔ خدا کے پاس لوح محفوظ ہے۔ خدا ہر دن میں تین سو بار اسکا ملاحظہ کرتا ہے۔ اور ہر بار اس پر کچھ لکھا جاتا ہے اور کچھ مٹایا جاتا ہے۔ تیرے شر کو رفع کرنے کیلئے اس لوح محفوظ کا صرف ایک معائنہ کافی ہے۔

ہوا یہ تھا کہ روم کے بادشاہ نے عبدالملک کو ایک دھمکی آمیز خط لکھا تھا کہ میں اپنی لاکھوں کی فوج لیکر تمہاری طرف آ رہا ہوں اور تجھے قتل کر دونگا۔ عبدالملک کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اس خط میں کیا جواب دے۔ اس نے حجاج کو لکھ بھیجا کہ امام کو ایک دھمکی آمیز خط لکھ۔ اور وہ اسکا جو جواب دے وہ مجھے بھیج دے۔ چنانچہ بعینہ یہی جواب عبدالملک نے بادشاہ روم کو بھجوا دیا جس پر بادشاہ روم اپنے حملے کے ارادے سے باز آ گیا۔

ایک بار عبدالملک کو پتہ چلا کہ امام زین العابدینؑ نے اپنی ایک کنیز آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا ہے۔ عبدالملک کو دین کا تو پتہ تھا نہیں کہ یہ دراصل حکم رسولؐ ہے۔ اور اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ انسانی مساوات فروغ پائے۔ وہ تو عرب کے رسم و رواج کے مطابق اسے ایک قابل اعتراض چیز سمجھا کہ شادی اعلیٰ خاندان کی

عورت سے کرتے کنیز سے کیوں کر لی۔

امامؑ نے اس کے خط کے جواب میں لکھا۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ تمہارا خط ملا۔ تم نے ایک کنیز سے نکاح کر لینے پر مجھے برا بھلا کہا ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ مجھے شادی کیلئے قریش سے کوئی لڑکی منتخب کرنی چاہیے تھی تاکہ پیدا ہونے والی اولاد کو خاندانی عزت نصیب ہوتی۔ یاد رکھو۔ کوئی شخص عزت و شرف میں رسول اللہؐ سے بڑھکر نہیں ہو سکتا۔ باندی میری ملک تھی۔ جسکو میں نے خدا کی خوشنودی اور ثواب حاصل کرنے کیلئے آزاد کیا۔ اور اسی کے حکم کے مطابق نکاح کیا۔ خدا کے دین میں انسان کے شرف کے بارے میں یہ باتیں قطع اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اللہ نے خاندانی پستی کو ختم کرتے ہوئے تنقیص و ملامت کی تمام شکلوں کو غلط قرار دیا ہے۔ لہذا کسی مسلمان کو ملامت نہیں کرنی چاہیے۔ ملامت کے قابل تو جاہلیت کے پرانے دستور ہیں۔

امامؑ نے نہ صرف اپنے کردار پر کئے گئے اعتراض کو خدا و رسولؐ کے احکام کی روشنی میں غلط ثابت کیا بلکہ بادشاہ نے جس انداز کا اعتراض کیا تھا اسکے بارے میں یہ بھی بتایا کہ یہ جہالت کا دستور ہے اور قابل ملامت ہے۔

یہ ہے مدلل مضبوط مستحکم اور ناقابل شکست جواب۔

غلاموں کو آزاد کرنے والا

آج کے دانشور بڑے زور و شور سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے دنیا بھر میں غلامی کی زنجیریں توڑ دی ہیں۔ اور اس طرح انسانی مساوات کا پرچم بلند کر دیا ہے۔ یہ بات صرف اس حد تک سچ ہے کہ آج کی دنیا میں بھیڑ بکریوں کی طرح انسانوں کی خرید و فروخت نہیں ہوتی۔ لیکن کیا دل پر ہاتھ رکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ واقعی انسانوں کو غلام بنانے کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ جب تک دنیا امیر اور غریب طاقتور اور کمزور، حاکم اور محکوم کے طبقوں میں بٹی ہوئی ہے اس وقت تک انسانی آزادی صرف ایک خواب ہے۔ انسان آزاد پیدا تو ہوا ہے لیکن ہر جگہ زنجیروں میں قید ہے۔ یہ زنجیریں لوہے کی نہ سہی۔ لفظوں کی سہی۔ رواجوں کی سہی۔ روایتوں کی سہی۔ قانون کی سہی۔ جس معاشرے میں بھی استحصال ہے، ظلم ہے، جبر ہے، زبردستی ہے۔ اظہار اور گفتار پر پابندی ہے۔ غریب اور امیر کیلئے الگ الگ معیار ہیں، وہاں سچ پوچھئے تو انسانی آزادی کہاں۔ اور یہ صورت حال ہر ملک میں ہے۔ ہر علاقے میں ہے۔

اب ذرا اس زمانے کا تصور کیجئے جب زنجیروں سے باندھ کر مردوں اور عورتوں کو بازار میں کھڑا کر دیا جاتا تھا اور انکی بولی لگائی جاتی تھی۔ جو انسان سونے چاندی کے سکے دے سکتا تھا وہ جیتے جاگتے آدمی کی جان کا مالک بن سکتا تھا۔ اور جب وہ پیسے خرچ کر کے یہ برتری حاصل کر ہی لیتا تھا تو پھر اپنی ملکیت سے نرمی کا سلوک کیوں کرتا۔ جس طرح جانوروں کو انکی مرضی کے خلاف ہل میں جوتا اور گاڑیوں میں باندھا جاتا ہے، معمولی خوراک دے کر سخت سے سخت محنت لی جاتی ہے اور ناراض ہونے پر مارا پیٹا بھی جاتا ہے۔ یہی سلوک ان بدنصیب انسانوں کے ساتھ بھی ہوتا تھا جو غلام کہلاتے تھے۔ اور یہ سلوک بہت عام تھا۔ ہر مالک اپنے غلام کے ساتھ یہی

سلوک کرتا تھا۔ اور کبھی یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا تھا کہ یہ سلوک کس حد تک جائز ہے۔

لیکن تاریخ میں کچھ لوگ ایسے بھی گزرے ہیں جن کی عظمت کردار کی روشنی سے انسانیت کا محل جگمگا رہا ہے۔ جو نازش تاریخ ہیں۔ یہ وہی تھے جن کا دل پوری انسانیت کیلئے دھڑکتا تھا۔ جو غریبوں کی امید تھے۔ بیکسوں کا سہارا تھے۔ یتیموں کیلئے سایہ شفقت تھے۔ مسکینوں کے حاجت روا تھے۔ خلق کے مشکل کشا تھے۔ مصیبت میں سب کے کام آنے والے تھے۔ ہر ایک کا دکھ درد بٹانے والے تھے۔ ضعیف جن پر تکیہ کرتے تھے۔ غلام جن کا دم بھرتے تھے۔

جو صاحب خلق عظیم تھا، تمام انسانوں کیلئے مشعل ہدایت تھا اور پوری کائنات کیلئے رحمت تھا اس نے انسانوں کے اس طبقے کی دستگیری کی جسے لوگوں کی بدسلوکی نے کچل ڈالا تھا۔ اس کے معجز نما ہاتھ نے ان کے مقدر کو تحت الثریٰ سے نکال کر آسمانوں کی بلندیوں پر ستاروں کی طرح جگمگا دیا۔ سرور کائنات غلام کو اپنے ساتھ سواری پر بٹھا لیتے تھے۔ جو خود کھاتے اور پہنتے وہی اپنے غلاموں اور کنیزوں کو کھلاتے اور پہناتے۔ کوئی غلام کسی کام سے آپ کے پاس آتا تو فوراً اسکی ضرورت پوری کرنے کو اٹھ کھڑے ہوتے۔ غلاموں کی دعوت قبول کرتے۔ کبھی خادم تھک جاتا تو اسکے ساتھ آٹا بھی پیستے۔ ہمیشہ مسکرا کر بات کرتے۔ انکی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں سے مقدم سمجھتے۔ آپ کا جو سلوک غلاموں سے تھا وہ سلوک لوگ اپنے رشتے داروں سے بھی نہیں کر پاتے۔

جناب امیرؑ نے اپنے مال سے ایک ہزار غلام اور کنیزیں رضائے الٰہی کیلئے آزاد کیں۔ یہ وہ مال تھا جو آپ نے اپنے ہاتھ کی محنت اور ماتھے کے پسینے سے کمایا تھا۔ ایک بار دو لباس خریدے۔ بہتر لباس اپنے غلام قنبر کو دیا۔ کم قیمت اپنے لئے رکھا۔ قنبر

نے وجہ پوچھی تو کہا میں بوڑھا ہوں۔ تم جوان ہو۔ جناب فاطمہؑ ایک دن گھر کا سارا کام خود کرتیں اور ایک دن کنیز کو کرنے دیتیں۔ امام حسینؑ کو کسی کنیز نے تحفتاً پھولوں کا ایک گل دستہ پیش کیا۔ آپ نے اسے آزاد کر دیا۔ لوگوں نے جب حیران ہو کر کہا کہ اتنے سے تحفے کے بدلے آزاد کر دیا تو آپ نے کہا "اس نے مجھے تحفہ پیش کیا۔ اور آدمی کو جواب میں بہتر تحفہ دینا چاہیے۔ اور آزادی سے بہتر تحفہ کیا ہو سکتا ہے۔

اخلاقی فضائل و کمالات کا یہ ورثہ تھا جو اس خاندان کے بزرگوں سے امام زین العابدینؑ کو ملا تھا۔ آپ نے اس روایت کو اس حد تک آگے بڑھایا کہ آپ کا لقب ہی محرر العبید پڑ گیا۔ یعنی غلاموں کا آزاد کرنے والا۔ امام زین العابدینؑ نے ایک لاکھ سے زیادہ غلام آزاد کئے۔ اور وہ بھی اس شان کریمی کے ساتھ کہ صاحب خلق عظیم کو بھی بیساختہ پیار آ جائے۔

ایک غلام کو امام زین العابدینؑ نے ایک خاص قطعہ زمین کی کاشت کا کام سونپا۔ کچھ عرصے بعد ایک بار آپ نے جا کر دیکھا تو وہ قطعہ زمین ویران پڑا تھا۔ آپ کے ہاتھ میں کوڑا تھا۔ آپ نے غلام کو ایک کوڑا مارا اور وہاں سے واپس چلے آئے۔ گھر پہنچ کر اس غلام کو پھر بلوایا۔ غلام نے چونکہ ایک پوری فصل کا نقصان کیا تھا اسلئے اسے اندازہ تھا اسے اور سزا ملنی چاہیے۔ ڈرتا ڈرتا آیا۔ امام زین العابدینؑ نے کوڑا غلام کے ہاتھ میں دیا اور اپنے جسم پر سے عبا ہٹا کر کہا کہ اپنا بدلہ لے لے۔ غلام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شرم سے سر جھکا لیا۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ جب آپ نے یہ دیکھا کہ غلام بدلہ لینے پر آمادہ نہیں ہے تو وہ قطعہ زمین اسی کو بخش دیا۔

ایک مرتبہ ایک کنیز آپ کے جسم پر پانی ڈال رہی تھی۔ اتفاقاً لوٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور امامؑ کی پیشانی پر لگا۔ جس سے سخت چوٹ آئی۔ آپ نے نظر

اٹھا کر کنیز کو دیکھا۔ غلاموں اور کنیزوں کی زندگی میں یہ لمحہ بڑا سخت ہوتا تھا جب ان سے کوئی اتنا سخت قسم کا نقصان ہو جائے جس سے مالک اشتعال میں آ جائے۔ غلام سراپا معذرت بن جاتے تھے انتہائی عاجزی کے الفاظ استعمال کرتے پھر بھی غصے کے شعلے ٹھنڈے نہیں ہو پاتے تھے۔ سزا ملتی تھی اور سخت سزا ملتی تھی۔ لیکن یہ کنیز خاندان رسول کی مزاج داں ہے۔ معافی نہیں مانگتی۔ معذرت نہیں کرتی بلکہ قرآن کی آیات پڑھتی ہے۔ الکاظمین الغیظ (جو غصہ ضبط کرتے ہیں) امام کہتے ہیں "میں نے غصہ ضبط کیا"۔ وہ آگے آیت پڑھتی ہے والعافین عن الناس (اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں) آپ نے فرمایا۔ میں نے تجھے معاف کیا۔ پھر وہ آیت ختم کرتی ہے واللہ یحب المحسنین (اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)۔ امام فرماتے ہیں جا میں نے تجھے آزاد کیا۔ قرآن کریم کی ہدایتوں پر اس طرح قدم بقدم عمل کی مثال اس خاندان کی علاوہ کہاں مل سکتی ہے۔

ایک بار دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ سخی کا دسترخوان بھی سخی کے دل کی طرح بڑا ہوتا ہے۔ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ عمدہ کھانوں سے تواضع ہو رہی تھی۔ ایک کنیز سے سالن کی قاب چھوٹ کر گر پڑی اور ٹوٹ گئی۔ گرم سالن کے چھینٹے اڑے۔ امام دسترخوان پر تشریف رکھتے تھے۔ کنیز کی طرف دیکھا۔ کنیز کانپنے لگی۔ شرم سے سر جھکا لیا۔ رحم دل امام سے کنیز کی بے چارگی کا یہ عالم نہ دیکھا گیا۔ فرمایا۔ پریشان نہ ہو۔ میں نے تجھے آزاد کیا۔

ایک بار آپ نے کسی کام سے ایک غلام کو آواز دی۔ وہ نہ آیا۔ پھر آواز دی۔ اس پر بھی نہ آیا۔ تو تیسری بار آواز دی۔ اب کے غلام حاضر ہوا۔ امام نے پوچھا تو نے میری پہلی اور دوسری آواز سنی تھی۔ وہ بولا ہاں۔ آپ نے کہا پھر تو نے جواب کیوں نہ دیا۔ غلام نے کہا مجھے آپ کے غصے سے کوئی اندیشہ نہ تھا۔ ایک غلام کا مالک

کی آواز دو دفعہ سننے کے بعد بھی نہ آنا اور پھر تیسری آواز پر یہ جواب دینا کہ مجھے آپ کی طرف سے کوئی خوف نہیں تھا۔ ان باتوں کا عام طور پر کیا رد عمل ہو سکتا تھا۔ ڈانٹ پھٹکار مار پیٹ اور سزا۔ لیکن امام کا رد عمل اس سے کتنا مختلف تھا۔ آپ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ غلام کو مجھ سے کوئی خوف نہیں ہے۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کسی سزا کا اندیشہ نہیں ہے۔ اس موقع پر خدا کا شکر وہی کر سکتا ہے جو ایک لمحہ کیلئے بھی اس بات سے غافل نہ ہوتا ہو کہ خداوند جبار و قہار کے آگے اسکی حیثیت بھی ایک معمولی غلام کی سی ہے۔

غلاموں کے حسن سلوک کے سلسلے میں ایک واقعہ تو ایسا ہے کہ جس پر آج تک عقل انسانی حیرت کی انگلی دانتوں میں دابے ہوئے ہے۔ امام کے دسترخوان پر بہت سے مہمان تھے۔ غلام کھانے پینے کے انتظامات کو آخری شکل دے رہے تھے۔ ایک غلام نے ایک برتن تنور سے نکالا جس میں پکا ہوا گوشت تھا۔ برتن بہت گرم تھا۔ اچانک برتن غلام کے ہاتھ سے گر پڑا۔ امام زین العابدینؑ کا چھوٹا بچہ وہاں موجود تھا برتن اس بچے کے سر پر گرا۔ اس سے بچے کے سر پر اتنی سخت چوٹ لگی کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ کسی بھی آدمی کا چھوٹا سا معصوم بچہ مرتا ہے تو اسے ایسا لگتا ہے جیسے اسکے کلیجے کو کسی نے کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ اگر بچے کی موت اچانک ہو اور اس کا سبب کسی دوسرے انسان کی غلطی ہو تو آدمی کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اور آدمی کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک کہ وہ کسی قسم کا بدلہ نہیں لے لیتا یا سزا نہیں دے لیتا۔ پھر وہ بھی خاص طور سے ایسے آدمی کی غلطی ہو جو غلام تھا۔ جس کی زندگی خریدی ہوئی تھی۔ جو اپنی ہی ملکیت تھا۔ جسکے قتل پر کوئی دوسرا شخص خون بہا کا دعوی بھی نہیں کر سکتا۔ اس صورت میں اگر کوئی اور شخص ہوتا تو وہ یقینا اس غلام کو سخت اشتعال کے عالم میں قتل کر دیتا۔ لیکن علی ابن الحسینؑ نے صبر و ضبط اور عفو و درگزر کا جو عظیم مظاہرہ کیا اسکے لیے فوق البشر کا دل چاہیے۔ اخلاق کی معراج پر

فائز ہوئے بغیر آدمی اس صورت حال میں یہ جملے ادا نہیں کر سکتا۔ آپ نے غلام سے کہا یہ تم نے دانستہ نہیں کیا۔ تم قصور وار نہیں ہو۔ جاؤ بچے کے دفن کا انتظام کرو۔ اور اس واقعے سے تمہیں جو پریشانی ہوئی اسکے عوض میں تمہیں آزاد کرتا ہوں۔

رمضان کو خداوند عالم نے اپنا مہینہ قرار دیا ہے۔ سارے مسلمان اس مہینے میں کوشش کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ نیک کام کریں۔ اور خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ جلالت میں اچھے اعمال پیش کریں۔ اب علی ابن الحسینؑ کا انداز ملاحظہ ہو۔

عام دنوں میں جس شخصیت کے سجدوں کے تواتر و تسلسل نے اسکے اعضائے سجود پر ایسے گٹے ڈال دیے ہوں جنہیں ہر چھ ماہ بعد تراشنا پڑتا ہو وہ اس ماہ مبارک میں جسے خدا نے اپنے لئے منتخب کیا ہو کس قدر تسبیح و تہلیل و تکبیر و تمجید و تقدیس کرتا ہو گا۔ اس کا اندازہ ہر شخص کی عقل سلیم کر سکتی ہے۔ اسکے علاوہ ہر رمضان میں امام زین العابدینؑ سے ایک اور عمل بھی مخصوص تھا۔ امام زین العابدینؑ اس ماہ مبارک کے آغاز سے لیکر عید کا چاند نظر آنے تک اپنے غلاموں کے اعمال کی نگرانی کرتے اور ان سے جو بھی قصور ہوتے غلطیاں ہوتیں وہ لکھتے جاتے۔ پورے مہینے نہ کسی غلام کو تہدید کرتے نہ سرزنش نہ کبھی ڈانٹتے نہ ملامت کرتے۔ مارنے پیٹنے یا سزا دینے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ جب عید کا چاند افق پر نمودار ہوتا تو آپ اپنے تمام غلاموں کو ایک جگہ جمع کرتے۔ پھر ہر غلام کو وہ تمام خطائیں یاد دلاتے جو اس سے اس مہینے میں سرزد ہوئی تھیں۔ اور پوچھتے کہ یہ تقصیریں تم نے کی تھیں۔ جب سارے غلام اپنی کوتاہیوں کا اقرار کر لیتے تو آپ ان سے فرماتے دیکھو۔ جس طرح تم میرے غلام ہو اسی طرح میں بھی خدائے بزرگ و برتر کا غلام ہوں۔ میں نے تم سب کی تمام خطائیں معاف کر دیں۔ اب تم سب مل کر خدا سے دعا کرو کہ وہ بھی میرے تمام گناہ معاف کر دے۔ تمام غلام دعا مانگتے۔ اور آپ ان تمام غلاموں کو آزاد

کر دیتے۔

حضرت علیؑ نے کہا تھا۔ غلام کو سوتے سے مت جگاؤ۔ کیا خبر وہ اپنی آزادی کا خواب دیکھ رہا ہو۔ اور واقعی ایک غلام کیلئے آزادی خواب ہی ہوتی ہے۔ سہانا خواب جسکی تعبیر اسکے ہاتھ میں نہیں ہوتی۔ ایک غلام کیلئے اس سے بہتر تحفہ کیا ہو سکتا ہے کہ اسے آزادی کی نوید سنا دی جائے۔ جو دراصل نئی زندگی کی نوید ہوتی ہے۔

فصاحت و بلاغت

قرینہ، طریقہ، سلیقہ، ترتیب، اہتمام اور تناسب ہر چیز میں حسن پیدا کر دیتا ہے ۔ بولتے سب ہیں ۔ گفتگو سب کرتے ہیں ۔ اپنے خیالات کو دوسروں تک سب پہنچاتے ہیں ۔ اور اپنے جذبات و احساسات کا اظہار سب کرتے ہیں ۔ لیکن جن کے کلام میں فصاحت و بلاغت ہوتی ہے وہ اسی طرح نمایاں اور ممتاز نظر آتے ہیں جیسے عام لوگوں کے مجمع میں اہل حسن و جمال یا صاحبان فضل و کمال ۔

قدرت الٰہیہ نے انسانوں کی امامت کیلئے جن کو بھیجا انہیں ہر صفت میں کامل کر کے بھیجا۔ کیونکہ امام یا ہادی یا رہنما کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہر طرح ہر صورت میں اور ہر لحاظ سے افضل ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ امام کے کلام میں فصاحت و بلاغت بھی اسی طرح رچی بسی ہوتی ہے جیسے موعظت اور حکمت ۔ کسی کو راہ راست پر لانے کیلئے لازمی ہے کہ کلام پر اثر ہو ۔ اس میں جذب کی ایک کیفیت ہو ۔ وہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچے ۔ جبھی تو کہا گیا کہ شاعری جزویست از پیغمبری ۔ شاعری پیغمبری کا حصہ ہے ۔ یہاں اگر شاعری سے مراد صرف حسن کلام جمال سخن اور فصاحت و بلاغت ہے تو واقعی شاعری وہ اسلحہ ہے جس سے پیغمبر دلوں کو فتح کرتے ہیں ۔ ذہنوں کو تسخیر کرتے ہیں ۔

قرآن نے کہا لوگوں سے اچھی بات کرو ۔ یہ اختصار اور ایجاز قرآن کا معجزہ ہے کہ اس ایک مختصر سے جملے میں وہ ساری باتیں سمو دیں جو لوگ گفتگو کے فن پر لکھی ہوئی ضخیم کتابوں میں جمع نہ کر سکے ۔

جب کوئی شخص کسی سے گفتگو کرنا ہے تو اسکی گفتگو کا کوئی مقصد ہوتا ہے ۔

پھر کچھ خیالات ہوتے ہیں جنہیں وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ ان خیالات کو الفاظ کا پیرہن دیا جاتا ہے۔ الفاظ کسی انداز سے ادا کیے جاتے ہیں۔ اور ادا کرنے والے کا لہجہ ان الفاظ کے معانی متعین کرتا ہے۔ جب قرآن یہ کہے کہ کلام میں اچھائی ہونی چاہیے تو یہ ہدایت گفتگو کے تمام اجزا پر محیط ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ جب گفتگو کرو تو ہمیشہ مقصد نیکی ہو۔ الفاظ نرم ہوں۔ خیالات اعلیٰ ہوں۔ انداز محبت کا ہو۔ لہجہ شفقت کا ہو۔ اور جب سب کے لیے یہ ہدایت ہو کہ اچھی طرح گفتگو کرو تو پھر امام کیلئے یہ ضروری ہو گا کہ جب وہ گفتگو کرے تو سب سے زیادہ اچھے انداز سے گفتگو کرے۔ امامؑ تمام لوگوں سے جتنا زیادہ افضل ہے اتنا ہی اسکا کلام لوگوں کے کلام سے زیادہ فصیح و بلیغ ہو۔

امامؑ جب گفتگو کرے تو اسکا مقصد لوگوں کو نیکی کی طرف بلانا ہو۔ برائیوں سے روکنا ہو۔ سچائیوں کو نشر کرنا ہو۔ حق کا اعلان کرنا ہو۔ صداقت کا اظہار کرنا ہو۔ اسکے خیالات تقویٰ سکھائیں۔ حکمت پھیلائیں۔ اسکی گفتگو لوگوں میں جذبہ عمل پیدا کرے۔ جو لوگ اسکی گفتگو سنیں ان کے ذہن میں گفتگو محفوظ ہو جائے۔ الفاظ اسکے مقصد سے ہم آہنگ ہوں۔ جب وہ خدا سے ڈرائے تو ایسے لفظ ہوں کہ لوگوں کے دل لرز جائیں۔ جب وہ جنت کی بشارت دے تو ایسے لفظ ہوں کہ ریاض جناں نظروں کے سامنے جلوہ آرا ہو جائیں۔ جب نیکی کی طرف بلائے تو لفظوں میں جذب کی کیفیت ہو۔

جب برائیوں سے روکے تو لفظوں میں تاثر کی وہ کیفیت ہو کہ آدمی زندگی بھر اس برائی کی طرف نہ بڑھے۔ الفاظ کم ہوں۔ معنی زیادہ ہوں۔ اثر اس سے بھی زیادہ ہو۔ گفتگو مختصر ہو۔ لیکن جامع ہو۔ مبہم نہ ہو۔ واضح ہو۔ لفظ آسان ہوں۔ بات فوراً سمجھ میں آ جائے۔ اور نہ صرف سمجھ میں آئے بلکہ دل نشین ہو جائے۔ عقیدہ بن

جائے ۔ عمل میں ڈھل جائے ۔ جب لوگوں کو یہ احساس دلائے کہ ان سے غلطی ہوئی ہے تو مجمع کا یہ حال ہو کہ ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگے ۔ جب سلطان جابر کے سامنے کھڑا ہو اور سلطان جابر اپنے برے فعل پر خوش ہو اور فخر کرے تو ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود اس سے کہہ سکے کہ جس نے میرے باپ کو قتل کیا اس پر لعنت ۔ اور جب سلطان جابر اس قتل کا ذمہ دار خدا کو ٹھہرانے لگے تو شیر نر کی صورت گرج کر کہہ سکے کہ میرے باپ کو خدا نے نہیں او یزید تو نے قتل کیا ۔ اور اس فصاحت و بلاغت کی پشت پر اسے سہارا دینے کیلئے دلیلیں بھی ہوں ۔ وہ دلیلیں محکم بھی ہوں ۔ اور قرآن سے اخذ کی ہوئی ہوں ۔ تاکہ مغرور و ظالم بادشاہ قتل کا حکم تو دے سکے لیکن دلیل کو جھٹلانے کی جرأت نہ کر سکے ۔

وہ مناجات کرے تو لفظ ایسے ہوں کہ سخت دلوں کو نرم کر دیں ۔ وہ اپنے مصائب اشعار میں بیان کرے تو لفظ ایسے ہوں کہ شقی بھی رونے لگیں ۔

فلک پیر کی آنکھوں نے دنیا کے صفحے پر ہزاروں فصیح دیکھے ہوں گے ۔ لیکن فصیحوں کی فصاحت بھی بعض چیزوں کی محتاج ہوتی ہے ۔ بھوکے ہوں ۔ پیاسے ہوں ۔ مصیبت زدہ ہوں ۔ خوف زدہ ہوں ۔ ماں بہنیں قید ہوں ۔ یہ وہ مصائب ہیں کہ جب پڑتے ہیں تو آدمی کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے ۔ زبان گنگ ہو جاتی ہے ۔ الفاظ نہیں نکلتے صرف آنسو نکلتے ہیں ۔ لیکن واہ رے سید سجادؑ ایسا فصیح زمانے نے تیرے سوا کہاں دیکھا جوان مصائب کے درمیان جن سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں اور دن کالی رات بن جائیں ۔ جب بولا تو اسکے الفاظ نہ تھے ۔ کسی آتش فشاں پہاڑ کا ابلتا ہوا لاوا تھے جنھوں نے دشمنوں کو نیست و نابود کر کے رکھدیا ۔ اسکے الفاظ نہ تھے بھڑکتے ہوئے شعلے تھے جنھوں نے ظلم و جبروت کو جلا کے خاک کر دیا ۔ اسکے الفاظ نہ تھے ایک سیل بے پناہ تھے ۔ جس میں غرور بادشاہی تنکے کی طرح بہہ گیا ۔ اسکے الفاظ نہ تھے رشد و ہدایت کا

ایک ابلتا ہوا چشمہ تھے جن سے طالبان حق و معرفت رہتی دنیا تک سیراب ہوتے رہیں گے۔ اسکے الفاظ نہ تھے کرم کا وہ بادل تھے جس نے نطق کا آب حیات برسایا۔ اور اس آب حیات نے دلوں کی مردہ زمینوں کو زندہ کر کے اس میں معرفت کے چمنستان اور ایمان و ایقان کے گلستان لہلہا دیئے۔

یہاں ہم نے امام زین العابدینؑ کی فصاحت و بلاغت کے لازوال بوستانوں سے جو گل ہائے رنگ رنگ چنے ہیں ان میں خطبے بھی ہیں۔ اور اشعار بھی ہیں۔ مکتوب بھی شامل کیا ہے اور موعظہ بھی۔ مناجات کے حصے بھی ہیں اور ارشادات بھی اور ایک نعت بھی ہے جو آپ سے یادگار ہے۔ آپ نے رسولؐ کے ماننے والوں کی، امتیوں کی، صحابیوں کی، علما کی۔ سبھی کی نعتیں پڑھی ہوں گی لیکن عشق رسولؐ کی جو سرشاری و سرمستی اس نعت میں ہے وہ اور کہاں مل سکتی ہے۔ محمدؐ کی نعت ہے۔ آل محمدؐ کے الفاظ ہیں۔ دیکھئے اپنے جد کی شان ایک امامؑ کیسے بیان کرتا ہے۔

امام زین العابدین کی نعت

ان نلتَ یا ریحَ الصبا یوماً الیٰ ارض الحرم
بلغ سلامی روضۃ فیھا النبی المحترم

من وجھہ شمس الضحیٰ من خدہ بدر الدجیٰ
من ذاتہ نور الھدیٰ من کفہ بحر الھمم

قرآنہ برہاننا نسخاً لا دیان مضت
اذ جاءنا احکامہ کل الصحف صار العدم

اکبادنا مجروحۃ من سیف ہجر المصطفیٰ
طوبیٰ لاھل بلدۃ فیھا النبی المحتشم

یالیتنی کنت لمن یتبع نبیاً عالماً

یوماً و لیلاً دائماً وارزق کذالی باالکرم

یا رحمتہ اللعالمین انت شفیع المذنبین

اکرم لنا یوما الحزین فضلاً و جواداً والکرم

یا رحمتہ اللعالمین ادرک لزین العابدین

محبوس ایدی الظالمین فی الموکب والمزدحم

(اے باد صبا اگر تیرا گزر سرزمین حرم تک ہو۔ تو میرا سلام اس روضے تک پہنچا جس میں نبی محترم تشریف فرما ہیں۔ جن کا چہرہ چمکتا سورج ہے جن کے رخسار ماہ کامل ہیں۔ جن کی ذات نور ھدایت ہے۔ جن کی ھتیلی سخاوت میں دریا ہے۔ جن کا قرآن ہمارے لئے واضح دلیل ہے۔ جس نے ماضی کے تمام دینوں کو منسوخ کیا۔ جب ان کے احکام آگئے تو سارے صحیفے معدوم ہو گئے۔ ہمارے جگر زخمی ہیں فراق مصطفے کی تلوار سے۔ خوش نصیبی اس شہر کے لوگوں کی ہے جس میں نبی محتشم ہیں۔ کاش میں اس کی طرح ہوتا جو نبی کی پیروی علم کے ساتھ کرتا ہے۔ دن اور رات ہمیشہ یہی صورت اپنے کرم سے عطا فرما۔ اے رحمت عالم آپ گنہ گاروں کے شفیع ہیں۔ ہمیں قیامت کے دن فضل و سخاوت اور کرم سے عزت بخشیئے۔ اے رحمت عالم زین العابدینؑ کو سنبھالیے۔ وہ ظالموں کے ہاتھوں میں گرفتار حیرانی و پریشانی میں ہے۔)

اور اب یہ خطبہ ملاحظہ ہو۔ کوفے کا بازار ہے۔ اس کوفے کا جہاں ایک زمانے میں جناب امیرؑ کی حکومت تھی۔ یہاں لوگ جشن منا رہے ہیں۔ لباس فاخرہ پہنے ہوئے ہیں۔ شہر کو سجایا گیا ہے۔ قتل حسینؑ کی خوشی میں۔ اور قتل حسینؑ کی خوشی منانے والے وہی ہیں جنھوں نے خط لکھ کر امامؑ کو بلایا تھا۔ امام زین العابدینؑ کہتے ہیں۔

اے لوگو! جو مجھے پہچانتا ہے وہ پہچانتا ہے اور جو نہیں پہچانتا ہے اس سے میں اپنا تعارف کراتا ہوں۔ سنو، میں علیؑ ابن الحسینؑ ابن علیؑ ابن ابی طالبؑ ہوں۔ میں اسکا فرزند ہوں جسکی ہتک حرمت کی گئی۔ جس کا سامان لوٹ لیا گیا۔ جسکے اہل و عیال قید کر لئے گئے۔ جو ساحل فرات پر ذبح کر دیا گیا۔ اور جسکی لاش بغیر دفن و کفن چھوڑ دی گئی۔ اے لوگو، خدا کا واسطہ۔ ذرا سوچو۔ تم ہی لوگوں نے میرے پدر بزرگوار کو خط لکھ کر بلایا۔ پھر تم ہی لوگوں نے ان کو دھوکہ دیا۔ تم ہی نے ان کے ساتھ عہدو پیمان کیا۔ اور ان کی بیعت کی۔ پھر تم ہی نے ان کو شہید کر دیا۔ تمھارا برا ہو۔ تم نے اپنے لئے ہلاکت و بربادی کا سامان مہیا کر لیا۔ تمھارے نفوس کس قدر خبیث اور تمہاری رائیں کتنی بری ہیں۔ تم کن آنکھوں سے رسول خداؐ کو دیکھو گے۔ جبکہ وہ تم سے باز پرس کرینگے۔ اور کہیں گے کہ اے کوفیو۔ تم لوگوں نے میری عترت کو قتل کیا۔ اور میرے حرم کو ذلیل کیا۔ تم سب میری امت سے خارج ہو۔

اس خطبے میں اپنا تعارف بھی ہے۔ اپنے عظیم باپ کے مصائب کا بیان بھی ہے۔ لوگوں کو شرمندہ بھی کیا گیا ہے۔ اور انجام بھی بتا دیا گیا ہے کہ اس قصور کا جو انھوں نے کیا ہے بروز قیامت کیا نتیجہ نکلے گا۔

کوفے کی منزل سے گزرے۔ شام پہنچے۔ یہ شام کا دربار ہے۔ یزید پورے کروفر کے ساتھ تخت حکومت پر بیٹھا ہے۔ آل رسول سامنے کھڑی ہے۔ دنیا تماشائی ہے۔

یزید سمجھتا ہے کہ تخت و تاج میرے پاس ہے۔ حکومت میرے پاس ہے۔ دربار میرا ہے۔ فوج میری ہے۔ حشم و خدم میرا ہے۔ دولت میرے پاس ہے۔ طاقت میرے پاس ہے۔ میں ہی عزت والا ہوں۔

اور ایسے عالم میں جبکہ یزید کا نشہ غرور حکومت اپنے پورے اوج پر ہے

قیدی گفتگو شروع کرتا ہے۔ دنیاوی لحاظ سے قیدی مجبور ہے۔ بے کس ہے۔ بے بس ہے۔ لیکن پھر بھی قیدی کی گفتگو میں علیؑ کا جلال ہے۔

اور کیوں نہ ہو۔ علیؑ کا پوتا ہے۔ اسکی تقریر کی کاٹ بھی علیؑ کی برش شمشیر سے کم نہیں۔ اسکے الفاظ میں وہی شکوہ ہے جو نہج البلاغہ میں گونج رہا ہے۔ قیدی خدا کا شکر کرتا ہے۔ کیونکہ اسے خدا نے عزت دی ہے۔ وہ یزید کے تصور عزت کی دھجیاں بکھیر دیتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ تخت و تاج یہ زرو جواہر یہ خادم یہ فوج یہ عزت نہیں دیتی۔ عزت تو خدا دیتا ہے۔ یہ دنیاوی اقتدار آنی جانی چیز ہے۔ اور خدا کی دی ہوئی عزت جنت کی طرح جاوداں ہے۔

وہ فخر کرتا ہے۔ اور سبب فخر عاقبت کو قرار دیتا ہے۔ اسے فضائل انسانی پہ فخر ہے۔ اسے خصائل حمیدہ پر فخر ہے۔ اسے رسالت کا وارث ہونے پر فخر ہے۔ اسے اپنے مصائب پر فخر ہے اسلئے کہ یہ مصائب اس پر اس لئے گزر رہے ہیں کہ وہ حق سے وابستہ ہے۔ وہ اہل دربار سے خطاب کر کے کہتا ہے۔

اے لوگوں ہمیں خدا نے چھ چیزیں عطا کی ہیں اور سات چیزوں سے ہمیں فضیلت دی ہے۔ ہمیں علم دیا۔ حلم دیا۔ جواں مردی دی۔ فصاحت دی۔ شجاعت دی۔ قلوب مومنین کی محبوبیت دی۔ اور ہمیں افضل بنایا کیونکہ احمد مختار ہم میں سے ہیں۔ اور رسولؐ کی تصدیق کرنے والے ابو طالبؑ ہم میں سے ہیں۔ اسداللہؑ ہم میں سے ہیں۔ حمزہؑ ہم میں سے ہیں۔ سبطین رسولؐ ہم میں سے ہیں۔

میں اسکا فرزند ہوں جس نے اپنی چادر میں حجر اسود کو اٹھایا۔ میں اس کا فرزند ہوں جو تمام طواف کرنے والوں اور سعی کرنے والوں میں بہترین ہے۔ میں اسکا بیٹا ہوں جس نے براق پر سواری کی۔ میں اسکا بیٹا ہوں جو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے جایا گیا۔ میں اسکا بیٹا ہوں جو جبریل کے ساتھ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا۔ میں

اسکا بیٹا ہوں جو قاب قوسین او ادنیٰ تک گیا۔ میں اسکا بیٹا ہوں جس پر آسمان کے فرشتوں نے صلواۃ بھیجی۔ میں اسکا بیٹا ہوں جسے خدا نے اپنی وحی کا خزینہ دار ٹھیرایا۔ میں محمد مصطفیٰؐ کا فرزند ہوں۔ میں علیؑ کا بیٹا ہوں۔ میں اسکا بیٹا ہوں جس نے دو تلواروں سے جنگ کی دو نیزوں سے لڑائی کی جس نے دو دفعہ ہجرت کی۔ جس نے بدر و حنین میں قتال کیا۔ جس نے ایک لمحے کے لیے بھی خدا کی نافرمانی نہیں کی۔ میں اسکا بیٹا ہوں جو صالح المومنین ہے۔ وارث نبیؐ ہے۔ کافروں کا قاتل ہے۔ مسلمانوں کا یعسوب ہے۔ مجاہدوں کا نور ہے۔ عابدوں کی زینت ہے۔ سب سے زیادہ صبر کرنے والا ہے۔ نماز پڑھنے والوں میں سب سے افضل ہے۔ میں اسکا بیٹا ہوں جسکی جبریل نے تائید کی۔ جسکی میکائیل نے نصرت کی۔ جو بے دینوں کا قاتل ہے۔ بیعت توڑنے والوں کا دشمن ہے۔ ناصبیوں کے خلاف جہاد کرنے والا ہے۔ فخر قریش ہے۔ مومن اول ہے۔ نیکی کرنے والوں میں پہلا ہے۔ وہ ایسا تیر ہے جس سے اللہ منافقوں کے دل چھیدتا ہے۔ وہ حکمت رکھنے والے عابدوں کی زبان ہے۔ خدا کے دین کا مددگار ہے۔ اللہ کے حکم کا ولی ہے۔ اصلاب کا کاٹنے والا ہے۔ فوجوں کو بھگانے والا ہے۔ میں سیدہؑ کا بیٹا ہوں۔ میں خدیجۃ الکبریٰ کا بیٹا ہوں۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کا سر پس گردن سے کاٹا گیا۔ میں اسکا بیٹا ہوں جو پیاسا قتل کیا گیا۔ میں اسکا بیٹا ہوں جس پر آسمانوں میں ملائکہ نے گریہ کیا۔ زمین پر جن روئے۔ ہوا میں پرندوں نے نوحہ کیا۔

اے لوگو! خدا کا شکر جس نے ہم اہل بیت کو بلائے حسن میں مبتلا کیا۔ ھدایت، عدل اور تقویٰ کا علم ہمارے ہاتھ میں دیا۔ اور ضلالت کا نشان ہمارے غیروں کو دیا۔

یزید کا دربار ہے۔ وہ دربار جسکی زینت ظلم ہے جبر ہے۔ حقوق کا اتلاف ہے۔ جہاں کسی کو خدا کا خوف نہیں ہے۔ جہاں کسی کو عاقبت کی فکر نہیں کی۔ جہاں

سب غافل ہیں۔ امامؑ ان کے ذہنوں کو جھنجوڑتا ہے۔ انہیں خواب غفلت سے جگاتا ہے۔

اے لوگو۔ ڈرو دنیا سے اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے۔ اسلئے کہ یہ زوال کا گھر ہے۔ اس نے تم سے پہلے کے لوگوں کو فنا کر دیا۔ حالانکہ ان میں سے اکثر کا مال بھی تم سے زیادہ تھا اور عمر بھی تم سے طویل تھی۔ ان کے جسموں کو مٹی نے کھا لیا۔ ان کے احوال متغیر ہو گئے۔ اس کے بعد بھی کیا تم بقا کی امید رکھتے ہو۔ تمھیں ان سے ملحق ہونا ہے۔ تمھاری ان سے ملاقات ضرور ہونی ہے۔ پس سوچو۔ تمہاری عمر میں سے جو گزر گیا سو گزر گیا۔ لیکن جو باقی ہے اس میں تو اچھے اعمال کرو۔ اس سے پہلے کہ تمہیں اجل آ جائے۔ تو عنقریب تمہیں تمہارے محلوں سے نکال کر قبروں میں ڈال دیا جائیگا۔ اور تمہارے اعمال کا محاسبہ ہو گا۔ قسم خدا کی یہ فاجر کا حق ہے کہ اسکی حسرتیں پوری ہوں۔ اور مغرور کے راستے میں ہلاکت کے گڑھے پڑیں۔ اس وقت انکی ندامت انھیں کوئی فائدہ نہ دے گی۔ اور نہ کوئی انکی فریاد سنے گا۔ اور انکے اعمال انکے سامنے ہونگے۔ اور خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

میں اسکا بیٹا ہوں جو شافع روز محشر ہے۔ صاحب لوا و کوثر ہے۔ میں اسکا بیٹا ہوں جو صاحب دلائل و معجزات ہے۔ میں اسکا بیٹا ہوں جس پر قرآن نازل ہوا اور جسکے حصے میں کرامتیں آئیں۔ میں اس کا فرزند ہوں جو صاحب کرم وجود ہے۔ جو سید محمود ہے، براق کا سوار ہے۔ کلمہ اسماعیل ہے۔ صاحب تاویل ہے۔ میں اسکا بیٹا ہوں جو اپنے عہد نباہنے والا ہے۔ نیکوں کا سردار ہے۔ جس پر جنت کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں اور خدا کی خوشنودی جس کیلئے مخصوص کر دی گئی ہے۔

یہ دمشق کی جامع مسجد ہے۔ یزید یہاں کیوں آیا ہے۔ اسلئے کہ دربار میں تو خاص لوگ ہی آتے ہیں۔ یہاں مجمع عام ہو گا۔ زیادہ لوگ ہوں گے۔ یہاں اہل حرم کو

قیدی بنا کے کھڑا کیا جائیگا تو ان کی زیادہ بے عزتی ہو گی۔ لیکن یزید کی سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی کہ رسالت بادشاھت سے لاکھوں گنا زیادہ معزز ہوتی ہے۔ منبر پر جا کے امام زین العابدینؑ خطبہ دیتے ہیں۔

لوگو جو مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہی ہے۔ لیکن جو نہیں پہچانتا اس سے میں اپنا تعارف کراتا ہوں۔ سنو۔ میں علیؑ ابن الحسینؑ ابن علیؑ ابن ابی طالبؑ ہوں۔ میں اسکا بیٹا ہوں جس نے حج کیا۔ طواف کی اور سعی کی۔ میں پسر زمزم و صفا ہوں۔ میں فرزند محمد مصطفےٰ ہوں۔ میں اسکا فرزند ہوں جسکے اصحاب و انصار زمین میں آرام کی نیند سو گئے۔ میں فرزند فاطمہ زہراؑ ہوں۔ میں اسکا فرزند ہوں جو پس گردن سے ذبح کیا گیا۔ میں اسکا بیٹا ہوں جس پر لوگوں نے پانی بند کر دیا۔ اور جو پیاسا ہی زمین کربلا پر شہید کیا گیا۔ میں اسکا فرزند ہوں جسکے اہل حرم قید کر دیئے گئے۔ میں اسکا فرزند ہوں جس کے بچے بغیر جرم و خطا ذبح کر ڈالے گئے۔ میں اسکا فرزند ہوں جسکے خیموں میں آگ لگا دی گئی۔ میں اسکا فرزند ہوں جسکا سر نوک نیزہ پر بلند کیا گیا۔ میں اسکا فرزند ہوں جسکے اہلبیت کو کربلا میں ذلیل و رسوا کیا گیا۔ میں اسکا فرزند ہوں جسکا جسم زمین کربلا پر چھوڑ دیا گیا۔ اور سر دوسرے مقامات پر پھرایا گیا۔ میں اسکا فرزند ہوں جو نرغہ اعدا میں گھرا ہوا تھا۔ اور جس کا کوئی ناصر و مددگار نہ تھا۔ میں اسکا فرزند ہوں جسکے اہل حرم کو قید کر کے شام کے بازاروں میں پھرایا گیا۔

اے لوگو، خدا نے ہم اہل بیتؑ کو پانچ ایسی صفتیں عطا فرمائی ہیں جنکے ذریعے ہم اسکی تمام مخلوق میں ممتاز ہیں۔ خدا کی قسم ہمارے ہی گھر میں فرشتوں کی آمد رہی ہے۔ اور ہم ہی معدن نبوت و رسالت ہیں۔ ہماری ہی شان میں قران کی آیتیں اتری ہیں۔ اور ہم ہی نے لوگوں کو ھدایت کی۔ شجاعت ہمارے ہی گھر کی کنیز ہے۔ ہم کبھی کسی قوت و طاقت سے نہیں ڈرے۔ اور فصاحت ہمارا ہی حصہ ہے۔

ہمارے سامنے فصحائے عرب کی زبانیں گنگ ہیں ۔ ہم ہی صراط مستقیم اور ہدایت کا مرکز ہیں ۔ اور جو علم حاصل کرنا چاہے اس کے لیئے سر چشمہ علم ہیں ۔ ہمارے مرتبے زمین و آسمان میں بلند ہیں ۔ اگر ہم نہ ہوتے تو خدا دنیا کو خلق نہ فرماتا ۔ ہر فخر ہمارے فخر کے آگے پست ہے ۔ روز قیامت ہمارے دوست سیر و سیراب ہونگے اور دشمن ہلاک و معذب ہوں گے ۔

امامؑ دنیا کو عزت کے ایک نئے تصور سے روشناس کراتے ہیں ۔ اس عزت کی اساس قرآن ہے ایمان ہے رسالت ہے ھدائیت ہے علم ہے شجاعت ہے حق سے وابستگی ہے ۔

یزید کی آنکھوں پر پڑا ہوا کفر و ضلالت کا پردہ ہٹانے کیلئے امامؑ اس پر یہ حقیقت آشکار کرتے ہیں کہ افسوس ہے اے یزید اگر تو سمجھتا کہ جو گناہ اور گستاخی اور آزار رسانی تو نے میرے باپ بھائیوں اور چچا اور چچا زاد بھائیوں کے ساتھ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ تو پاگل ہو کر جنگل اور بیابانوں میں نکل جاتا ۔ اور ہمیشہ فرش خاک پر بیٹھتا ۔ اور نالہ و فریاد کیا کرتا ۔ میرے باپ کا سر اور تیرے دروازے پر لٹکایا جائے ۔ اے یزید اب اس ذلت و رسوائی کے واسطے مستعد رہ جو تجھے بروز قیامت نصیب ہونے والی ہے ۔

بازار کوفہ ، دربار ابن زیاد ، بازار شام ، دربار یزید ، دمشق کی جامع مسجد اور قید خانہ ۔ یہ ساری منزلیں طے ہو چکیں ۔ سکینہ غریب شام کے زنداں میں سو چکی ۔ اب رہائی ملی ۔ سات دن دمشق میں مجلسیں ہوئیں ۔ ماتم ہوا ۔ عزاداری ہوئی ۔ پھر کربلا کی طرف چلے ۔ زیارت کربلا کے بعد مدینہ پہنچے ۔ مدینے سے کچھ پہلے قافلہ ٹھہرا ۔ اہل مدینہ کو اطلاع ہوئی ۔ فرزند رسول کے پرسے کو سب آئے ۔ امامؑ نے خطبہ دیا ۔

حمد اس خدا کی جو تمام دنیا کا پروردگار ہے ۔ روز جزا کا مالک ہے ۔ تمام

مخلوقات کا خالق ہے ۔ جو اتنا دور ہے کہ بلند آسمانوں سے بھی بلند ہے ۔ اور اتنا قریب ہے کہ سامنے موجود ہے ۔ اور ہماری باتیں سنتا ہے ۔ ہم عظیم حادثوں ، زمانے کی ہولناک گردشوں ، دردناک مصیبتوں ، خطرناک آفتوں ، شدید اور قلب و جگر کو ہلا دینے والی بلاؤں کے نازل ہونے کے وقت خدا ہی کی تعریف کرتے ہیں ۔ اور اسی کا شکر بجا لاتے ہیں۔

اے لوگو ہم بڑے مصائب میں مبتلا کیے گئے ۔ دیوار اسلام میں بہت بڑا رخنہ پڑ گیا ۔ ابو عبداللہ الحسینؑ اور ان کے اہل بیت قتل کر دیئے گئے ۔ ان کی خواتین اور بچے قیدی بنا دئے گئے ۔ اور لشکر یزید نے ان کے مقدس سروں کو نیزوں پر بلند کر کے پھرایا ۔ یہ وہ مصیبت ہے جسکے برابر کوئی مصیبت نہیں ۔ اے لوگو ، تم میں وہ کون ہے جو شہادت حسینؑ کے بعد خوش رہے ۔ کون سا دل ہے جو غم حسینؑ سے متاثر نہ ہو ۔ اور کون سی آنکھ ہے جو حسینؑ پر آنسو نہ بہائے ۔ سنو ، شہادت حسینؑ پر ساتوں آسمان روئے سمندر اور اسکی موجیں روئیں زمین اور اسکے اطراف روئے ۔ درخت اور ان کی شاخیں روئیں ۔ مچھلیاں اور بحری جانور روئے ۔ ملائکہ مقربین اور تمام آسمان والے روئے ۔ اے لوگو کون سا دل ہے جو شہادت حسینؑ کی خبر سن کر پھٹ نہ جائے ۔ کون سا قلب ہے جو محزوں نہ ہو ۔ کون سا کان ہے جو اس مصیبت کو سن کر جس سے دیوار اسلام میں رخنہ پڑ گیا ہے، بہرہ نہ ہو جائے ۔

اے لوگو ہماری حالت یہ تھی کہ کشاں کشاں پھرائے جاتے تھے ۔ در بدر ٹھکرائے جاتے تھے ۔ ذلیل و خوار تھے ۔ گویا ہم کو غلامان ترک و کابل سمجھ لیا گیا تھا ۔ حالانکہ ہم نے نہ کوئی جرم کیا تھا ۔ نہ کسی برائی کا ارتکاب کیا تھا ۔ اور نہ ان چیزوں کے خلاف کیا تھا جن کو ہم نے اپنے آباو اجداد سے سنا تھا ۔ خدا کی قسم اگر نبیؐ بھی ان لوگوں کو ہم سے جنگ کرنے کیلئے منع کرتے تو یہ ہرگز نہ مانتے جیسا کہ حضرت نبیؐ نے

ہماری وصائت کا اعلان کیا تھا اور ان لوگوں نے نہ مانا۔

لوگوں کو شہادت حسینؑ کی خبر سنائی جا چکی۔ اپنے مصائب سے مطلع کیا جا چکا۔ پرسہ لیا جا چکا۔ لیکن ابھی ایک منزل باقی ہے۔ ابھی تو نانا کو پرسہ دینا ہے۔ روضے پر پہنچے۔ السلام علیک یا جداہ، اے نانا آپ پر سلام۔ اے نانا، میں آپ سے فریاد کرتا ہوں۔ اے افضل المرسلینؐ آپ کا محبوب شہید کر دیا گیا۔ اور آپ کی ذریت تباہ و برباد کر دی گئی۔ اے نانا مجھے قید کیا گیا۔ آپ کی نواسیاں اسیر کی گئیں اور ہم پر اتنے مصائب ڈھائے گئے جو انگلیوں پر شمار نہیں کیے جا سکتے۔

امام زین العابدینؑ کے اشعار

شہر دعوات ★★ کاش میں سمجھ سکتا کہ آیا ہے کوئی ایسا عقلمند جو مصائب زمانہ میں گرفتار ہونے کے باوجود شب ہائے تار میں اپنے معبود حقیقی کا شکر ادا کر رہا ہے۔ میں فرزند امام ہوں لیکن گروہ کفار کے درمیان میرا حق ضائع ہو رہا ہے۔

شہر سیبور ★★ کافر سردار ہو گئے۔ اور کمینے امت کے رہبر ہو گئے۔ پھر بھی عرب اس پر خوش نہیں۔ اے لوگو گردش زمانہ نے ایک ایسی چیز پیش کی ہے جس سے بڑھ کر کوئی عجیب شے نہیں ہے۔ آل رسولؐ تو برہنہ سر اونٹوں کے پالان پر نظر آ رہی ہے ۔ اور آل مروان بہترین اونٹوں پر سوار ہے۔

شہر دمشق ★★ میں دمشق میں اس طرح ذلیل و رسوا کیا گیا جیسے زنجبار کا غلام جسکا کوئی والی و وارث نہ ہو۔

تم کیا جواب دو گے جب رسول اللہؐ تم سے یہ کہیں گے کہ ارے یہ تم نے کیا کیا۔ حالانکہ تم سب امتوں سے آخری امت تھے۔ میری امت اور میرے اہل بیتؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ یہی کہ ان میں سے کچھ قیدی بنائے گئے اور کچھ کو خاک و

خون میں غلطاں چھوڑا گیا۔

شہر مدینہ ★★ جب ہم آل محمدؐ کے گھروں کی طرف سے گزرے تو ہم نے ان کو خالی اور تاریک پایا اگرچہ گھر خالی ہیں اور انکے مکین ہم سے دور ہیں مگر خدا ہمیں ان سے دور نہ رکھے۔ اگر آل ھاشم سے ایک بچہ بھی قتل ہو تو وہ اس قابل ہے کہ دنیا کے لوگ ماتم کریں۔ وہ فریاد کرتے تھے کہ ہماری مصیبت عظیم ہے۔ اور ان کی مصیبت جناب سیدہؑ کی مصیبت کی طرح عظیم ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ روز قتل حسینؑ سورج کو گہن لگ گیا تھا۔

ہم اولاد مصطفیٰ ہیں۔ ہم آدمیوں میں سب سے زیادہ رنج و غم برداشت کرنے والے ہیں۔ ہمارا رنج و غم تمام آدمیوں سے زیادہ ہے۔ ہمارے اول و آخر سب مصیبت میں مبتلا رہے۔ دنیا اپنی اپنی عیدوں کے موقعوں پر خوش ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں عید کے دن ماتم ہوتا ہے۔ لوگ امن و سرور میں ہیں لیکن ہمارے خوف زدوں کو مدت سے امن و سرور نصیب نہیں۔ ہمارے حقوق سے انکار کرنے والے اور ہمارے حقوق چھیننے والے ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہمیں ان پر حکومت کرنی چاہیے۔

تم ناحق کے دعوے کب تک کرتے رہو گے جبکہ صحیح و غلط میں امتیاز ہو چکا ہے۔ تم نے ہمارے حقوق کو اس طرح پہچان لیا جس طرح سفیدی سیاہی سے پہچانی جاتی ہے۔ اور پھر اس سے انکار کر دیا۔ کلام خدا تمھارے مقابلے میں ہمارا گواہ ہے۔ اور ہمارا فیصلہ اللہ کریگا جو بہت اچھا قاضی ہے۔

بڑی خوبیاں رکھنے والے لوگ زمین سے چلے گئے اور گل سڑ کر خاک ہوگئے۔ ان کے مکانات خالی ہیں۔ صحن ویران ہیں۔ قضا و قدر نے انہیں موت کی طرف کھینچ لیا۔ وہ بھی چل بسے اور جو کچھ جمع کیا تھا وہ بھی ہاتھ سے گیا۔ اب وہ مٹی میں دبے

پڑے ہیں۔ دنیا نے مجھ سے جتنے وعدے کئے سب کے خلاف کیا جتنی امانتیں میں نے دیں اس نے سب میں خیانت کی۔ کوئی نئی چیز اس نے پیدا نہ کی جب تک کسی چیز کو پرانا نہ کر دیا۔ کسی کو جمع نہیں ہونے دیا جب تک جو جمع تھے ان کو منتشر نہ کر دیا۔ دنیا نے مجھ سے ایسا برتاؤ کیا گویا وہ میری رسوائی پر تیار تھی یا میری نعمتوں پر حسد کرتی تھی۔

دنیا والو ذرا سوچو، تمہارے اسلاف کہاں چلے گئے۔ تمہارے اہل و عیال اور اقارب کیا ہوئے۔ انبیا و مرسلین کہاں چھپ گئے۔ واللہ موت نے ان سب کو پیس دیا۔ زمانے نے ان کو مٹا دیا۔ اور ہم بھی انہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ بیشک ہم خدا کی طرف سے آئے ہیں اور اس کی طرف جانے والے ہیں۔ جب دنیا کا یہ طریقہ ہم سے پہلے والوں کے ساتھ رہ چکا تو ہم بھی ان کے ہی نشان قدم پر چلیں گے اگر مضبوط سے مضبوط پہاڑ بھی بچانا چاہیں تو موت کے پنجے سے رہائی ناممکن ہے۔ یہ دنیا قیام کی جگہ ہی نہیں ہے۔ یہاں رہنے کی ہوس کرنا فضول ہے۔

امام زین العابدین کے مقاصد

امام کا منصب چونکہ خدا کا عطا کردہ ہوتا ہے اور اللہ کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہوتی لہٰذا تمام اماموں کے مقاصد ایک ہی ہوتے ہیں۔ ہاں زمانے کے حالات اور واقعات کے مطابق ان مقاصد کے حصول کا طریقہ بدل جاتا ہے۔ جیسے معجزے کا مقصد یہی ہے کہ آدمی ایمان لے آئے لیکن ہر رسول کو الگ معجزہ عطا کیا گیا۔ کیونکہ ہر ایک کا زمانہ جدا تھا۔ حالات مختلف تھے۔ اور ضروریات علیحدہ علیحدہ تھیں۔ جب سحر کا زور تھا۔ لوگ رسیوں کو سانپ بنا دیتے تھے۔ تو موسیٰ کے عصا کو اژدہا بنا دیا گیا۔ جو ان سانپوں کو کھا گیا۔ جب طبابت کا شہرہ ہوا تو عیسیٰ کو مسیحائی کا معجزہ عطا کیا گیا۔ کہ ہاتھ مس کرنے سے کوڑھیوں معذوروں اور اندھوں کو شفا بخشیں اور ٹھوکر سے مردوں کو زندہ کر دیں۔ جب فصاحت و بلاغت اور شمشیر زنی کا عروج تھا۔ رسولؐ امی کو قرآن کریم کا معجزہ عنائیت فرمایا گیا۔ جسکی فصاحت نے سبع معلقات کو گرد کر دیا۔ اور علیؑ کو وصی ولی وزیر اور مددگار قرار دیا گیا۔ جسکی شجاعت نے اہل عرب کے سر رسول کے قدموں میں جھکا دیے۔

بنیادی مقصد تو ہر امام کا یہی ہے۔ کہ حق کو استقلال ہو۔ باطل کا استیصال ہو۔ لوگوں کو تقویٰ کی ترغیب دی جائے۔ نصیحت سے بھی اور اپنے نمونہ عمل سے بھی لوگوں کو مائل کیا جائے کہ معاشرے کو مثالی بنائیں۔ جس میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہو۔ ظلم مٹ جائے۔ لوگ احکامات خداوندی پر عمل کریں اور یہ عمل صرف دین کے الفاظ پر عمل نہ ہو۔ دین کی روح پر عمل ہو۔ لیکن چونکہ ہر عہد میں ہر زمانے میں، ہر دور میں باطل بھی ریشہ دوانیاں کرتا رہتا ہے۔ حق کو تباہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ تباہ نہ ہو سکے تو حق کو باطل کے ساتھ مخلوط کرنے کی کوشش

کرتا ہے ۔ تاکہ شک و شبہات جنم لیں ۔ عقیدے کمزور ہوں ۔فاسد ہوں ۔ یقین کم ہوجائے ۔ مذہب ایک عقیدہ بے روح لباس بے جسم اور جسم بے جان کی طرح رہ جائے ۔کہ ہو تو سہی لیکن کسی کام کا نہ ہو۔ موجود رہے لیکن باطل سے مغلوب رہے۔ اسلئے امام کی ذمہ داری یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ہر موڑ پر ہر مرحلے پر ہر حال میں سب کو حق و باطل کی تمیز کراتا رہے۔ حق کی معرفت کرائے اور باطل کا مکروہ چہرہ بھی پہچنوا دے ۔ باطل جو تدبیر بھی کرے، جو چال بھی چلے، جو فریب بھی دے، ہر تدبیر کو نا کام بنادے، ہر چال کا توڑ کر دے، ہر فریب کا پردا چاک کر دے ۔ مذہب کو اسکے صحیح خدوخال کے ساتھ باقی رکھے ۔ لوگوں کے اعمال کی نگرانی رکھے کہ سیدھی راہ سے بھٹک تو نہیں رہے ۔ معاشرے میں جہاں بھی ظلم نظر آئے اسکے خلاف آواز بلند کرے ۔ مخلص پیروکار میسر آئیں تو جہاد بالسیف کرے۔ مخلص پیروکار نہ ملیں تو ظلم کو بہانگ دہل برا کہے ۔ ظالموں کو خدا سے ڈرائے ۔نصیحت کرے ۔ اچھائیوں کی تلقین و تاکید کرے ۔ اور اپنے عمل سے اس تلقین و تاکید کو مضبوط بنائے ۔ باطل اگر دین میں ردوبدل کرے، احکامات کو منقلب کرے، ہدایات کو زیروزبر کرے، حلال وحرام میں اپنی مرضی کو دخل دے ، آیات میں تحریف کرے، مفاہیم و مطالب خداوندی کی غلط توجیہ کرے، صحیح احادیث کو بیان نہ کرنے دے، گڑھی ہوئی احادیث کو نشر کرے ۔ فاسد عقیدوں کو پھیلائے ۔ صحیح عقیدوں میں شک پیدا کرے ۔ وہ کام کرے کہ بظاہر دینی معلوم ہوں لیکن جنکا اصل مقصد صرف اپنی دنیا سنوارنا ہو، اپنی حکومت مضبوط کرنا ہو ۔ اپنے عیش کے سامان فراہم کرنے ہوں ۔ اس وقت امام دنیا کی پرواہ نہ کرے، باطل کے سیلاب کے سامنے مضبوط چٹان بن جائے ۔ بڑے سے بڑا لالچ اور شدید سے شدید خوف اسے متزلزل نہ کر سکے ۔ وہ قرآن پر ایسے عمل کر کے دکھائے کہ مجسم تفسیر بن جائے ۔ قرآن کے اسرار و رموز ایسے بیان کرے کہ قرآن ناطق کہلائے اور اپنے کردار کی روشنی ایسے پھیلائے کہ سارا زمانہ جگمگائے ۔ ہر ایک کے ساتھ نیکی کرے،

بھلائی کرے، اچھائی کرے۔ اور سب سے بڑی اچھائی یہی ہے کہ ہر ایک کو جنت کا راستہ دکھائے۔ یہی رحمت ہے۔ رسول رحمت العالمینؐ تھے۔ ان کا حلقہ اثر پوری کائنات تھا جتنی بھی مخلوقات ہیں آپ کا حکم سب پر جاری تھا۔ تمام جن وانس کو ہدایات کرنا آپ کی ذمہ داری تھا۔ اور امام نبی کا وصی برحق ہوتا ہے۔ اسکا دائرہ حکم بھی جن وانس، وحش وطیر سب پر محیط ہے۔ اسکی ہدایت کا چشمہ بھی دنیا کے ہر جن وانس کی روح کو سیراب کرنے والا ہے۔

گویا نبیوں اور اماموں کے مقاصد کا بنیادی نکتہ ایک ہی ہوتا ہے۔ بس اس مقصد کو حاصل کرنے کے ذریعے مختلف ہوتے ہیں۔

رسول اکرمؐ نے پہلے صرف ان لوگوں کو تبلیغ کی جو قریب تھے۔ پھر تبلیغ کا دائرہ وسیع کیا۔ راستے میں رکاوٹیں آئیں۔ لوگ دشمن ہوئے۔ شعب ابی طالب میں رہنا پڑا۔ پھر حلات بدلے، لوگ مسلمان ہونے لگے۔ لیکن باطل نے پھر کوشش کی اس تبلیغ کو روکنے کی۔ مجبوراً رسولؐ کو اپنا شہر چھوڑنا پڑا۔ ہجرت کرنی پڑی۔ رسولؐ کی محنت رنگ لائی اسلام کا حلقہ اثر پھیلا۔ قبائل اس میں شامل ہوئے۔ رسول نے وفد بھیجے۔ معاہدے کئے جنگیں لڑیں۔ صلح کی۔ بدعہدی کرنے والوں کو قتل کیا۔ خون کے پیاسوں کو معاف بھی کیا۔ زندگی کے یہ تمام گوشے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن سب کی بنیاد مصلحت خداوندی پر ہے۔ باطل سے نمٹنے کے لئے جب اور جہاں جیسا موقع تھا ویسا کیا۔ کہیں لفظ رسول اللہؐ پر خود قلم پھیر دیا۔ کبھی حج نہ کیا واپس آگئے۔ کہیں جدال و قتال کیا اور مدینے سے بہت دور جاکے۔ مشیت الہٰی کو جو طریقہ مناسب نظر آیا اس پر عمل کیا۔ اور راضی برضا رہے۔ اپنی مرضی کو کبھی دخل نہ دیا۔ اسلئے کہ اپنی مرضی بیچ کر ہی تو رب کی مرضی خریدی جاسکتی ہے۔

امیرالمومنینؑ نے بدر، احد، خندق، خیبر، ہر جگہ اپنی برش شمشیر کے جوہر

دکھائے۔ اور بعد رسولؐ جب آپ کے گھر پر ہجوم کیا گیا آگ لگانے کی دھمکی دی گئی۔ گھر کا دروازہ گرادیا گیا۔ جس سے پہلوئے بنت رسولؐ شکستہ ہوا اور محسنؑ شہید ہوئے۔ اس سب پر آپؑ نے صبر کیا۔ اور اتنا صبر کیا کہ لوگوں نے گلے میں رسّی باندھ دی۔اور دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ جمل میں، صفین میں لیلۃ الہریر میں وہی تلوار پھر کشتوں کے پشتے لگا دیتی ہے۔شجاع کے لئے حلم بہت دشوار ہوا کرتا ہے۔ لیکن یہ خدا کی مصلحت کا احترام ہے کہ جسکی تلوار سے سارا عرب تھراتا ہو اسکے گلے میں رسی باندھی جائے اور وہ صبر کرے۔ کیونکہ اسے اپنی انا عزیز نہیں۔ دین عزیز ہے۔ دین کی بقا اور دین کی زندگی کیلئے اس سے جو بھی قربانی مانگی جاتی ہے وہ دیتا ہے۔ اور خوش ہوتا ہے۔ امام حسنؑ لشکر ترتیب دیتے ہیں۔ انکے عظیم المرتبت باپ کو انکے سامنے ممبر پر سے برا بھلا کہا جاتا ہے۔ وہ اسے بھی برداشت کرلیتے ہیں۔ اتحاد اسلامی کی خاطر۔ لوگ ہمارا حق غصب کرلیں لیکن اسلام کو تو مانیں۔ نانا کے دین سے تو نہ پھریں۔امام حسینؑ مکے ہجرت کرتے ہیں۔ سفر عراق اختیار کرتے ہیں۔ کربلا کی جنگ میں وہ شجاعانہ کردار پیش کرتے ہیں۔ جس پر دیدہ تاریخ آج تک حیران ہے۔ تین دن کی بھوک پیاس میں بیٹوں بھتیجوں دوستوں رشتے داروں اور جاں نثاروں کے بہتر داغ دل پر اٹھانے کے بعد لاکھوں سے جنگ اور لشکر میں کھلبلی ڈالنے کے بعد یہ کہنا کہ دیکھی تم نے پیاسے کی جنگ۔ ایسا کارنامہ نہ اس سے پہلے کسی نے انجام دیا نہ اسکے بعد کوئی انجام دے سکا۔

اب امام زین العابدینؑ کی باری آتی ہے۔

کربلا کی جنگ ہوچکی ہے۔ بہت بڑی فوج نے خاندان رسالت کے گنے چنے لوگوں اور انکے جانثاروں کو قتل کردیا ہے۔ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا ہے۔ بازاروں اور درباروں میں انکو پھرایا جاچکا ہے۔ سارے قیدی شام کے ایک خرابے

میں بڑی بے بسی اور بے کسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یزید، ابن زیاد اور سارے ظالم خوش ہیں کہ ہم نے جو چاہا کرلیا۔ لیکن ان ناعاقبت اندیش لوگوں کو کیا خبر کہ آنے والا وقت اپنے دامن میں کیا کیا واقعات وحادثات چھپائے ہوئے ہے۔ ظالم سمجھ رہے ہیں جنگ ختم ہوچکی حسینؑ قتل ہوگئے۔ انکے ورثا قید میں ہیں۔ ہمارا مقصد بر آیا۔ اب ہمیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں رہا۔ اب ہم اپنی من مانی کرسکیں گے۔ لیکن یہ انکی بھول ہے۔ انکی حماقت ہے۔ انہیں یہی نہیں پتہ کہ اگر لڑائی نیکی اور بدی میں ہو رہی ہو۔ اگر معرکہ خیروشر کے درمیان ہو رہا ہو۔ اگر روحانیت اور مادیت میں وغا ہورہی ہو تو ایسی جنگ میں فیصلہ تلوار سے نہیں ہوتا۔ اور نہ ایسی جنگ کا نتیجہ اتنی جلدی نکلتا ہے۔ یہ دوچار سال کے عیش کیا ہیں۔ یہ تو وہ ڈھیل ہے جو پروردگار اس وجہ سے دیتا ہے کہ وہ قادر مطلق ہے۔ اور نہ اس کی گرفت سے کوئی بچ سکتا ہے نہ بھاگ سکتا ہے۔ اور ہرایک کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔ آخر سب کو اسی کے دربار میں پہنچنا ہے۔ آخری فیصلہ تو وہیں ہونا ہے۔ ہاں دنیا میں بھی ظالموں کا برا ہی انجام ہوتا ہے۔ تھوڑی سی مہلت کے بعد۔ اور ان ظالموں کیلئے تو دنیا اور آخرت کا گھاٹا مقدر کردیا گیا ہے۔ قاتلان حسینؑ میں سے کسی کو بھی وہ انعام نہیں ملنا ہے جسکی توقع میں، جسکی ہوس میں اس نے اتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کیا تھا۔ سید سجاد کو سب سے پہلے تو کربلا کی جنگ کی تکمل کرنی ہے۔ انہیں دنیا کو بتانا ہے کہ کربلا کی جنگ آخر کیوں ہوئی تھی۔ سبط رسول نے اپنی زندگی کی قربانی کیوں کی تھی۔ حسینؑ نے بیعت کیوں نہیں کرلی تھی۔ انہیں دنیا کو یہ بات بتانی ہے کہ ایک حقیقی اسلام ہوتا ہے جو حسینؑ کا تھا۔ ایک مصنوعی اسلام ہوتا ہے جو یزید کا تھا۔ کربلا کی جنگ حصول تخت و تاج کیلئے دو طالبان اقتدار کی جنگ نہ تھی۔ یہ اصولوں کی جنگ تھی۔ اور اصولوں کی جنگ جب بھی ہوتی ہے اس میں ہمیشہ اصول ہی جیتتے ہیں۔ تخت و تاج ہمیشہ ہارتا ہے۔ کیونکہ اصول حق ہیں

تخت و تاج باطل ہے۔ اور باطل مٹنے ہی کیلئے ہوتا ہے۔ سید سجادؑ کا پہلا مقصد یہی ہے کہ وہ کربلا کی جنگ کے نتیجے کا اعلان کریں۔ وہ دنیا کو بتائیں کہ فتح حسینؑ کی ہوئی ہے۔ کیونکہ حسینؑ سچے تھے۔ یزید ہار گیا۔ اسلئے کہ وہ فاسق تھا۔ فاجر تھا۔ اور رسوائی فاسقوں ہی کے حصے میں آتی ہے۔ زین العابدینؑ کو یہ بتانا ہے کہ اے دنیا والو ذرا کردار کی میزان پر تول کے تو دیکھو۔ یزید اور حسینؑ کا مقابلہ ہی کیا۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

یزید کے مرنے کے بعد بھی دنیا کو بدلنا نہیں ہے۔ تخت کبھی خالی نہیں رہا۔ ایک ظالم کی جگہ دوسرا ظالم لے لیتا ہے۔ یزید کا بیٹا حکومت کی طرف رغبت نہیں کرتا تو مروان بن حکم شام کا حاکم بن جاتا ہے۔ اس کے بعد عبدالملک بن مروان، عبدالملک کے بعد ولید بن عبدالملک۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسلام کے نام پر شخصی بادشاہت کا سلسلہ۔ احکام شرعی کے پردے میں اپنی من مانی کا سلسلہ۔ جس برائی میں جس عیب میں، جس گناہ میں، جس خرابی میں مبتلا ہیں اسے اچھا کہنے کا سلسلہ۔ اپنی غیر اسلامی باتوں کو اسلام کہنے کا سلسلہ۔

ہاں حکومت کی مصلحت میں ایک تبدیلی ہوتی ہے۔ یزید کی تباہی سے بنی امیہ کو یہ پتہ ہوگیا ہے کہ خاندان رسالتؐ سے ٹکرانے میں اپنا ہی نقصان ہے۔ لہذا تلوار کا رخ خاندان رسالت سے مڑ کر شیعان علیؑ کی طرف ہو جاتا ہے۔ علی ابن الحسینؑ سے کوئی بیعت طلب نہیں کرتا۔ انہیں معلوم ہے کہ شخصیتیں الگ الگ ہیں لیکن کردار سبھوں کا ایک ہے۔ علی ابن الحسینؑ سے بیعت طلب کرنے کا مطلب ہے ایک اور کربلا۔ اور کربلا وہ سیلاب ہے جو ظالموں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا ہے۔ سب مٹ جاتے ہیں۔ حسین ابن علیؑ کا نام رہ جاتا ہے۔ ظالم اس انجام سے ڈرتے ہیں علی ابن الحسینؑ سے کچھ نہیں کہتے۔ ہاں یہ خیال رکھتے ہیں کہ انکے گرد شیعہ

جمع نہ ہونے پائیں۔ لوگوں پر ان دیکھی پابندی ہے۔ کوئی ان سے ملے نہیں۔ ملے تو جان ہتھیلی پر رکھ کر۔ کیونکہ مطلق العنان حکومت میں ظالم بادشاہ کی مرضی ہی قانون ہوتی ہے۔ شیعہ ہونا۔ آل رسولؐ کا پیرو ہونا۔ اہلبیت کا محب ہونا۔ بس یہی جرم ھے باقی کوئی چیز جرم نہیں ہے۔ دنیا کے بادشاہ سب سے زیادہ محبت اپنے اقتدار سے کرتے ہیں۔ اسی لئے بیٹا باپ کو معزول کرکے قید کردیتا ہے۔ اور اندھا بھی کروا دیتا ہے۔ بھائی اپنے بھائیوں سے مدد بھی لیتا ہے اور انھی کے سر تن سے جدا کروادیتا ہے۔ تاریخ شاھد ہے کہ انسانوں نے کسی تعلق اور رشتے کو اتنا مضبوط اور معتبر نہیں جانا کہ اسکے بعد بے خوف ہو جائیں کہ اس سے ہمارے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں۔ شکوک اور شبہات سرطان کی طرح سلطانوں کے ذہنوں میں پھیلتے رہتے ہیں۔ جب بھی انکی بدگمانی پختہ ہو جاتی ہے۔ وہ اس شخصیت کو جو ویسے ان کیلئے کتنی بھی معزز محترم یا محبوب رہی ہو خنجر کے حوالے کردیتے ہیں۔

اماموں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

بادشاہ جانتے تھے کہ یہ لوگ خاندان رسالت کے چشم وچراغ ہیں۔ انکے دن لوگوں حاجتیں پوری کرنے میں اور راتیں عبادت کرنے میں گزرتی ہیں۔ دنیا انکے لئے سور کی اس ہڈی کی مانند ہے جو کسی جذامی کے ہاتھ میں ہو۔ روزوں کی وجہ سے انکے شکم پیٹھ سے لگ گئے ہیں۔ اور نماز میں گریہ و زاری کرنے کی وجہ سے آنکھیں سوجی رہتی ہیں۔ یہ خدا کے مقرب بندے ہیں۔ انکی بددعا سے عرش الٰہی کانپ جاتا ہے۔ لیکن جب بھی کوئی حاسد یہ بتاتا ہے کہ لوگ امام سے ملنے آرہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تیرے خلاف علم بغاوت بلند کریں۔ وہ بادشاہ بغیر تصدیق کئے یا تو انہیں قید کردیتا تھا یا شہید کرا دیتا تھا۔ جو بادشاہ اپنی حکومت کی بقا کے لئے سبط رسولؐ کے خون سے ہاتھ رنگنے کو برانہ سمجھتے تھے وہ اس تخت وتاج کی حفاظت کیلئے دین میں جو رد وبدل اور

ترمیم وتنسیخ کرلیں وہ کم ہے ۔ پھر فتویٰ فروش علما ہر دور میں رہے ہیں ۔ آخر شریح نے بھی تو چند زر کے تھیلوں کے عوض اپنی رائے کو تبدیل کیا تھا ۔ اور ایک دن یہ کہنے کے بعد کہ حسینؑ سبط رسول ہیں ۔ ان کا قتل گناہ عظیم ہے ۔ دوسرے دن ان کے قتل کا فتویٰ یہ کہ کر دیدیا تھا کہ بہر حال وہ خلیفہ کے مخالف ہیں ۔ ان کا قتل جائز ہے۔ بنی امیہ کو پتہ تھا کہ اسلام کا نام لیکر مسلمانوں کا جتنا بھی چاہو استحصال کرلو۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا ۔ چناچہ حدیثوں کے بازار لگ گئے ۔ آل رسولؐ کی مدح میں جو حدیثیں تھیں انہیں سنانا ممنوع بلکہ جرم قرار دیدیا گیا اور اس جرم پر لا تعداد شیعان علی کو قتل کیا گیا کہ وہ ایسی حدیثیں سناتے تھے جو علیؑ یا اولاد علیؑ کی تعریف میں تھیں۔ اور بنی امیہ کی تعریف میں احادیث وضع کی جانے لگیں ۔ ایسی حدیثیں جو ظالموں کو جنتی ثابت کریں۔ قاتلوں کے جرائم پر پردہ ڈالیں ۔ ظالموں کو اقتدار کا اہل قرار دیں ۔ قرآنی آیات کی تاویل بھی حکومت کے اشارہ چشم و ابرو کے مطابق ہونے لگی جس نے بھی اقتدار حاصل کرلیا ہے وہ ٹھیک ہے ۔ چونکہ اب تو وہ مسلمانوں کا خلیفہ ہے۔ چاہے وہ فاسق ہو یا فاجر بہرحال مسلمانوں کو اسکا کہنا ماننا چاہئے ۔ ایسے خیالات منبر سے نشر کئے جانے لگے ۔ اور ان کی تقویت کیلئے احادیث نبوی اور آیات قرآنی کو توڑا مروڑا جانے لگا۔ عمال حکومت کی ہزار کوششوں کے باوجود لوگوں کو پتہ چل ہی جاتا تھا کہ حکومت نے کتنے لوگوں کو قتل کرادیا۔ کتنے لوگوں کی جائیداد چھین لی گئی۔ کتنے لوگوں کو بے جرم وخطا سخت سزائیں دی گئیں ۔ یہ فطری بات ہے کہ ظالم سے انسان نفرت کرتا ہے اس نفرت سے بچنے کیلئے حکومت کے تنخواہ دار علماء نے یہ عقیدہ پھیلایا کہ انسان مجبور ہے ۔جو کچھ وہ کرتا ہے وہ خدا کے حکم سے کرتا ہے ۔ خدا چاہتا ہے۔ لہذا بادشاہ اگر ظالم ہے تو وہ مجبور ہے کہ خدا نے اسے ایسا بنایا۔ اگر وہ کسی کو قتل کراتا ہے تو یہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے اسلئے بادشاہ پر ذمہ داری نہیں اور وہ سب اس دور میں ہورہا تھا جب چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا تھا کہ اسلام میں خدا نے چوری

کی یہی سزا رکھی ہے گویا غریب کا جرم جرم ہے۔ اسکو سزا ضرور ملنی چاہیئے اور امیروں یا بادشاہوں کے جرم کے لئے تو کوئی حدیث وضع کرلیں گے یا پھر کسی آیت کو غلط معنی پہنالیں گے تاکہ بادشاہ کو کوئی کچھ نہ کہہ سکے۔

باطل نے جب اپنی جنگی چالیں بدل لیں تو امام نے بھی اپنی حکمت عملی تبدیل کی۔ جنگ تو رہے گی۔ لیکن اب تلوار سے نہیں ہوگی۔ الفاظ سے ہوگی۔ اگرچہ حکومت کی پابندیوں اور سختیوں کی وجہ سے لوگ امام کے گرد جمع نہیں ہو سکتے لیکن امام تو مسجد نبوی میں جاسکتے ہیں۔ جہاں حدیث کے درس دیئے جارہے ہیں وہاں تو بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ تو کہہ سکتے کہ یہ حدیث یوں نہیں ہے۔ میرے والد نے مجھ سے کہا۔ ان سے انکے والد نے کہا ان سے رسول اللہؐ نے کہا۔ امام وضع کی ہوئی احادیث کو روکرتے ہیں۔ اپنے سلسلے سے سنی ہوئی احادیث کی اشاعت کرتے ہیں۔ جو مسلمان مسجد میں نماز پڑھنے آتے ہیں۔ ان کے کان میں یہ باتیں بھی پڑتی ہیں۔ نشرعلوم الٰہیہ کا فریضہ بھی ادا ہو رہا ہے۔ اسلام کے خدوخال بدلنے کی کوششوں کو بھی ناکام بنایا جارہا ہے۔ خدا کے حضور دعائیں کی جارہی ہیں بلند آواز سے دعا کی جارہی ہے۔ روح کا سارا سوز گداز آواز میں سمٹ آیا ہے۔ کیا لحن ہے۔ لحن داؤدی اس پر فدا۔ لوگ ہمہ تن گوش ہیں۔ قلوب پوری توجہ کے ساتھ ان دعاؤں کو جذب کررہے ہیں۔ ابھی لوگ اپنے عقیدوں کا ذکر کررہے تھے۔ امام نے محسوس کیا کہ یہ عقیدے فاسد ہیں۔ غلط ہیں۔ غیراسلامی ہیں۔ انکی اصلاح کی ضرورت ہے۔ امام کی دعامیں اس عقیدے کی اصلاح مضمر ہے۔ امام کی دعائیں جو سنتا ہے محسوس کرتا ہے کہ یہ دعائیں تزکیہ نفس کا ذریعہ بھی ہیں۔ ذہن کی جلا بھی ہیں۔ جنت کا راستہ بھی ہیں۔ احیائے اسلام کا طریقہ بھی ہیں۔

ایسے عالم میں جبکہ حکومت وقت۔ نئے رجحانات لوگوں کے ذہنوں کو متاثر

کر چکے۔ مادہ پرستی کی دلدل میں ہر شخص گلے تک غرق ہے۔ روحانیت لوگوں میں سے مفقود ہو رہی ہے۔ لوگ طلب جنت پر طلب دنیا کو ترجیح دے رہے ہیں یہ دعائیں ہی ہیں جو اسلام کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

امام کے منصب کی ذمہ داریاں

امام زمین پر اللہ کا نائب ہوتا ہے۔ انسانوں پر خدا کی حجت ہوتا ہے انفس و آفاق کے لئے وسیلہ رحمت ہوتا ہے۔ ورق گیتی پر اسکی موجودگی ضروری، انسانوں پر اسکی معرفت لازم اور مخلوقات پر اسکی اطاعت فرض ہوتی ہے۔ وہ بندوں کے اعمال پر گواہ ہوتا ہے۔ امر خدا کا والی ہوتا ہے۔ خزینہ دار علم الہی ہوتا ہے۔ آسمانی صحیفوں کا وارث ہوتا ہے۔ وجود خدا کی دلیل ہوتا ہے۔ ہدایت کی علامت ہوتا ہے۔ کار نبوت کی تکمیل کرتا ہے۔ تنزیل رحمان کی صحیح ترین اور بر محل تاویل کرتا ہے۔ اسرار الہی کا امین ہوتا ہے۔ ہر آیت کی اپنے عمل سے تفسیر کرتا ہے۔ ہر سوال کا جواب دیتا ہے۔ ہر مسئلے کو حل کرتا ہے۔ ہر مشکل کو سلجھاتا ہے۔ ہر عقدے کو کھولتا ہے۔ ہر بات کی دلیل بتاتا ہے۔ اور ہر دلیل قرآن سے لاتا ہے۔ دین کا مرکز و محور ہوتا ہے۔ کشتی دنیا کا لنگر ہوتا ہے۔ اسکی ہر بات سے صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ ہر عمل میں نصیحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے علم کے رسوخ سے روحوں کو بالیدہ کرتا ہے۔ دلوں کو زندہ کرتا ہے۔ اور ذہنوں کو شک کی ظلمتوں سے نکال کر یقین کے نور کی سرزمین میں پہنچاتا ہے۔

امام کے منصب پر جو فائز ہو اسکی ذمہ داری ہے خدا کے نام کو اونچا کرنا۔ حق کو پہچنوانا۔ انسانی معاشرے کو مثالی معاشرے میں ڈھالنے کی جدوجہد کرنا۔ ظلم کو بیخ و بن سے اکھاڑنا۔ شیطانی طاقتوں کی سازش کو ناکام بنانا۔ اللہ کی بندگی کے مرکز پر تمام انسانوں کی جبینوں کو جھکانا۔ لوگوں کو نیکیوں کی طرف بلانا۔ برائیوں سے بچنے کی ہدایت کرنا۔ اور دنیا کے ہر انسان کے لئے اپنے اخلاق و کردار سے ایک اعلی ترین نمونہ پیش کرنا۔ اسی لئے امام صداقت، امانت، علم، طہارت، زہد، تقوی، حلم، شجاعت

سخاوت اور فصاحت و بلاغت میں پورے زمانے کا افضل ترین فرد ہوتا ہے۔ وہ معصوم عن الخطا ہے اور منصوص من اللہ بھی۔

اسکی جدوجہد کا مرکزی نقطہ ایک ایسے معاشرے کا قیام ہے جس میں بندے احکامات خدا کے مطابق عمل کرتے ہوں۔ جن اعمال سے انہیں روکا گیا ہے اسے ترک کر دیں۔ جن کا حکم دیا گیا ہے ان فرائض کو ادا کریں۔ جس معاشرے میں کوئی کسی پر ظلم نہ کرے۔ کوئی کسی کا حق غصب نہ کرے۔ لوگ صرف عقیدے اور طرز عبادت ہی کے لحاظ سے مسلمان نہ ہوں بلکہ ادائے حقوق کے لحاظ سے بھی خدا کی اطاعت کرتے ہوں۔ ہر شخص دوسرے کا حق ادا کرے۔ امیر خود غریبوں کا خیال رکھیں۔ اور جب دیں تو یہ سمجھ کر نہ دیں کہ ہم نے اس پر کوئی احسان کیا ہے۔ بلکہ یہ جان کر دیں کے خدا نے اسکا رزق ہمارے پاس بطور امانت رکھوایا تھا جو ہم نے پہنچا دیا۔

امام کی صرف کوششیں ہی اس سمت میں نہیں ہوتیں بلکہ اسکا ذاتی عمل بھی اس انداز فکر کی آئینہ داری کرتا ہے۔ اسکے کردار کو دیکھ کر دیکھنے والے کے دل میں وجود خدا کا یقین بڑھتا ہے۔ مومن کے دل میں خواہش ہوتی ہے کہ وہ اسکی تاسی کرے۔ امام ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرتا ہے۔ سوائے ظالم کے۔

اللہ کے نظام ہدایت میں امام نبی کا وزیر ہوتا ہے۔ وصی ہوتا ہے۔ ولی ہوتا ہے۔ جانشین ہوتا ہے۔ معین ہوتا ہے۔ ناصر ہوتا ہے۔ مددگار ہوتا ہے۔

رسول دین لاتا ہے۔ امام دین کو بچاتا ہے۔

رسول دین کی بنا ہے۔ امام دین کی بقا ہے۔

رسول کا کام بندوں تک ابلاغ شریعت ہے۔ امام کا کام اس شریعت کی

حفاظت ہے۔

رسول اللہ کی ہدایت لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ امام لوگوں کے اعمال خدا تک لے جاتا ہے۔

رسول کا مقابلہ کفار و مشرکین سے ہوتا ہے۔ امام کا معرکہ منافقین سے ہوتا ہے۔

رسول ان سے لڑتا ہے جو آیات کی تکذیب کریں۔ امام ان سے لڑتا ہے جو آیات میں تحریف کریں۔

رسول ان سے جہاد کرتا ہے جو اللہ کی تنزیل کو نہیں مانتے۔ امام ان سے جہاد کرتا ہے جو اسکی صحیح تاویل کو نہیں مانتے۔

رسول احکام لاتا ہے جن پر بندے عمل کریں۔ امام بندوں کے اعمال کی نگرانی کرتا ہے۔

امام کا فرض ہوتا ہے ہر حال میں اعلائے کلمۃ الحق کی جستجو کرنا۔ خدا کے نام کو اونچا کرنا۔ حق کی معرفت کروانا۔ انسانی معاشرے کو مثالی بنانے کی جدوجہد کرنا۔ ظلم کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا۔ شیطانی طاقتوں کی سازش کو ناکام بنانا۔ اللہ کی بندگی کے مرکز پر سارے انسانوں کی جبینوں کو جھکانا۔ لوگوں کو نیکیوں کی طرف بلانا۔ برائیوں سے بچانا ساری دنیا کے لئے اپنے اعلیٰ اخلاق اور عظیم الشان کردار سے لوگوں کے لئے ایک حسین ترین نمونہ عمل پیش کرنا۔ اور جب باطل شریعت میں ردو بدل کرنی چاہے، ترمیم و تنسیخ کرنی چاہے حلال کو حرام سے بدلنا چاہے اوامر اور نواہی کو زیروزبر کرنا چاہے تو امام کو اس سیلاب بلاخیز کو روکنا پڑتا ہے چاہے اسکے لئے خون رگ گلو دینا پڑے۔

جب دین پھیل رہا ہوتا ہے۔ خدا کی طرف سے نصرت آرہی ہوتی ہے۔ فتح پر فتح ہو رہی ہوتی ہے۔ اور لوگ خدا کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہوتے ہیں اس وقت باطل پرست یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر دائرہ اسلام میں داخل نہ ہوئے تو قتل کر دیئے جائیں گے۔ اسلئے کچھ جان کے خوف سے اور کچھ یہ دیکھ کر کہ مسلمان ہو جانے میں زیادہ فائدہ ہے۔ وہ اسلام لے آتے ہیں۔ مگر وہ دین کو اس طرح اپناتے ہیں کہ اس سے اصل مقصد دنیاوی فائدہ ہی رہتا ہے۔ جو کلمہ شہادت پڑھتا ہے اس کو بھی یہ سوچ کر قتل کر دیتے ہیں کہ مال غنیمت ملے گا۔ اور اگر کسی گروہ کی طرف بھیجے جاتے ہیں رسول کی طرف سے کہ اسلام کو ان کے سامنے پیش کرو تو یہ سوچ کر جلدی سے حملہ کر دیتے ہیں۔ اگر انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو پھر وہاں سے یہاں تک آنے کا کیا فائدہ جب لوٹ ہی نہ سکے۔ اور جب انہیں خبر ملتی ہے کہ غیر مسلم بڑی تعداد میں مسلمان ہو رہے ہیں تو حکم لکھ کر بھیجتے ہیں کہ انہیں مسلمان مت ہونے دو کیونکہ اگر سبھی غیر مسلم مسلمان ہو گئے تو جزیہ کہاں سے آئے گا۔ اور جزیہ نہ آئیگا تو عیش کہاں سے ہوں گے۔ یہ دین کو اس وقت تک گلے سے لگاتے ہیں جب تک ان کا کوئی مالی نقصان نہیں ہوتا۔ جہاں وہ انکی دنیا کی طلب کے آڑے آتا ہے وہیں دین کو رخصت کر دیتے ہیں۔ طالب علمی میں سارا دن قرآن پڑھتے ہیں اور جب یہ اطلاع ملتی ہے کہ اب حکومت ان کو ملنے والی ہے، قرآن سے صاف کہدیتے ہیں کہ ھذا فراق بینی و بینک یہ میری تیری آخری ملاقات تھی۔ اور تخت حکومت پر بیٹھتے ہی پہلی بات یہ کہتے ہیں کہ اگر مجھ سے کسی نے کہا کہ خدا سے ڈرو تو اس کی گردن تلوار سے اڑا دوں گا۔ ان کے دل حب دنیا اور طلب جاہ و مال کی دلدل میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ظاہراً وہ اسلام کا پیراہن زیب تن کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ظاہری اسلام بھی اسلیئے ہوتا ہے کہ اسکے بغیر وہ حکومت نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں اپنی بادشاہی پر خلافت رسول کا لیبل بھی تو چپکانا ہے۔ ان کی زبان پر لا الہ الا اللہ ہوتا

ہے لیکن دل اس کی گواہی نہیں دیتا۔ ان کی آستینوں میں بت نہیں بلکہ ان ذہنوں
میں بت خانے سجے ہوتے ہیں۔ نماز کی امامت ضروری سمجھتے ہیں مگر اسی قدر کہ کبھی
منگل کو جمعہ کی نماز پڑھا دیتے ہیں کہ آج تو امن ہے۔ جمعہ کو تیروں کی بوچھار میں
کون نماز پڑھے گا۔ کبھی لونڈی کو بھیج کر اس سے امامت کرا دیتے ہیں اور کبھی خود مئے
شبانہ کے سرور اور عیاشی سے آلودہ لباس میں جاکر دو کی جگہ چار رکعت پڑھا دیتے ہیں۔
کبھی ممبر پر بندر لے کر بیٹھتے ہیں۔ کتوں سے کھیلتے ہیں۔ ماں بہنوں سے نکاح کرتے
ہیں۔ شراب کو مباح قرار دیتے ہیں۔ شعائر اللہ اور شریعت اسلامی کا بہانگ دہل مذاق
اڑاتے ہیں اور رسول کو جھٹلاتے ہیں کہ نہ وحی آئی نہ فرشتہ اترا۔ بنی ہاشم نے سلطنت
کے لئے یہ کھیل بنایا تھا۔ کبھی قرآن کی آیت کی جان بوجھ کر غلط تاویل کر کے کسی
بے گناہ کے قتل کا فتویٰ دیتے ہیں اور کبھی قرآن پر تیر مارتے ہیں کہ جا خدا سے
شکایت کر دے۔ یہ شیطان جو بظاہر مسلمان نظر آتے ہیں اور جنکے دلوں پر مہریں لگی
ہوتی ہیں یہی منافق ہیں۔ یہ دین کے سب سے بڑے دشمن ہوتے ہیں۔ یہ بہادر
دشمن کی طرح علی الاعلان سامنے سے وار کبھی نہیں کرتے۔ یہ تو دین کی صفوں میں
گھس کر افتراق و انتشار پھیلاتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ یہ آیت نہیں ہے کہ اولوالامر
کی اطاعت کرو۔ بس اولوالامر کے معنی تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ قرآن میں
قربیٰ کی محبت کا حکم نہیں ہے۔ بس اتنی غلط فہمی پھیلاتے ہیں کہ نبی کی رسالت کا جو
اجر دینا ہے اسکے قربیٰ سے نہیں بلکہ اپنے ہی قربیٰ سے محبت کر لو۔ یہ دھوکا، فریب،
تلبیس عام لوگوں پر تو اپنا جادو چلا ہی دیتی ہے۔ یہ خود زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔
مسلمانوں کی جماعت کو پراگندہ و پریشان و منتشر کرتے ہیں۔ حقوق غصب کرتے ہیں
اور پھر جس کے حقوق غصب کرتے ہیں اسی کو تہہ تیغ کرتے ہوئے سادہ لوح عوام کو
بتاتے ہیں کہ قرآن میں ہے کہ زمین میں فساد مت پھیلاؤ۔ تو ہم اس کو اس لئے قتل
کر رہے ہیں کہ یہ فساد پھیلا رہا تھا۔

قرآن ہدایت ہے لیکن اگر کوئی قرآن صامت کے الفاظ کو غلط معنی پہنائے اس کا مفہوم الٹ پلٹ کر دے۔ آیت کا مصداق بدل دے اور ان آیتوں کو جو دنیا میں ایک عدل گستر معاشرہ قائم کرنے کے لئے اتری ہوں اپنی حکومت جابر مضبوط کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہے تو اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ مصحف ناطق میدان عمل میں آئے اور صرف خدا کی خوشنودی اور معاشرے میں قیام عدل کی خاطر اس گروہ سے دشمنی مول لے۔

اسے خود حکومت کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ وہ صرف ایک عادل حکومت کا خواہاں ہوتا ہے۔

جب ظلم حد سے بڑھتا ہے۔ باطل حکومت دین کا چہرہ مسخ کرنے لگتی ہے۔ ظالم کی حکومت کو سہارا دینے کے لئے جھوٹی حدیثیں وضع کی جاتی ہیں۔ قرآن کی آیات کا مطلب جان بوجھ کر غلط اور اپنی غرض کو پورا کرنے والا نکالا جاتا ہے۔ ہر ظلم کا جواز اسلامی احکامات سے دینے کی کوشش کی جاتی ہے تو امام حق حکومت باطل کی ان کارروائیوں کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے اٹھتا ہے۔ اسے مستقبل معلوم ہوتا ہے۔ اسے پیش آنے والے حوادث کا علم ہوتا ہے لیکن وہ نفس مطمئنہ بھی تو ہوتا ہے۔ وہ راضی برضائے الٰہی بھی تو ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا یقین کامل ہوتا ہے۔ وہ اصلاح احوال کے لئے نکلتا ہے اور اس جذبے کے ساتھ کہ **السعی منی و الاتمام من اللہ** کوشش کرنا میرا کام ہے۔ نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کوشش کا نتیجہ تو اچھا ہی نکلنا ہوتا ہے جس کوشش کا رخ خدا کی جانب ہو۔ یہاں فتح و ظفر کی تمنا نہیں کی جاتی۔ ملک و مال کی خواہش نہیں کی جاتی۔ اقتدار ان کا مطمع نظر نہیں ہوتا۔ یہاں صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ ان حالات میں میں اپنی ان ذمہ داریوں کو پورا کروں جو امام ہونے کے لحاظ سے مجھ پر عاید ہوتی ہیں۔ کوئی حق کا ساتھ دینا چاہتا ہے تو مجھے ان کی رہنمائی کرنی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جنھوں نے ہزاروں خط لکھے تھے خدا اور

رسول کے واسطے دے تھے کہ ہماری ہدایت و رہنمائی کے لئے تشریف لائیے وہ سب دوغلے ثابت ہوں گے۔ ان کے دل آل رسول کے ساتھ اور تلواریں ابن زیاد کے ساتھ ہوں گی۔ لیکن رسول کا نواسہ ہے ہدایت اس کا فرض منصبی ہے۔ اسے جانا ہے۔ اسے ہر ظلم سہنا ہے۔ ہر ستم اٹھانا ہے۔ ہر شقاوت کا سامنا کرنا ہے۔ بیٹوں، بھائیوں سب کا ماتم کرنا ہے۔ جو کچھ بھی اس کے پاس ہے وہ سب خدا کی بارگاہ میں نذر کرنا ہے اور اسی سے آس لگانی ہے جو ان کی آس ہے جن کا دنیا میں کوئی نہ ہو۔ اور زیر خنجر قاتل بھی اس کے لبوں سے امتِ جد کی بخشش کی دعا ہی نکلتی ہے۔

یہ جو جنگ لڑ رہا ہے یہ دنیاوی جنگ نہیں ہے۔ اس کا مقصد دین کو تباہ ہونے سے بچانا ہے۔ یہ جنگ اس لیے لڑی جا رہی ہے کہ باطل کو معلوم ہو جائے کہ خلق خدا پر جو ظلم وہ کر رہا ہے خلافت الہیٰ کو مطلق العنان بادشاہی کا روپ دے رہا ہے۔ جھوٹی حدیثوں سے اپنے اقتدار کو سہارا دے رہا ہے۔ وہ مال جو عام مسلمانوں کا حق تھا اس کو ذاتی شان و شکوہ اور عیاشی میں خرچ کر رہا ہے۔ جس مال سے ناداروں، غریبوں، محتاجوں، معذوروں کی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں اسے زرپوش غلاموں پر، بلند محلوں پر، لونڈیوں، کنیزوں پر اور اس فوج پر خرچ کیا جا رہا تھا جو آل رسولؑ کو تباہ کرنے کے لئے تیار کی جا رہی تھی۔

امام زین العابدینؑ کی کامیابیاں

امام زین العابدینؑ نے جنگ کربلا کی تکمیل کی۔ حق و باطل کی اس عظیم معرکہ آرائی کو اس کے منطقی انجام تک پہنچایا اور اس مقصد کو حاصل کیا جس کے لئے حسینؑ نے بے مثال قربانیاں دی تھیں۔ یہ مقصد تھا احقاق الحق۔ یہ ثابت کرنا کہ حسینؑ حق پر تھے۔ یزید غلط تھا۔ بلکہ یہ ثابت کرنا کہ آل رسول حق پر تھے اور جو جو بھی ان کے مقابلے پر آیا وہ غلط تھا۔ ہمیشہ آل رسول حق پر تھے۔ ہمیشہ ان کے مخالف غلط تھے۔

دنیا کامیابیاں حاصل کرتی ہے فوج کے بل پر۔ اقتدار کے بل پر۔ شان وشکوہ کے بل پر۔ دولت و ثروت کے بل پر۔ دنیا اپنی بات منواتی ہے لوگوں کی گردنوں پر تلوار رکھ کر۔ لوگوں کو مجبور کر کے یا لوگوں کے دامن مال وزر سے بھر کر۔ لوگوں کو منصب کا لالچ دے کر۔ لوگوں سے نقد و جواہر کے وعدے کر کے۔ لیکن شاید زین العابدینؑ اس دنیا کے بڑے لوگوں میں واحد انسان ہیں جس نے ساری کامیابیاں اس طرح حاصل کیں کہ وسائل کا نام ونشان تھا۔ ہم نوا خدا کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

زین العابدینؑ نے سطوت شاہی کو اس وقت لرزہ براندام کر دیا جب انکے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ پیر بیڑیوں سے فگار تھے۔ گردن میں طوق نے زخم ڈال رکھے تھے۔ بیماری اور مسافت کی وجہ سے پنڈلیاں سوجی ہوئی تھیں۔ کنبہ رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ باپ کا سر نوک نیزہ پر تھا۔ عورتیں بے مقنع و چادر تھیں اور چاروں طرف تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ کبھی دربار۔ کبھی بازار۔ کبھی زندان۔ کبھی ملعون حاکم باپ کے لب و دندان پر چھڑی لگا رہا ہے۔ کبھی اس طشت طلا میں جس میں باپ کا سر ہے بچی ہوئی شراب ڈال رہا ہے۔ سات سو کرسی نشین دربار میں موجود ہیں اور سب

مسلمان ہیں۔ اور کوئی نہیں کہتا کہ اے یزید یہ آل رسول کے ساتھ کیسا ظلم ہو رہا ہے۔ کسی میں غیرت و حمیت باقی نہیں ہے۔ اور جب زین العابدین نے کہا کہ اے یزید اگر تو اجازت دے تو میں منبر پر جا کر کچھ کہوں اور یزید نے اجازت نہ دی تو یزید کے بیٹے نے باپ سے کہا۔ اجازت دے دے۔ یہ تو بیمار ہے۔ بے کس ہے۔ یتیم ہے۔ مظلوم ہے۔ کمزور ہے۔ یہ آخر کیا کر سکتا ہے۔

یزید کے بیٹے کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ کیا کر سکتا ہے۔ یزید کو کچھ اندازہ تھا۔ اسے پتہ تھا کہ یہ علی کا پوتا ہے۔ یہ صاحب نہج البلاغہ کا پوتا ہے۔ اس کی فصاحت بے مثال ہے۔ اس کی بلاغت لاجواب ہے۔ اس کی دلیلیں مضبوط ہوں گی۔ اس کا لہجہ شجاعانہ ہوگا۔ قتل ہونا ان کے گھرانے کی عادت ہے۔ شہادت ان کے خاندان کا شرف ہے۔ یہ سر کٹا دیتے ہیں سر جھکاتے نہیں ہیں۔ ان کے سارے عزیز قتل ہو چکے لیکن ان کی ہمت وہی ہے۔ راہ خدا میں استقلال وہی ہے۔ پیروں میں چبھے ہوئے کانٹے، پشت پر لگے ہوئے تازیانے، مصائب، دھمکیاں...... سب مل کر بھی ان کے انکار کو اقرار میں نہیں بدل سکتے یہ شیروں کا گھرانہ ہے۔ یہ شاہی کے رعب میں نہیں آ سکتا۔ اگر بولنے کی اجازت مل گئی تو یہ شام کا دربار الٹ دینگے۔ صداقت ان کی زبان پر جب آئے گی تو وہ شعلہ بن جائے گی جو میری حکومت کو جلا کر خاک کر دے گا۔ یہ ذہنوں کو بدل دیں گے۔ دلوں کو برما دیں گے۔ لب ظلم کے خلاف نعرہ کناں ہو جائیں گے۔ آنکھیں آنسوؤں سے چھلکنے لگیں گی۔

اور یہی ہوا۔

دنیا میں جو بھی ظالم ہیں، جابر ہیں، آمر ہیں، مطلق العنان بادشاہ ہیں سبھی طاقت حکومت اور اقتدار کے نشے میں دوسروں کی جانوں سے کھیلتے ہیں۔ جس کو حکومت کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں اس کی گردن اڑا دیتے ہیں۔ جس سے ناراض ہوتے

ہیں اسے قتل کرا دیتے ہیں اور قتل کو چھپا دیتے ہیں۔ لوگوں کو پتہ نہیں چلنے دیتے کہ کسے قتل کیا گیا، کیوں قتل کیا گیا اور کس کے حکم سے قتل کیا گیا۔ پھر اگر قتل سے لوگ واقف ہو جاتے ہیں تو اس قتل کو جائز قرار دیتے ہیں۔ فتوے لے آتے ہیں کہ یہ قتل ضروری تھا۔ حیلے بہانے جواز سب تلاش کر لیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب اس قتل پر کوئی پوچھ گچھ نہیں ہو گی۔ کوئی اس خون کا دعویٰ نہیں کرے گا۔ اپنے لگائے ہوئے جھوٹے الزامات کو سچ ثابت کرنا چاہتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ خون ناحق کا داغ ان کے دامن سے چھٹ گیا۔ یہ رسم اہل اقتدار میں ہمیشہ سے ہے اور تیرہ سو سال پہلے بھی تھی۔

یزید نے دونوں کوششیں کر کے دیکھیں۔ اور زین العابدین نے دونوں کوششیں ناکام بنا دیں۔ یزید کو پتا تھا کہ وہ حسین کو قتل کر سکتا ہے حسین کے احترام کو قتل نہیں کر سکتا۔ حسین کے جسد خاکی کو مٹا سکتا ہے لیکن لوگوں کے دلوں میں حسین کا جو مقام ہے اسے نہیں مٹا سکتا۔ اس لئے پہلے اس نے اس قتل کو چھپانا چاہا۔ اہل بیت کے لٹے ہوئے قافلے کو کربلا سے کوفے اور کوفے سے شام ان راستوں سے لے جایا گیا جو غیر آباد تھے۔ جہاں آبادیاں تھیں وہاں لوگوں کو صرف یہ بتایا گیا کہ ایک باغی تھا۔ اس نے امیر شام پر خروج کیا۔ امیر کی فوج نے اسے قتل کر دیا۔ یہ اسکی اولاد ہے۔ اس کے گھر والے ہیں جنھیں قیدی بنایا گیا ہے۔ اور بادشاہ خوش ہے اس لئے عوام کو بھی خوش ہونا چاہیے۔ جشن منانا چاہیے۔ اچھے لباس پہننا چاہئیں۔ لوگوں نے جو عید منائی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ انہیں پتہ ہی نہیں چلنے دیا گیا تھا کہ یہ کون ہیں۔

سید سجاد نے جھوٹ کے اس اندھیرے کو مٹایا۔ اس سر کا تعارف کرا کے جو نوک نیزہ پر قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔ قیدی جب آئے تو کوفے میں جشن کا سماں

تھا۔ لیکن زین العابدینؑ اور انکی پھوپھی زینبؑ نے اہل کوفہ کے دلوں میں تہلکہ ڈال دیا۔ لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ حسینؑ کی مظلومیت کے ذکر نے قیامت برپا کر دی۔ باطل کا چہرہ بے نقاب ہو گیا۔ ظالم رسوا ہو گئے۔ فریب کا پردہ چاک ہو گیا۔ ابلیسیت ناکام ہو گئی۔

تلوار کی جنگ تو فرات کے کنارے ختم ہو گئی تھی لیکن حق و باطل کی کشمکش باقی تھی۔ اب محاذ جنگ کوفہ تھا، دمشق تھا، دربار تھا، بازار تھا۔ جہاں ہجوم ہے، جہاں مجمع ہے، جہاں سننے والے میسر ہیں، جہاں پوچھنے والے موجود ہیں۔ ہر جگہ بتایا جا رہا ہے، ہر ایک کو سمجھایا جا رہا ہے۔ یہ کسی باغی کا سر نہیں ہے یہ نواسہ رسول کا سر ہے۔ یہ جگر بند بتول کا سر ہے یہ وہ لب و رخسار ہیں جنکو رسول عربیؐ چومتے تھے۔ یہ بے مقنع و چادر عورتیں ترک اور دیلم کی کنیزیں نہیں ہیں۔ یہ اہل بیتؑ ہیں۔ آل رسولؐ ہیں محمدؐ کے گھر والے ہیں۔ اسی محمدؐ کے جس کا کلمہ تم لوگ پڑھتے ہو۔ اور یہ بھی سن لو کہ حسینؑ کا جرم کیا تھا حقانیت، صداقت، خوف خدا، دین سے وابستگی۔ یہ حکومت جو ظالم کی حکومت ہے، شخصی حکومت ہے، جابر کی حکومت ہے۔ جسے دین سے مذہب سے، اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہے یہ جو گناہ گاروں کی حکومت ہے۔ یہ جو لوگوں کے حقوق تلف کرنے والی حکومت ہے حسینؑ اس حکومت کے حامی نہیں بن سکتے تھے۔ اس طریقہ حکومت پر جو غیر اسلامی تھا۔ غیر اخلاقی تھا۔ اس پر حسینؑ ابن علیؑ اپنی مہر توثیق نہیں لگا سکتے تھے۔ کیونکہ دین کا ایک ہی تو سہارا تھا حسینؑ۔ دین کو ایک ہی ہستی پر تو ناز تھا سبط رسولؐ۔ اگر وہ بھی بیعت کر لیتا، اگر وہ بھی کہہ دیتا کہ یہ ٹھیک ہے، یہی اسلام ہے۔ تو پھر اسلام کہاں جاتا۔ اس لئے حسینؑ نے موت کی تلخی کو گوارہ کر لیا۔

زین العابدینؑ کے خطبوں نے، زینبؑ و کلثومؑ کی تقریروں نے لوگوں کے

دل چھید دیے، سینوں میں آگ لگا دی۔ ضمیر بیدار کر دیے، حمیت جگا دی، انسانیت زندہ کر دی۔ لوگ پہچان گئے کہ منافق کون سا گروہ ہے، خون ناحق سے کن کے ہاتھ آلودہ ہیں گناہ گار کون ہیں، ظالم کون ہیں، خدا کے عذاب کے مستحق کون ہیں۔ اہل ارض و اہل سماوات کی لعنت کے سزا وار کون ہیں۔

فوج یزید نے تو سوچا تھا کہ تشہیر سے اہل حرم کی بے عزتی ہو گی۔ لیکن ان کی تدبیر خاک میں مل گئی۔ ان کا منصوبہ تباہ ہو گیا۔ آنسوؤں کی سیاست نے بساط الٹ کے رکھ دی۔ حقیقت لوگوں پر منکشف ہو گئی۔ زمانے میں ہر ایک کو پتہ چل گیا کہ یہ باغ رسالتؐ تھا جسے یزید نے تاراج کر دیا۔ یہ شجرۃ النبوۃ تھا جسے خدا کے دشمنوں نے کاٹ ڈالا۔ یہ اللہ والے تھے جنہیں شیطان کے پیروکاروں نے شہید کر دیا۔ عام آدمی کا قتل ناحق نہیں چھپتا۔ حسینؑ کا قتل ناحق کیسے چھپ جاتا۔ اب یزید کیا کرے۔ کیسے اپنے کو صحیح ثابت کرے۔ کیسے قتل حسینؑ کے الزام سے بچے۔ ابھی شیطانیت کے پاس ایک تدبیر باقی ہے۔ وہ اس قتل کو جائز ثابت کر دے۔ یزید قرآن کی آیت پڑھتا ہے۔ جن لوگوں پر مصیبتیں آئیں وہ ان کے اعمال کی بدولت آئیں۔ یہ مصیبتیں انہوں نے خود کمائیں تھیں۔ یزید کہنا چاہتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ حسینؑ نے بغاوت کی۔ اگر وہ بغاوت نہ کرتے۔ یزید کی بیعت کر لیتے تو قتل نہ کیے جاتے۔

یزید نے قتل حسینؑ کا جواز ایک آیت قرآنی سے دیا ہے۔ یہ منافقوں کا سب سے پر اثر حملہ ہے۔ طاغوت کا سب سے بڑا فریب ہے۔ ابلیسیت کا سب سے بڑا دھوکہ ہے۔ لیکن یزید نے یہ آیت کس کے سامنے پڑھنے کی جرات کی ہے۔ جو قرآن ناطق ہے۔ جو محافظ اسلام ہے۔ جو معنی قرآن ہے۔

سید سجادؑ یزید کو للکارتے ہیں۔ قید میں ہیں لیکن ہیں تو خدا کے شیر کے پوتے۔ جس کے گھر میں قرآن نازل ہوا اسکے نواسے۔ جو شہر علم کا در تھا اس کے

لخت دل۔

او یزید! تو نے غلط کہا ہے۔ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں ہے۔ ہمارے بارے میں خدا نے جو نازل کیا ہے وہ یہ ہے کہ۔ زمین پر جتنی مصیبتیں نازل ہوتی ہیں وہ سب ہم نے لوح محفوظ میں لکھ دی ہیں قبل اس کے کہ تمہیں پیدا کریں۔ تاکہ جو کچھ تمہیں نہیں ملتا اس پر آزردہ نہ ہو اور جو چیز تمہیں مل گئی اس پر خوشیاں نہ مناؤ۔ اے یزید ہم ہیں جنھوں نے اس آیت پر عمل کیا۔ اور ہر حال میں قضائے الٰہی پر خوشنود رہے۔ نہ کسی کے فوت ہونے پر ملال کیا نہ کسی چیز کے ملنے پر مسرور ہوئے۔

کس فصاحت و بلاغت کے ساتھ کس پر اثر انداز کیسی محکم دلیلوں کے ساتھ کس دلنشین پیرائے میں زین العابدینؑ نے حق کا اظہار کیا۔ حسینؑ ابن علیؑ کی مظلومیت کو آشکار کیا۔ اپنی تمام طاقت، دولت، حکومت، ستم گری، سفاکی اور ظلم و بربریت کے باوجود یزید قتل حسینؑ کو نہ چھپا سکا، نہ اس کو جائز ثابت کر سکا۔ اور زین العابدینؑ نے تنہا ہونے کے باوجود، بے سہارا ہونے کے باوجود، قیدی ہونے کے باوجود، بیمار ہونے کے باوجود، کمزور ہونے کے باوجود، ظالموں کے نرغے میں گھرے ہونے کے باوجود اخلاقی فتح حاصل کر لی۔

انھوں نے ایک ویرانے میں لڑی جانے والی اور چند گھنٹوں میں ختم ہو جانے والی جنگ کو اپنی جاں گداز تقریروں سے آنسوؤں میں ڈوبے خطبوں اور دل میں اتر جانے والی گفتگو سے تاریخ انسانی کا ایک انتہائی متاثر کن حصہ بنا دیا۔ ایسا حصہ جس سے مستقبل میں شروع ہونے والی مظلوموں کی تمام تحریکیں جوش و ولولہ اور جذبہ حاصل کرتی رہیں گی۔ زین العابدینؑ نے صرف حسینؑ کی مظلومیت ہی آشکار نہیں کی۔ انھوں نے ظالموں کو رسوائیوں کی دلدل میں بھی غرق کر دیا۔ انھوں نے

ساری دنیا کی لعنتوں کی کالک شمر و یزید و ابن سعد و خولی و ابن زیاد کے چہروں پر مل دی۔

یزید نے حسینؑ کو قتل کر کے سمجھا کہ وہ جنگ جیت گیا ہے۔ اہل بیتؑ کو شہر شہر پھرا کے سمجھا کہ انکی بے عزتی ہو گئی۔ دنیا کا تصور عزت یہی ہے کہ جو تخت پر بیٹھا ہے وہ عزت والا ہے۔ جو قیدی دست بستہ اسکے سامنے کھڑے ہیں ان کی کوئی عزت نہیں۔ لیکن خدا نے قرآن میں عزت کا معیار حکومت کو، بادشاہی کو، اقتدار کو، اختیار کو، دولت کو زر و جواہر کو، سونے چاندی کو، محلوں کو، فوج کو، غلاموں اور کنیزوں کے ہجوم کو قرار نہیں دیا۔ خدا نے کہا ہمارے نزدیک صرف وہ محترم ہے جو صاحبِ تقویٰ ہے۔ اور حسینؑ سے زیادہ صاحب تقوی کون ہو گا۔ اسی لئے زین العابدینؑ نے کہا۔ الحمدللہ۔ مصیبتوں کے اس بے پناہ ہجوم میں خدا کا شکر ادا کرنا۔ یہ اہل بیتؑ ہی کا حوصلہ ہے۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمیں عزت دی ہمارا گھرانہ نبوت کا گھرانہ ہے۔ وحی کا گھرانہ ہے۔ خلق عظیم کا گھرانہ ہے۔ حق و صداقت کا گھرانہ ہے۔ تیرے پاس زر ہے اور تیرے فخر کے لئے کافی ہے۔ لیکن ہمارے پاس تقوی ہے۔ نیکی ہے۔ سچائی ہے۔ قناعت ہے۔ فقر ہے۔ تیرے پاس دنیا ہے۔ اور چار دن کے لئے ہے۔ ہمارے پاس عاقبت ہے آخرت ہے اور ہمیشہ کے لئے ہے۔ دنیا کے مصائب سے ہماری تحقیر نہیں ہوتی۔ یہ ہماری آزمائش ہے اور پیش خدا ہمارے مرتبے میں اضافے کا سبب ہے۔

دنیا نے یہ منظر کبھی نہیں دیکھا ہو گا کہ ایک بادشاہ تخت پر بیٹھا ہے اور رسن بستہ قیدی اسے حقارت سے دیکھتا ہے اور اپنی حیثیت پر فخر کرتا ہے۔ میں اس کا فرزند ہوں جو پیاسا شہید کیا گیا۔ میں اس کا فرزند ہوں جس کے اہل حرم کو قید کر کے بازاروں میں پھرایا گیا۔

یہ مصیبتوں کا اعلان نہیں ہے۔ یہ فتح کا اعلان ہے۔ حسینؑ کی فتح کا اعلان۔ خدا نے ہم اہل بیتؑ کو پانچ ایسی صفتیں عطا کی ہیں جن کے ذریعے ہم اس کی تمام مخلوق میں ممتاز ہیں۔ خدا کی قسم ہمارے ہی گھر میں فرشتوں کی آمد رہی ہے۔ ہم ہی معدن نبوت و رسالت ہیں۔ ہماری ہی شان میں قرآن کی آیتیں اتری ہیں۔ ہم ہی نے لوگوں کو ہدایت کی۔ ہم علم کا سرچشمہ ہیں۔ ہمارے مرتبے زمین و آسمان میں بلند ہیں۔ اگر ہم نہ ہوتے تو خدا دنیا کو خلق نہ فرماتا۔ ہر فخر ہمارے فخر کے سامنے پست ہے۔ روزِ قیامت ہمارے دوست سیر و سیراب اور دشمن ہلاک و معذب ہوں گے۔

قیدی فخر کر رہا ہے اور بادشاہ یا اس کے مصاحبوں میں کسی کی مجال نہیں جو اسے ٹوک دے۔ یہ صداقت کا سیلِ بے پناہ ہے۔ یہ کسی کے روکے نہیں رک سکتا۔

زین العابدینؑ نے سر دربار ثابت کر دیا کہ ان کے باپ نے اسلام کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ اور اسلام بچ گیا۔ اس لئے وہ قتل ہونے کے باوجود جیتے ہوئے ہیں۔ ان کا گھر لٹ گیا۔ لیکن دین تو باقی ہے۔ یہی ان کی کامیابی ہے۔

طلحہ کے بیٹے ابراہیم نے جب شام کے بازار میں امامؑ سے کہا "دیکھا تم نے کون غالب رہا۔ تو امامؑ نے فرمایا ذرا انتظار کر۔ ابھی نماز کا وقت ہونے والا ہے۔ اذان ہوگی۔ پھر تجھے خود پتہ چل جائے گا کہ کون غالب رہا۔

فرق صرف ذہنیت کا ہے۔ لوگ دنیا کے پیمانے سے کارکردگی ناپتے ہیں۔ لیکن اللہ والوں کا معیار ہی الگ ہوتا ہے۔ انھیں پتہ ہے کہ عزت وہی ہے جو خدا دیتا ہے۔ وہ نہیں جو تخت و تاج سے حاصل ہوتی ہے۔ غلبہ وہی جو خدا عطا کرتا ہے۔ وہ نہیں جو فوجوں کے سہارے حاصل ہوتا ہے۔

سید سجادؑ کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ انھوں نے وہ کام مکمل کر دیا

جس کا حسینؑ نے آغاز کیا تھا۔ انھوں نے دنیا پر حسینؑ کی حقانیت اور انکے اقدام کی اہمیت ثابت کر دی۔ اور دنیا سے منوا دیا کہ

دنیا یہ نہ ہوگی مگر اسلام رہے گا

شبیر بہرحال تیرا نام رہے گا

سید سجادؑ کی دوسری کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے حسینؑ کی مظلومیت کو دنیا پر روشن کرنے کے ساتھ ساتھ یزید کو تاریخ کے ایوان میں ہمیشہ کے لئے رسوا کر دیا۔ اور وہ بھی ایسا کہ

لفظ یزید داخل دشنام ہو گیا

جب یزید نے کہا کہ حسینؑ کو خدا نے قتل کیا تو زین العابدینؑ نے جواب دیا حسینؑ کو خدا نے نہیں بلکہ تیری فوج نے قتل کیا ہے۔ خدا اس پر لعنت کرے جس نے میرے باپ کو شہید کیا۔

کیا آج تک کسی جابر بادشاہ کو کسی قیدی نے ایسا جواب دیا ہے؟

مظلومیت بھی عجیب معجزے دکھاتی ہے۔ وہ وقت بھی آیا جب یزید نے ان سرداروں کو جمع کیا جو قتل حسینؑ میں شریک تھے۔ اور ان سے کہا سچ بتاؤ کس نے حسینؑ کس شہید کیا۔ اور جس نے حسینؑ کو شہید کیا اس پر لعنت۔ یزید سارا الزام ابن مرجانہ پر رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا خدا ابن مرجانہ پر لعنت کرے۔ پھر لوگوں سے پوچھا تمھارا کیا خیال ہے۔ کیا میں نے حسینؑ کو قتل کیا ہے یا ان کے قتل کا حکم دیا ہے سب نے کہا۔ خدا کی قسم۔ حسینؑ اور اہل بیت حسینؑ کو اس شخص نے قتل کیا ہے جس نے فوجی جھنڈے تیار کرائے۔ قتل حسینؑ کے لئے مال خرچ کیا اور حسینؑ پر لشکر کشی کی۔ یزید نے پوچھا وہ کون ہے؟ قیس نے جواب دیا وہ تو ہے۔

یزید اپنی زبان سے قاتل حسینؑ پر لعنت کرتا ہے۔ اور وہ لوگ جو قتل حسینؑ میں شریک تھے اسی کو قاتل ٹھہراتے ہیں۔ یزید سر حسینؑ کو سامنے رکھتا تھا اور اپنے منہ پر طمانچے مار کر کہتا تھا میں نے حسینؑ کو قتل کر کے کیا پایا۔

یزید کے علاوہ جتنے لوگ قتل حسینؑ میں شریک تھے ان میں سے ہر ایک پہلے تو چاہتا کہ اسے قاتلان حسینؑ کی صف اول میں جگہ ملے لیکن چند ہی دنوں بعد ہر ایک قتل حسینؑ کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنے لگا۔ اس لئے کہ اسیروں کے خطبوں نے شام میں حشر برپا کر دیا تھا۔ لوگ جیسے سوتے سے جاگ اٹھے تھے۔ انھوں نے بازار بند کر دیے تھے۔ امام حسینؑ کی صف عزا بچھا دی تھی اور اہل بیتؑ کے مصائب کے تذکرے میں مشغول ہو گئے تھے۔ زمانے کا رنگ بدلتا ہوا نظر آرہا تھا جس سے یزید بھی خائف تھا اور دوسرے قاتلان حسینؑ بھی۔

جب یزید کی بیوی ہند کو پتہ چلا کہ یہ قیدی حسین کے اہل حرم ہیں تو اس نے یزید کو بہت برا بھلا کہا۔ زندان میں اہل بیتؑ کے پاس گئی۔ ان کی تکریم کی۔ انھیں رہا کرا دیا۔

یزید کے بیٹے معاویہ کو جب یزید کے مرنے کے بعد تخت حکومت پیش کیا گیا تو اس نے جامع مسجد دمشق کے منبر پر جا کر کہا۔

خلافت کے حقدار علیؑ تھے۔ ہمارے دادا نے ناحق ان کے ساتھ جھگڑا کیا۔ آخر اسے موت آگئی اور اب وہ اپنے گناہوں کی سزا قبر میں بھگت رہا ہے۔ اس کے بعد میرے باپ نے سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ وہ بھی کسی طرح اس کا اہل نہ تھا۔ اس نے دختر رسولؐ کے فرزند کو ناحق قتل کیا۔ اور خاندان کو خاک میں ملایا۔ سو وہ بھی اپنی قبر میں مبتلائے عذاب ہے۔ اس سے زیادہ ہمارے لئے خسارے کا باعث اور کیا ہو گا اور اس سے بڑھ کر اور کیا سزا ہو سکتی ہے کہ عترت رسولؐ کو قتل

کر کے شراب کو مباح قرار دے کر خانہ خدا کو خراب کر کے دائمی عذاب مول لیا۔ پس جب اس سلطنت میں کوئی مزہ نظر نہیں آتا تو میں تلخی کیوں گوارا کروں۔ اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ خدا کی قسم اگر دنیا اچھی ہے تو ہم اس کا لطف اٹھا چکے اور اگر بری ہے تو ہمارے خاندان کے لئے اتنا ہی کافی ہے جو ہو چکا۔

معاویہ ابن یزید یہ کہہ کر محل میں چلا گیا اور تین ماہ تک نہ نکلا۔ یہاں تک کہ مر گیا۔ یہ ہے حق کا فروغ۔ حسینؑ کے ہر قاتل نے قتل حسینؑ کا الزام دوسرے پر دھرا۔ حسینؑ کے ہر قاتل نے قاتلان حسینؑ پر لعنت کی۔ یزید نے قاتلان حسینؑ پر لعنت کی۔ اس کی بیوی نے اس کو برا بھلا کہا۔ شرمندہ کیا۔ لعنت ملامت کی۔ اور بیٹے نے مستحق عذاب ٹھہرایا۔ ساری امت مسلمہ نے علانیہ یزید کو فاسق و فاجر کہا۔ یہ ہے علی ابن حسینؑ کی کامیابی۔

اسی شہر میں جس کے بازاروں میں آل رسولؐ کو قیدی بنا کر پھرایا گیا تھا۔ صرف ایک سال کے عرصے کے بعد حسینؑ کی مجلس عزا منعقد ہوتی ہے۔ جب یزید نے اہل بیتؑ کو رہا کیا اور یہ اختیار دیا کہ چاہے یہاں رہیں چاہے مدینے چلے جائیں تو جناب زینبؑ نے کہا ہم جی بھر کے بھائی کو رو نہیں سکے۔ تو ہمیں ایک گھر دیدے جہاں مجلس عزا منعقد کریں۔ چنانچہ دارالحجازہ میں ایک مکان اہل بیتؑ کو دیدیا گیا جہاں سات دن تک دمشق کی عورتیں آتی رہیں اور امام مظلومؑ کا پرسہ غم خوار بہن کو دیتی رہیں۔

امام زین العابدینؑ کا قائم کیا ہوا مجلس عزا کا یہ ادارہ تیرہ سو سال سے قائم ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گا اور امام کی حقانیت کا ثبوت دیتا رہے گا۔

دنیا والوں کی حکومت چند روزہ ہوتی ہے اور تھوڑے سے علاقے پر ہوتی ہے۔ اللہ والوں کی حکومت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہوتی ہے اور ساری دنیا پر ہوتی ہے۔

دنیا کے کونے کونے میں حسینؑ کو یاد کیا جاتا ہے۔ آنسو بہائے جاتے ہیں۔ ماتم ہوتا ہے۔ سینہ کوبی کی جاتی ہے۔ علم ذوالجناح اور تعزیوں کے جلوس نکلتے ہیں۔ زنجیریں اور قمع لگائی جاتی ہیں۔ کیا دنیا میں کسی کی موت اس عظیم الشان پیمانے پر منائی جاتی ہے۔ اس عزائے حسینؑ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ ظلم کے خلاف احتجاج ہے۔ مجلس احتجاج ہے۔ نوحہ خوانی احتجاج ہے۔ ماتم احتجاج ہے۔ حشر تک لوگ اس ظلم کے خلاف احتجاج کرتے رہیں گے۔ اور قیامت تک لوگ حسینؑ کے دربار میں مرثیوں، نوحوں، اشکوں، آہوں اور صلواۃ و سلام کے نذرانے پیش کرتے رہیں گے۔ یہ کس کی کامیابی ہے؟ علی ابن الحسینؑ کی۔ یہ کس کی جاں فشانیوں کا ثمر ہے۔ امام زین العابدینؑ کی۔ انھوں نے عزاداری کو زندہ جاوید کر دیا۔ جو نام حسینؑ کی بھی بقا ہے اور اسلام کی بھی۔

آج جو ہر جگہ سجدہ گاہ کربلا کی مٹی ہوتی ہے۔ تسبیحیں خاک شفا کی ہوتی ہیں یہ بھی امام کا عطیہ ہے۔ جناب فاطمہؑ کی تسبیح دھاگوں کی بنی ہوئی تھی جس میں گرھیں لگی ہوئی تھیں۔ اور سجدہ گاہ جناب حمزہؑ کی قبر کی مٹی تھی۔

علم پھیلانا بھی امام کے فریضوں میں سے ایک بہت اہم فریضہ ہوتا ہے۔ امام زین العابدینؑ نے نشر علوم کا فریضہ اس حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ جو انکے پاس پہنچ گیا اس نے ہدایت پائی۔ شک مٹ گئے۔ شبہات غائب ہو گئے۔ الجھنیں ختم ہو گئیں۔ عقیدہ مضبوط ہو گیا۔ نیت خالص ہو گئی۔

امامؑ نے اپنے اثر و نفوذ کو معاشرے کی بہتری کے لئے استعمال کیا۔ تاکہ تقویٰ پھلے پھولے۔ نصیحت قبول ہو۔ سعادت حاصل ہو۔ لوگوں میں نیکی وقار پائے۔ بدی کو برا سمجھا جائے۔ لوگ منافقوں سے کراہت کریں۔ ظلم سے نفرت کریں۔ روحانیت کے رجحان کو تقویت ہو۔ خوف الٰہی پروان چڑھے۔ لوگ مادہ پرستی کی دلدل

سے نکلیں۔ جنت کی راہ پر چلیں۔ نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت کریں۔
صداقت سے کام لیں۔ مذہب کی روح پر عمل کریں۔

امام کے کردار نے نخوتِ شاہی کو خبردار کر دیا کہ جو برائی چاہے کرو ہم سے کوئی مطلب نہیں۔ لیکن اسے اسلام نہ کہنا۔ بس یہی حد فاصل ہے۔ جو چاہے کرتے رہو۔ تم اپنے اعمال کے خود جواب دہ ہو۔ لیکن اگر تم نے اپنے جرم کو، غلطی کو، قصور کو، خطا کو، گناہ کو، من مانی کو اسلام کہا تو پھر ہمیں میدان میں آنا پڑے گا۔ کیونکہ ہم اسلام کے محافظ ہیں۔ رکھوالے ہیں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ دین کے حقیقی خدوخال باقی رہیں۔ حق اور باطل خلط ملط نہ ہوں۔ تم ظلم بھی کرو۔ اس پر پردہ بھی ڈالو۔ لیکن یہ مت کہو کہ یہ خدا نے کیا ہے۔ خدا بے شک قادر ہے قدیر ہے، مالک کل ہے، پروردگار ہے لیکن اس نے تمھیں ارادے میں آزاد پیدا کیا ہے۔ اختیار دیا ہے اور قرآن میں کہہ بھی دیا ہے کہ چاہے کفر کرو چاہے شکر کرو۔ چاہے اس کی نعمتوں کو مان لو۔ چاہے جھٹلاؤ۔ اور اس نے دوزخ بھی بنائی ہے۔ جنت بھی بنائی ہے۔ اور عقل بھی دی ہے۔ اور یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ جنت نیکوکاروں کے لئے ہے اور دوزخ بداعمالوں کے لئے ہے۔

علی ابن الحسینؑ نے جھوٹی حدیثوں کو رد کیا۔ سچی حدیثوں کو نشر کیا۔ آیات قرآنی کی صحیح تاویل ہم تک پہنچائی تاکہ حق قائم و دائم رہے۔ دین باقی رہے۔ خدا کا نام اونچا رہے۔ شریعت اسلامی کے اصلی خد وخال پہچانے جائیں۔ احکامات میں رد و بدل نہ ہونے پائے۔ ترمیم و تنسیخ نہ کی جائے۔ حرام و حلال کو منقلب نہ کیا جائے۔

یہ انھیں کی ساری زندگی کی کاوشوں کا حاصل ہے کہ آج ہم برے کو برا اور اچھے کو اچھا کہتے ہیں۔ نیکی کو پسند کرتے ہیں۔ بدی سے نفرت کرتے ہیں۔ ظالم پر

لعنت بھیجتے ہیں۔ مظلوم کی حمایت کرتے ہیں۔

زندگی کی اعلی قدروں کا ہمارے معاشرے میں موثر اور فعال ہونا علی ابن الحسینؑ ہی کا صدقہ ہے۔

سوانحی خاکہ

رسول آخر کے محبوب شہر مدینے میں خوشی، مسرت اور شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ محلہ بنی ہاشم میں تو یہ مسرت دوچند تھی۔ کیونکہ آج امام حسین کے گھر میں ایک فرزند کی ولادت ہوئی تھی۔ ایران کی شاہزادی شہربانو کو اس نونہال گلستان رسالت کی ماں بننے کا شرف حاصل ہوا تھا جو اپنے عہد کا بہترین خلق اور برگزیدہ ترین انسان کہلانے والا تھا۔

جس گھر میں جد کے طور پر علی جیسی دیومالائی حیثیت رکھنے والی عظیم الشان شخصیت موجود ہو وہاں نومولود کا نام دادا کے نام پر ہی رکھا جانا چاہئے۔ لہٰذا امام حسین نے بچے کا نام اپنے والد گرامی کے نام پر علی رکھا۔۔۔ علی ابن الحسین ابن علی ابن ابی طالب۔

جس تاریخ کو اس مولود بابرکت نے اپنی پیدائش کے حوالے سے تاریخ انسانی میں فضیلت و اہمیت عطا کی وہ ۱۵ جمادی الاول تھی۔ سن ہجری تھا ۳۸ اور عیسوی سن تھا ۶۵۸۔ یہ خلافت اسلامی کا زرین نگار ترین دور تھا۔ دنیاوی اقتدار کی زمام علی ابن ابی طالب کے مبارک ہاتھوں میں تھی۔ ★

یہ بچہ جو رسول کے خلق عظیم کا وارث، علی کی آنکھوں کی ٹھنڈک، حسین کا میوہ دل، شہربانو کے کلیجے کا ٹکڑا، بنی ہاشم کی آنکھ کا تارا اور یثرب کا جگمگاتا ہوا ستارہ تھا تاریخ کے کشور عظیم میں امام زین العابدینؑ کے نام سے مشہور ہوا۔

★ مختلف کتابوں میں ۱۵ جمادی الاول کے علاوہ پیدائش کی مختلف تاریخیں دی ہوئی ہیں مثلاً ۱۵ جمادی الثانی بروز جمعہ۔ ۵ شعبان جمعرات بوقت ظہر۔ ۵ رجب۔ ۹ شعبان بروز جمعہ بوقت ظہر۔ بعض نے سن ۳۸ کے بجائے ۳۶ بھی لکھا ہے۔

سیرت کی کتابوں کے صفحات نے علی ابن الحسین کی ۵ کنیتیں محفوظ کی ہیں۔ ابوالقاسم، ابو محمد، ابو عبداللہ، ابوالحسن اور ابن الحسین۔

اس گھرانے کے چشم و چراغ نے جس کا فخر خدا کی معرفت تھی اور جس کی شناخت پروردگار کی عبادت تھی خراج عقیدت کے طور پر اہل دنیا سے متعدد خطابات و القابات پائے جن میں زین العابدین، زین الصالحین، زین العبا، سید سجاد، سید الساجدین، ذوالشفنات، ابن الخیرتین، آدم آل محمد، ابوالائمہ، البکا، زاہد، عابد، صابر، ذکی، طاہر، امین، ثانی آدم، سید التابعین، سید الزہاد، سید العابدین، سید العارفین، امام رابع اور محرالعبید زیادہ مشہور ہیں۔ واقعہ کربلا کے حوالے سے آپ کو بیمار کربلا اور ساربان اہل بیت کے القاب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

صفحہ گیتی پر ظہور پذیر ہونے والے اہم واقعات اہل عالم کے علم میں تو اسی وقت آتے ہیں جب وہ رونما ہو چکے ہوں لیکن مشیت الٰہی میں وہ روز ازل سے ہی محل رہے ہوتے ہیں اور آل محمد تو باعث تخلیق و تکوین عالم ہیں۔ اسی لئے پیشین گوئیاں ان کی نقیب بنتی ہیں اور انکی پیدائش سے بہت پہلے ان کا تذکرہ ان لبوں پر آجاتا ہے جو الہام سے آشنا ہیں۔ خدا کے حبیب نے جب کہا تھا کہ میرے بعد میرے بارہ وصی ہوں گے اور ان میں سے پہلے چوتھے، آٹھویں اور دسویں کا نام علی ہوگا تو اس حدیث میں بھی امام زین العابدین کا ذکر مضمر تھا۔ اور جب حضرت علی نے دیکھا کہ جناب شہربانو نے دربار خلافت میں اپنے شریک زندگی کے طور پر امام حسین کو منتخب کیا ہے تو آپ نے امام حسین سے فرمایا "اے ابوعبداللہ۔۔ مبارک ہو۔ تم اس خاتون کے ذریعے اس فرزند کے باپ بنو گے جو تمام خلائق میں بہترین ہوگا اور یہ خاتون نو اماموں کی ماں ہوگی"۔

اپنے خاندان کے عالی مرتبہ اور صاحب شرف ہونے پر فخر کرنا اہل عرب کی

خصوصیات میں سے تھا۔ لیکن شاید تمام اہل عرب میں حسب و نسب کے لحاظ سے وہ عظمت و جلالت کسی کو بھی حاصل نہ ہوئی ہوگی جو امام زین العابدین نے پائی تھی۔

آپ کی والدہ جن کا نام شہربانو تھا ایران کے اس شہنشاہ کی نسل سے تھیں جو عدل وانصاف کے حوالے سے آج تک مشاہیر زمانہ میں شمار ہوتا ہے۔ اور اسے کبھی صرف اس کے نام یعنی نوشیروان سے نہیں پکارا جاتا بلکہ نوشیرواں عادل کہہ کر ہی یاد کیا جاتا ہے۔ رسول نے اس کے عدل کو اپنی پسندیدگی کی لازوال سند یہ کہہ کر عطا کی کہ مجھے فخر ہے کہ میں اس عہد میں پیدا ہوا جب نوشیرواں عادل حکمران تھا۔ شہربانو کے علاوہ آپ کے جن دیگر ناموں کو تاریخ نے اپنے سینے میں محفوظ کر کے ہم تک پہنچایا ہے وہ ہیں شاہ زنان، جہاں شاہ، سلامہ، ام سلمہ، غزالہ، سلافہ، جہاں بانو، خولہ اور مریم۔★

امام زین العابدین کے والد امام حسین تھے۔ جنھیں رسول نے سید الشباب اہل الجنہ کہا تھا۔ اور دادا امیرالمومنین علی ابن ابی طالب تھے جنھیں غدیر خم میں من کنت مولاہ فھذا علی مولا کی سند عنایت ہوئی تھی۔ اور آپ کے نسب کے تاج میں سب سے بڑا گوہر شاہوار رسالت مآب کا نام نامی تھا جو محبوب خالق کائنات بھی تھے اور باعث تخلیق موجودات بھی تھے۔

ابوالاسود دائلی نے کیا خوب کہا ہے:

وان غلام بین کسری و ھاشم۔ لاکرم من نیطت علیہ التمائم

بے شک یہ فرزند ھاشم و کسری ان تمام بچوں سے زیادہ عزت والا ہے جن کے بازو پر تعویذ باندھے جاتے ہیں۔

★نسب نامے کے اعتبار سے پورا نام یوں ہے۔

شاہ زنان بنت یزدجرد ابن شہریار ابن شیرویہ ابن پرویز ابن ہرمز ابن نوشیروان عادل۔

امام زین العابدین کے پانچ بہن بھائی تھے۔ علی اکبر، علی اصغر، فاطمہ کبریٰ، فاطمہ صغریٰ اور سکینہ۔

امام زین العابدین کی والدہ جناب شہربانو کا انتقال امام کی پیدائش کے چند روز بعد ہی ہو گیا تھا۔ امام حسین کی ایک ام ولد نے آپ کی پرورش کی ۔۔۔ یہ کنیز تھیں ۔۔ لیکن امام نے تاعمر انھیں ماں کہا۔

امام زین العابدین کی شادی اٹھارہ سال کی عمر میں امام حسن کی صاحبزادی ام عبداللہ سے ہوئی جن کا اصل نام فاطمہ تھا۔ بعد میں آپ نے دو نکاح اور کیے۔ اس کے علاوہ کنیزیں تھیں۔ آپ کی اولاد کی تعداد ۱۵ ہے۔ جن میں سے ۱۱ فرزند تھے اور ۴ دختر تھیں۔

آپ نے ۲۲ سال کی عمر میں کربلا کی سرزمین پر منصب امامت سنبھالا۔ تاریخ انسانی میں کسی شخصیت نے اتنے مشکل حالات میں اپنا منصب نہیں سنبھالا ہوگا۔ اور اتنے نامساعد حالات میں اتنی بڑی کامیابی بھی شاید ہی کسی نے حاصل کی ہو۔

جس کے گھر کے سب مرد قتل ہو چکے ہوں اور چاروں طرف ظالم ترین دشمنوں کا نرغہ ہو۔ جس کے خاندان کی عالی مرتبت خواتین رسیوں سے بندھی ہوئی ہوں۔ اور ان کے چہرے اور سر چادروں تو کیا نقابوں سے بھی محروم ہوں۔ اور مصیبت زدوں کے اس قافلے کو کوفہ و شام کے بازاروں اور درباروں میں پھرایا جا رہا ہو۔ ان کو برا بھلا کہا جا رہا ہو۔ تازیانے لگائے جا رہے ہوں۔ اور تازیانوں سے بھی تکلیف دہ یہ بات کہ انکے بزرگوں کو جھٹلایا جا رہا ہو۔ کہا جا رہا ہو کہ نہ کوئی وحی آئی نہ کوئی فرشتہ اترا۔ یہ تو بنی ہاشم نے سلطنت کے لئے کھیل کھیلا تھا۔ اور رسول کو جھٹلانے والا خود ان کا ہی خلیفہ ہونے کی حیثیت سے مسند اقتدار پر بھی بیٹھا ہو۔ حکم زباں درازی میں آزاد ہو کہ جس غلط کو بھی چاہے خاندان رسالت سے منسوب کر

دے۔ اور خدا کے شیر کا پوتا بستہ زنجیر ہو اور جب وہ حاکم کی بات کو جھٹلائے تو اسے قتل کی دھمکی دی جائے۔ جو ظلم و ستم کر رہا ہو وہ مرتبے سے واقف ہونے کے باوجود ظلم و ستم کر رہا ہو اور جو تماشہ دیکھ رہے ہوں ان کی اکثریت ان کے مرتبے سے ناواقف ہو۔

حسینؑ کا امتحان مشکل تھا لیکن شاید علی ابن الحسینؑ کا امتحان اس سے بھی مشکل تھا۔ رسولؐ کی بیٹیوں کو بلوے میں کھلے سر دیکھنا آسان کام نہ تھا۔

اور پھر اس حال میں اعلائے کلمہ الحق ... دربار یزید میں امام زین العابدینؑ نے قاتلان حسینؑ پر لعنت کی۔ اور یہ بھی ثابت کیا کہ یزید قاتل حسینؑ ہے۔ بلکہ آخر میں یزید کو بھی اس پر مجبور کر دیا کہ وہ قاتلان حسین پر لعنت کرے۔ اور فوج یزید کے ان سرداروں نے جو کربلا میں موجود تھے اور قتل حسین میں شریک تھے انھوں نے دربار میں کہا کہ حسینؑ کا قتل یزید نے کیا۔ امام زین العابدینؑ نے یزید کو اس حالت کو پہنچا دیا کہ وہ اپنے منھ پر طمانچے مارتا تھا اور کہتا تھا کہ میں نے کیوں حسینؑ کو قتل کیا۔ ایک قاتل کو جو حاکم اور بااختیار بلکہ مطلق العنان بادشاہ بھی ہو اس قدر ذلیل کر دینا اور وہ بھی انتہائی بے بسی کے عالم میں قید وبند میں زندان میں رہتے ہوئے ... یہ کمال سیاست الٰہیہ میں ہی ہو سکتا ہے۔

یزید نے حسینؑ کی گردن کاٹی تھی۔ علی ابن الحسینؑ نے اپنے سامنے یزید کی گردن جھکا دی۔ یہ معجزہ ہے۔ علی ابن الحسینؑ کے صبر کا معجزہ۔ اور یہی امام زین العابدینؑ کی عدیم المثال کامیابی ہے۔

شام کے قید خانے میں تقریباً ایک سال رہنے کے بعد امام اور ان کے اہل خاندان کو آزاد کر دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ چاہے آپ مدینے واپس چلے جائیں چاہیں یہیں دمشق میں رہیں۔ امام نے جواب دیا کہ چند روز ہم دمشق میں قیام کرنا چاہتے ہیں

کیوں کہ ہمیں اپنے عزیزوں پر رونے بھی نہیں دیا گیا۔ چاہتے ہیں کہ جی بھر کے ان کا ماتم کر لیں پھر مدینے چلے جائیں گے۔ چنانچہ حاکم نے محلہ میں ایک مکان دے دیا، جہاں صف ماتم بچھائی گئی۔ سات روز تک مجلسیں ہوئیں۔ دمشق کی عورتیں آتیں۔ پرسہ دیتیں۔ اہل بیت سے ان کے مصائب کا حال سنتیں۔ گھر جا کر اوروں کو بتاتیں۔

اسی شہر میں جہاں اہل حرم کو قیدی بنا کر لایا گیا تھا کوچہ و بازار میں پھرایا گیا تھا۔ جہاں لوگ ان کے دیکھنے کو لباس فاخرہ پہن کر جمع ہوئے تھے۔ جہاں عورتیں چھتوں پر سے خوش ہو ہو کر قیدیوں کا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ جہاں کے لوگ کہہ رہے تھے اچھا ہوا تم لوگ قتل ہوئے، اسیر ہوئے۔ ہمارے امیر نے فتح پائی۔ اسی شہر میں وہی عورتیں وہی لوگ تعزیت کر رہے ہیں۔ ماتم پرسی کر رہے ہیں۔ کیونکہ اب انہیں اچھی طرح پتہ ہو گیا ہے کہ جنھیں ہم سمجھ رہے تھے کہ باغی ہیں وہ خدا کے سب سے اطاعت گذار بندے ہیں۔ خدا کا باغی تو خود ہمارا حاکم ہے۔ وہ حاکم جس نے خاندان رسالت کو تباہ کر دیا۔ جس نے بہترین لوگوں کو قتل کر دیا۔ ایسے لوگوں کو جن کا تقوی بے مثال تھا۔ جو خدا کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ نہ خدا کے دیئے ہوئے اصولوں کے علاوہ کسی کے اصول ماننے کو تیار تھے۔ جبھی تو انھوں نے بیعت کر کے دنیا کی ہر آسائش حاصل کرنے کے بجائے انکار کر کے تیغ و تبر و تیر و سناں کے زخم کھائے اور ہنستے ہوئے موت کو گلے لگایا کہ خدا کو ماننے والے تو ہمیشہ دنیا پر عاقبت ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔

شام کے ظلمت کدے میں احقاق حق کی شمع جلانے کے بعد، قاتلوں کو اپنے کیئے پر رلوانے کے بعد، انکار بیعت کی وجہ سمجھانے کے بعد اور ملوکیت کے پرستاروں کو حقیقی اسلام کا جلوہ دکھانے کے بعد یہ قافلہ مدینے کی طرف چلا۔ راستے میں

کربلا رکا۔ قبر حسین پر گریہ وزاری سے قیامت برپا کی اور پھر اپنے نانا کے شہر آگیا۔ یہ کہتا ہوا کہ اے نانا کے شہر ہم تیرے قابل نہیں رہے۔

واقعہ کربلا کے صرف سال بعد مدینے والوں کو اس بات کا شدید احساس ہو گیا کہ یزید کی بیعت کر کے انھوں ناقابل تلافی گناہ کیا تھا۔ کیونکہ یزید کا کردار تو وہ تھا جو ایک عام مسلمان کے لئے بھی باعث شرم تھا۔ یزید علانیہ شراب پیتا تھا۔ تارک الصلوٰۃ تھا۔ منبر پر بندروں سے کھیلتا تھا۔ کتے پالتا تھا۔ اسلام کے شعائر کا مذاق اڑاتا تھا اور محرمات سے نکاح کرتا تھا۔ یزید نے اگرچہ مدینے کے اکابر کو لاکھوں درم دئے لیکن پھر بھی انہوں نے یزید کی بیعت توڑ دی اور صاف کہا کہ ہم نے یزید کی بیعت اس لئے توڑی کہ ہمیں خوف ہوا کہ اگر ہم نے اس کی بیعت اب بھی نہ توڑی تو کہیں ہم پر آسمان سے پتھر نہ برسنے لگیں۔ اہل مدینہ نے یزید کے مقرر کردہ عامل کو مار کر نکال دیا اور عبداللہ بن حنظلہ کو اقتدار سونپ دیا۔ اس کے بعد تاریخ میں ظلم و بربریت کی وہ سیاہ داستان شروع ہوتی ہے جسے واقعہ حرہ کہتے ہیں۔ یزید نے مسرف بن عقبہ کی سرکردگی میں فوج بھیجی جس نے شہر نبی کی حرمت کو اس طرح ضائع کیا کہ اس کی مثال تاریخ اولین و آخرین میں کہیں نہیں ملتی۔

امام زین العابدین کی بصیرت کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اہل مدینہ کے ساتھ یزید کس بے باکی کے ساتھ ظلم کرے گا اور اخلاقی ذلتوں کی کن حدوں کو چھوئے گا۔ لہذا آپ اپنے اہل خاندان کو لے کر ینبوع چلے گئے۔ آپ کے خاندان کے ساتھ تقریباً چار سو خواتین اور ان کے بچے بھی آپ کی پناہ میں تھے۔ واقعہ حرہ کے ہنگامے کے پورے دور میں آپ نے ان تمام خواتین اور بچوں کی کفالت کی۔

یزید کی فوج نے مدینہ میں سات دن قتل عام کیا۔ صحابی اور حافظ قرآن قتل ہوئے۔ مسجد نبوی میں گھوڑے باندھے گئے۔ ہزاروں خواتین کی عصمت تار تار کر

دی گئی ۔ اور لوگوں کو آخر امان دی گئی تو اس شرط پر کہ وہ ان الفاظ میں بیعت کریں کہ ہم یزید کے غلام ہیں ۔ وہ چاہے ہمیں رکھے یا بیچ دے ۔

امام زین العابدین مدینے کی واحد شخصیت تھے جن سے بیعت طلب نہیں کی گئی ۔ بلکہ آپ سے مسرف بن عقبہ نے صرف اتنا کہا کہ کوئی ضرورت ہو تو بتائیں ۔ آپ نے جواب میں فرمایا "لوگوں کی گردنوں سے تلوار ہٹالے"۔

امام زین العابدین وارث خلق عظیم تھے ۔ انسانیت کا پیکر تھے ۔ ان کی زندگی کا بنیادی اصول یہی تھا کہ وہ کرو جس کا خدا نے قرآن میں حکم دیا ہے اور اس سے بچو جس سے منع کیا ہے ۔ آپ کے پاس زمینیں تھیں، چشمے تھے ۔ آپ ان زمینوں کو کاشت کراتے تھے ۔ آپ کی تجارت بھی تھی اور آپ کے کارندے شام تک مال تجارت لاتے اور لے جاتے تھے ۔ ایک امام چونکہ تمام انسانوں کے لئے نمونہ عمل ہوتا ہے لہذا معاشرتی زندگی کے بنیادی ستون یعنی اکل حلال کے لئے کوشش و کاوش کا عملی سبق آپ اپنی زندگی سے دیتے تھے ۔ معاش کے سلسلے میں کوشش و کاوش اس لئے بھی تھی کہ اسلام نے اہل و عیال کی کفالت اور محنت کر کے ان کے لئے رزق حلال کی فراہمی کو عبادت کا درجہ دیا ہے ۔ اور اس لئے بھی تھی کہ خلق خدا سے حسن سلوک، صلہ رحمی، رشتہ داروں کی امداد، پڑوسیوں اور جاننے والوں کی اعانت، غریبوں اور فقیروں کے لئے عطا و ھدایا و صدقات و خیرات کے سلسلے سبھی کے لئے مال کی ضرورت ہے ۔ بس فرق یہی ہے کہ عام آدمی اول تو کمانے میں حلال و حرام کا امتیاز نہیں رکھتا ۔ اور حلال بھی کمائے تو اس سے اپنی اور اپنے اہل خانہ کی ضرورتیں پوری کرتا ہے ۔ جبکہ امام دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں پر مقدم رکھتا ہے ۔ کھاتا کم ہے کھلاتا زیادہ ہے ۔ خود جو کی روٹی اور سوکھے ٹکڑے کھاتا ہے ۔ غریبوں، فقیروں، محتاجوں اور تنگدستوں کے لئے دسترخوان سجاتا ہے ۔

خدا نے خلق خدا کو اپنا کنبہ کہا ہے۔ امام سے زیادہ خدا کے کنبے کی کسے پرواہ ہوگی۔ لوگوں کے کام آنے کے علاوہ امام کا وقت نشر علوم کے لئے وقف ہے یا عبادت کے لئے۔

قرآن کی تلاوت ہے یا ذکر رسول ہے۔ نمازیں ہیں۔ دعائیں ہیں۔ استغفار ہے۔ خوف خدا سے اشکباری ہے۔ کوئی پوچھے تو بتا دیتے ہیں۔ کوئی نہ پوچھے تو پروردگار سے رازونیاز میں مصروف رہتے ہیں۔

کیا عجیب بات ہے کہ جس کی زندگی کا یہ طریقہ ہو اور اس سے بھی ارباب حکومت خوف کھائیں کہ فوج جمع نہ کر لے، بغاوت نہ کر دے۔ اسی طرح کے اندیشوں اور حاسدوں کی شکایتوں کی بنا پر عبدالملک بن مروان نے حجاج بن یوسف کو لکھا کہ امام کو قید کر کے میرے پاس بھیج دے۔ محمد ابن شہاب زہری نے جو عبدالملک کے دربار کا عالم اور امام کا شاگرد تھا عبدالملک سے کہا "تو دیکھ رہا ہے کہ عبادت میں ان کا انہماک کس طرح کا ہے۔ ایسا آدمی دنیاوی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا ہے؟" عبدالملک نے رہا کر دیا اور مدینے بھجوا دیا۔

امام زین العابدین کی عمر جب ۵۷ سال کی ہوئی تو ولید بن عبدالملک سے آپ کا وجود مسعود برداشت نہ ہوا۔ اور اسی کے دئے ہوئے زہر سے آپ شہید ہوئے۔ آپ کی شہادت ۲۵ محرم الحرام ۹۵ھ کو ہوئی۔ آپ کو آپ کے چچا امام حسن کے پہلو میں جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ *

آپ کی انگوٹھی کا نقش تھا الحمد للہ العلی اور العزہ للہ

---

* تاریخ وفات بھی محرم کے علاوہ کئی لکھی ہیں مثلاً ۲۲ محرم، ۱۸ محرم، ۱۲ محرم۔

** یزید بن عبدالملک نے امام کو ہشام بن عبدالملک کے ذریعے زہر دیا تھا۔

آپ کے عہد کے حاکم مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حضرت علی۔ ان کے عہد حکومت میں آپ کی ولادت ہوئی۔ عرصہ حکومت: ۲ سال

۲۔ امام حسن۔	۱۰ سال
۳۔ معاویہ۔	۱۹ سال
۴۔ یزید۔	۴ سال
۵۔ معاویہ بن یزید۔	چالیس دن
۶۔ مروان بن حکم۔	۱ سال
۷۔ عبدالملک بن مروان۔	۲۱ سال
۸۔ ولید بن عبدالملک۔	۱۰ سال

آپ کا رنگ گندم گوں تھا۔ قد درمیانہ۔ جسم دبلا پتلا۔ بال سرخی مائل تھے۔ سینہ چوڑا۔ گیسو دونوں شانوں پر لٹکتے تھے۔ چہرے مہرے میں آپ اپنے دادا جناب امیر سے مشابہ تھے۔

آپ کا لحن بہت عمدہ تھا۔ جب قرآن کی تلاوت کرتے تھے تو لوگ رک جاتے تھے اور سننے میں محو ہو جاتے تھے۔ اپنی شہادت سے پہلے بھی آپ تلاوت میں مصروف تھے۔ آخر وقت میں آپ نے سورہ واقعہ اور سورہ انا فتحنا کی تلاوت کی تھی۔

آپ کے گیارہ فرزند تھے۔ امام محمد باقر۔ عبداللہ الباھر۔ زید شہید۔ عمر۔ حسن۔ حسین اکبر۔ حسین اصغر۔ عبدالرحمان۔ سلیمان۔ جواد اور اصغر انکے نام ہیں۔ چار بیٹیاں تھیں۔ خدیجہ۔ فاطمہ۔ کلثوم اور علیہ۔

آپ کے بعد امام محمد باقر آپ کے جانشین ہوئے۔

ام کے آخری الفاظ یہ تھے۔

وہ معبود ہر قسم کی حمد و ثنا کا مستحق ہے جس نے وہ وعدہ جو ہمارے ساتھ کیا تھا پورا کیا۔ اور ہمیں بہشت کا مالک بنایا۔ کہ جس جگہ چاہیں اس میں رہیں اور وہ نیک کام کرنے والوں کو یقیناً اچھا صلہ دیتا ہے۔

آپ کا یہ پیغام تمام انسانوں کے لئے بھی ہے اور ہم سب کے لئے بھی ہے

"اے لوگو۔ میں تمھیں آخرت حاصل کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ دنیا حاصل کرنے کی وصیت نہیں کرتا"۔

القاب کا پس منظر

تاریخ انسانی کے قاصد نے جن مشاہیر عالم کے نام ہم تک پہنچائے ہیں ان کے القاب و خطابات بھی محفوظ کئے ہیں۔ ہر لقب یا خطاب اس شخصیت کے کسی بہت نمایاں پہلو کی نشان دہی کرتا ہے اور اس شخص کے اوصاف سے ہمارے تعارف کا ذریعہ بنتا ہے۔ خطاب یا لقب سے ہمیں اس شخصیت کے فضل و کمال اور اختصاص کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے۔ بقائے دوام کے ایوان میں جگہ پانے والے بھی ایسی ایک ہی خصوصیت کے مالک ہوتے ہیں جس کی بنا پر انھیں خلق خدا پہچانتی ہے۔ اکثر یہی ایک صفت ان کے نام کو ان کے مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتی ہے۔

امام جامع الفضائل ہوتا ہے۔ ہر وہ اچھی صفت جو انسانوں میں پائی جا سکتی ہے امام میں ضرور پائی جاتی ہے اور اشرفیت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ یعنی وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا عالم بھی ہوتا ہے۔ زاہد بھی ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ فصیح و بلیغ بھی ہوتا ہے اور سب سے زیادہ شجاع بھی۔ سب سے زیادہ حلیم و بردبار بھی ہوتا ہے اور سب سے زیادہ فیاض و متواضع بھی۔ اگر وہ ہر اچھی صفت میں دنیا کے سب انسانوں سے زیادہ بڑھا ہوا نہ ہو تو دنیا کے ہر انسان پر اس کی اطاعت فرض نہیں ہو سکتی۔ اور اگر سب انسانوں پر اس کی اطاعت فرض نہ ہو تو وہ سب انسانوں کا امام نہیں ہو سکتا۔

امام زین العابدینؑ کے بہت سے القاب و خطابات ہم تک پہنچے ہیں اور ہر خطاب یا لقب کا ایک خاص پس منظر ہے۔ ایک سبب ہے۔ ایک وجہ ہے۔ اور ہر سبب اپنے جلو میں فضیلتیں لئے ہوئے ہے۔ کیونکہ ہر صفت خلق محمدی کا ایک جزو ہے۔

آپ کا نام علی ابن الحسینؑ تھا۔ لیکن آپ کو عابد، سجاد یا زین العابدینؑ کے نام سے زیادہ یاد کیا جاتا ہے۔

زین العابدینؑ آپ کا سب سے مشہور لقب ہے۔ اس کا مطلب ہے عبادت گزاروں کی زینت۔ روز قیامت ایک ندا کرنے والا جب ندا کرے گا کہ این زین العابدین (عبادت گزاروں کی زینت کہاں ہے؟) تو آپ آگے بڑھیں گے۔ کثرت عبادت کی وجہ سے لوگ آپ کو زین العابدینؑ کہتے تھے۔ لیکن اس خطاب کی اصل بنیاد وہ واقعہ ہے کہ ایک بار جب آپ نافلہ تہجد ادا کر رہے تھے تو ایک اژدہا آ گیا اور اس نے آپ کے پیر کے انگوٹھے کو چبانا شروع کر دیا۔ امامؑ نماز پڑھتے رہے۔ جب آپؑ نے نماز تمام کی تو اژدہے کی طرف توجہ کی۔ آپ نے لاحول پڑھی۔ اژدہا بھاگ گیا۔ غیب سے آواز آئی انت زین العابدین حقا۔ (تم واقعی زین العابدین ہو)۔

خداوند عالم نے قرآن مجید میں فرمایا "اور ہم نے نہیں پیدا کیا کسی انسان اور جن کو مگر اس لئے کہ وہ ہماری عبادت کریں"۔ گویا عبادت ہی انسان اور جن کی زندگی کا مقصد اور حیات کا لازمہ ہے۔ دنیا کے تمام نیک لوگوں نے عبادت کی۔ اور جو جتنا نیک تھا اس نے اتنی زیادہ عبادت کی۔ لیکن یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ اگر صرف عابد کہا جائے تو اس سے ہمیشہ امام زین العابدینؑ ہی مراد لئے جاتے ہیں۔ آپ کو سید العابدینؑ بھی کہا جاتا ہے۔

حسب و نسب میں شرف کی بنا پر آپ کو ابن الخیرتین کہا جاتا ہے۔ یہ لقب رسول خداؐ کی ایک حدیث سے اخذ کیا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا تھا خدا نے اپنے بندوں میں سے دو گروہوں کو بہتر قرار دیا ہے۔ عرب میں سے قریش اور عجم میں سے اہل فارس۔ آپؑ کے والد امام حسینؑ تھے جو سبط رسولؐ تھے۔ شجرہ قریش میں سب سے محترم شاخ۔ اور آپ کی والدہ شاہ زناں تھیں جو نوشیرواں عادل کی اولاد تھیں اور ایران کی شاہزادی تھیں۔ جب آپ ایران میں اپنے والدین کے پاس تھیں اسی وقت

آپ نے خواب میں جناب فاطمہؑ اور رسول اللہؐ کی زیارت کی۔ انھوں نے ہی اسلام کی تعلیم دی اور خوشخبری دی کہ تم خاندان رسالت کی بہو بنو گی۔ آپ ایرانی سلطنت کی تباہی کے بعد دربار خلافت میں ایرانی کنیز کی حیثیت سے پیش کی گئیں۔ جناب امیرؑ نے آپ کو اجازت دی کہ آپ شوہر کی حیثیت سے جس کو چاہیں منتخب کر لیں۔ آپ نے امام حسینؑ کو منتخب فرمایا۔ آپ کے ساتھ آپ کی بہن گیہان بانو بھی آئی تھیں۔ ان کا عقد محمد ابن ابی بکرؓ سے ہوا۔

سجدہ امام زین العابدینؑ کی زندگی کا محور و مرکز تھا۔

جو بھی عظمت و جبروت، کبریائی، بزرگی اور بڑائی ممکن ہے وہ سب خدا کے لئے زیبا ہے۔ انسان کے لئے سب سے بہتر چیز ہے خدا کے سامنے عجز و انکسار۔ انسان کی طرف سے اس عجز و انکسار کا سب سے بہتر مظاہرہ نماز ہے۔ اسی لیے اسے مومن کی معراج کہا گیا ہے۔ اور نماز کے تمام ارکان میں سب سے اہم رکن ہے سجدہ۔ یہ تقرب الٰہی کا مقام ہے۔ سجدے میں بندہ اپنے مالک سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ یہی سجدہ امام زین العابدینؑ کی زندگی تھا۔ جب آپ کو کوئی نعمت ملتی تو آپ سجدہ کرتے۔ جب کوئی مصیبت نازل ہوتی تو سجدہ کرتے۔ جب کسی خوف سے نجات ملتی تو سجدہ کرتے۔ جب لوگوں میں صلح کراتے تو سجدہ کرتے۔ جب کوئی آیت سجدہ سنتے تو سجدہ کرتے۔ کسی کے مکر و شر سے امان میں رہتے تو سجدہ کرتے۔ جب کوئی ناخوشگوار خبر سنتے تو سجدہ کرتے۔ اس کثرت سجدہ کی وجہ سے آپ کو سجاد بھی کہا گیا یعنی بہت سجدے کرنے والا۔ اور سید الساجدین کے لقب سے بھی پکارا گیا یعنی سجدہ کرنے والوں کا سردار۔ آپ اتنے سجدے کرتے تھے کہ آپ کے اعضائے سجود پر گٹھے پڑ جاتے تھے جنھیں آپ سال میں دو بار ترشواتے تھے۔ جسم شتر پر زمین کی رگڑ سے جو گٹھے پڑ جاتے ہیں انھیں عربی میں ثفنہ کہا جاتا ہے۔ اعضائے سجود پر گٹھے پڑ جانے کی وجہ سے

آپ کو ذوالثفنات بھی کہا گیا۔

کربلا کے المناک واقعے کے بعد اولاد رسول میں آپ کی ذات با برکات بچی تھی۔ خاندان رسالت میں صرف ایک مرد۔ اور آج دیکھیں تو سادات سے شہر بسے ہوئے ہیں۔ جتنے بھی سید ہیں وہ سب آپ کی نسل سے ہیں۔ اسی لئے آپ کو آدم آل محمدؐ بھی کہا جاتا ہے۔ اور ثانی آدم بھی۔ سارے امام چونکہ آپ ہی کی اولاد سے ہیں اس لئے آپ کو ابوالائمہ بھی پکارا جاتا ہے اور امام الائمہ بھی۔ جب دشمنوں نے رسولؐ کو حضرت ابراہیم کی وفات پر۔ جو ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے۔ اور اس وقت واحد نرینہ اولاد رسولؐ تھے۔ یہ طعنہ دیا کہ آپ مقطوع النسل ہیں۔ آپ کی اب کوئی اولاد نہیں۔ تو خدا نے اپنے رسولؐ کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ ہم نے تجھے کوثر دیا۔ جس کا ایک مطلب ہے کثیر اولاد۔ چونکہ آج جو بھی اولاد رسولؐ ہے وہ امام زین العابدینؑ کے واسطے سے ہے اس لئے آپ کا ایک لقب تفسیر کوثر بھی قرار پایا۔ حضرت علیؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے بعد چونکہ آپ چوتھے امام ہیں اس لئے آپ کو امام رابع کہا جاتا ہے۔

ایک زمانے میں شہر مدینہ میں کم از کم پچاس ہزار ایسے آدمی رہتے تھے جو امام زین العابدینؑ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اس بنا پر آب کا ایک لقب محررالعبید بھی ہے یعنی غلاموں کا آزاد کرنے والا۔ آپ نے کبھی کسی غلام سے ایک سال تک خدمت نہیں لی۔ جس طرح گنہ گاروں کی مغفرت کے لئے رحمت پروردگار بہانے ڈھونڈتی ہے اور اگرچہ بندہ نہ منت کرتا ہے نہ سوال۔ نہ استحقاق رکھتا ہے اور جہنم کی تدبیریں کرتا رہتا ہے لیکن پھر بھی اس کی رحمت یہ گوارا نہیں کرتی اور عرق انفعال کے قطروں کو اپنی کریمی سے موتی سمجھ کر چن لیتی ہے۔ اسی طرح آپ بھی اپنے غلاموں کو ذرا ذرا سی بات پر آزاد کر دیتے تھے۔ بعض اوقات تو خطا پر گرفت کرنے اور سزا

دینے کے بجائے پروانہ آزادی عطا کر دیتے تھے ۔ اور کیوں نہ کرتے ۔ کریم ابن کریم تھے ۔ آپ کے بزرگوں کا یہی چلن تھا ۔ آپ کے خاندان کا یہی شعار تھا ۔

آپ کے خطابات میں سے ایک البکا بھی ہے ۔ جس کا مطلب ہے گریہ ۔ کربلا کے واقعہ کے بعد آپ ۳۵ سال زندہ رہے ۔ لیکن کسی نے کبھی آپ کو ہنستے یا مسکراتے نہ دیکھا ۔ اس ۳۵ سال میں صرف ایک لمحہ ایسا آیا جب آپ مسکرائے ۔ ابن زیاد کا سر آیا تھا ۔ عبید اللہ ابن زیاد جو کوفہ کا حاکم تھا ۔ اور جس نے امام حسینؑ سے جنگ کے لئے لشکر ترتیب دیا تھا تاریخ کے ظالم ترین آدمیوں میں سے تھا ۔ جب امام حسینؑ کا سر اس کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ کھانا کھا رہا تھا ۔ امام زین العابدینؑ نے اس وقت دعا کی تھی بارالہا ۔ ایک دن ایسا بھی لانا جب میں کھانا کھا رہا ہوں اور اس کا سر میرے سامنے پیش کیا جائے ۔ مختار کے قاصد نے ابن زیاد کا سر امامؑ کے قدموں میں ڈال دیا ۔ آپ نے فرمایا ۔ اس نجس چیز کو میرے پاس سے دور کرو ۔ اس سے کچھ دیر پہلے آپ کے کارندے سامان تجارت کے طور پر ملک شام سے اونٹوں پر بار کر کے پھل لائے تھے ۔ آپ نے اپنے خادموں کو حکم دیا کہ وہ تمام پھل اس خوشی کے موقع پر لوگوں میں بطور ہدیہ اور تحفہ تقسیم کر دیے جائیں ۔ چنانچہ اہل مدینہ میں سے ہر ایک کا دروازہ کھٹکھٹا کے یہ پھل پہنچائے گئے ۔

جنگ کربلا کے بعد جب اہل حرم کو قید کر کے کربلا سے کوفے اور کوفے سے شام لے جایا گیا ۔ درباروں میں تشہیر کیا گیا ۔ کوچوں اور بازاروں میں پھرایا گیا ۔ زندانوں میں ٹھرایا گیا ۔ تو اس تمام عرصے میں امام زین العابدینؑ بیمار تھے ۔ لمبی مسافتوں میں آپ کو ننگی پیٹھ والے اونٹ پر بٹھا دیا جاتا اور آپ کے پیر اونٹ کے پیٹ سے باندھ دیے جاتے تھے ۔ شہروں میں آپ کو اونٹ کی مہار پکڑ کر چلنا پڑتا تھا ۔ اس نسبت سے آپ کو بیمار کربلا ، ساربان اہل بیتؑ اور قافلہ سالار حرم بھی کہا جاتا

ہے۔

امامؑ کی ایک کنیز نے بیان کیا کہ میں نے امامؑ کے لئے کسی رات بستر نہیں لگایا اور ان کے لئے کسی دن دسترخوان نہیں بچھایا۔ آپ کی ہر رات محراب عبادت میں بسر ہوتی تھی اور ہر دن آپ روزے سے رہتے تھے۔ ہر سال حج کرتے تھے۔ جن میں سے بیس حج تو آپ نے پا پیادہ انجام دئے۔ کبھی کبھی بطور شکر نعمت آپ اچھا لباس بھی استعمال کرتے تھے۔ لیکن عام طور پر آپ بالوں سے بنا ہوا موٹا لباس پہنتے تھے جو جسم کو تکلیف دیتا تھا۔ آپ کے ہاں فقرا، مساکین، یتامیٰ، اور غربا کے لیے اچھے کھانے پکتے تھے۔ لیکن آپ خود عموماً جو کی روٹی کھاتے تھے۔ ہر موسم کے اختتام پر لباس صدقہ کر دیتے تھے۔ دنیا کی لذتوں سے اس کنارہ کشی کے باعث آپ کا ایک لقب الزاھد بھی ہے۔ اور آپ کو سید الزہاد بھی کہا جاتا ہے۔

سید التابعین، زین الصالحین، سید العارفین، زین العبا، الذکی اور الامین کے علاوہ آپ کا ایک لقب الصابر بھی ہے۔ آپؑ کے صبر کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ کربلا، کوفے اور شام میں آپ پر کیا کیا قیامتیں نہیں ٹوٹیں لیکن آپ نے کبھی نہ جلال دکھایا نہ بددعا کی۔

کربلا سے پہلے تک

اہل دنیا کیلئے تو یہ ہوتا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ بے بس ہوتا ہے۔ وہ اپنی کوئی ضرورت پوری نہیں کر سکتا۔ بلکہ اپنی ضرورت کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔ وہ روتا ہے تو کوئی اسکی طرف توجہ کرتا ہے ماں اسکی نگہداشت کرتی ہے۔ اسکا خیال رکھتی ہے۔ اسکی ضروریات پوری کرتی ہے۔ نہ وہ کچھ جانتا ہے۔ نہ کسی کو پہچانتا ہے۔ نہ بول سکتا ہے۔ نہ کوئی کام کر سکتا ہے۔

لیکن اللہ والوں کیلئے دوسری صورت ہوتی ہے۔ عیسیٰؑ پیدا ہوتے ہیں تو خود کو بھی جانتے ہیں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اور ان لوگوں کو بھی جانتے ہیں جو انکی ماں سے یہ سوال پوچھنے آئے تھے کہ تم اس بچے کو کہاں سے لائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں۔ وہ بولتے بھی ہیں۔ اور اپنی ماں کی اس مشکل کو بھی حل کرتے ہیں جو لوگوں نے ان کی عصمت پر سوال کر کے پیدا کر دی تھی۔ علیؑ پیدا ہوتے ہیں تو سجدہ کرتے ہیں۔ رسولؐ آغوش میں لیتے ہیں تو آنکھیں کھولتے ہیں۔ کلام کرتے ہیں۔ جھولے میں ہیں تو کلہ اژدر کو چیر دیتے ہیں۔

لڑکپن کی منزل آتی ہے تو اہل دنیا کے بچے کھیلتے کودتے ہیں۔ پڑھنا لکھنا سیکھتے ہیں۔ پہلے سے کچھ نہیں جانتے۔ بتایا جاتا ہے تو انہیں معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے جتنا چھوٹا ہوتا ہے اتنا نادان کہا جاتا ہے۔ بڑا ہوتا ہے تو عقل بڑھتی ہے۔ تجربہ بڑھتا ہے۔ مشاہدہ بڑھتا ہے۔ ادراک بڑھتا ہے۔ سمجھ بڑھتی ہے۔ علم بڑھتا ہے۔ اعتبار بڑھتا ہے۔ اسی لئے ذمہ داری کے کام دیتے وقت دیکھا جاتا ہے کہ چھوٹا ہے یا بڑا۔

لیکن اللہ والوں کا رنگ ڈھنگ مختلف ہوتا ہے۔ آل محمدؐ کے ہاں بڑے اور

چھوٹے کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ جب پیدا ہوتے ہیں تو صاحب علم پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا میں آکر اوروں سے نہیں سیکھتے۔ آل محمدؐ کے بچے کھیلتے نہیں ہیں۔ اور جب پوچھا جاتا ہے کہ تم دوسرے بچوں کی طرح کھیل کود میں مشغول کیوں نہیں ہوتے تو جواب ملتا ہے کہ ہمیں کھیل کود کیلئے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ اور جب پوچھنے والا حیرت سے پوچھتا ہے کہ کیوں۔ تو جواب قران کی آیت سے ملتا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بیکار پیدا کیا ہے۔ لوگوں کی عمر کی آخری منزل آ جاتی ہے اور انھیں اس طرف توجہ نہیں ہوتی کہ انہیں کسی نے پیدا کیا ہے تو کیوں کیا ہے۔ یہاں ابتدائے عمر میں یہ بات معلوم ہے اور دلیل قرآنی کے ساتھ معلوم ہے۔ یہاں جب آدمی دوسرے ملک سے مال خمس لیکر آتا ہے اور آل محمدؐ کے بڑے سے کہتا ہے کہ مال مسجد میں ہے تو بڑا چھوٹے سے کہتا ہے کہ جاؤ مال وصول کر لو۔ آدمی درہم کی تھیلی سامنے رکھتا ہے اور بچہ درہم الگ الگ کرنے لگتا ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ بچہ ہے کھیل رہا ہے۔ لیکن یہ بچہ آل محمدؐ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ مال حلال ہے، ہمیں قبول ہے۔ یہ درہم واپس لے لو۔ ان میں مال حرام کی آمیزش ہے۔ اور وہ سُوت کی انٹی تو دو جو بیچاری بڑھیا نے دی تھی۔ وہ مال حلال ہے۔ ہمیں قبول ہے۔ یہ ہمیں قبول نہیں۔ ان میں حرام کی آمیزش ہے۔ یہ علم دنیا کی کتابیں پڑھنے سے نہیں آ سکتا۔ یہ علم اللہ والوں ہی کا حصہ ہے۔ اور انہی کو عطا ہوتا ہے۔

امامؑ اپنی پیدائش کے دن سے ہی امامؑ ہوتا ہے۔ اسلئے عمر کی ہر منزل میں وہ دنیا والوں سے مختلف ہوتا ہے۔ بچپن میں بھی نوجوانی میں بھی۔ عمر کی ان ابتدائی منزلوں میں بھی۔ اسکا وقت انہی کاموں میں صرف ہوتا ہے جو کام اسے آئندہ زندگی میں ایک امامؑ، ایک عہد آفریں فرد اور ایک تاریخ ساز شخصیت کی حیثیت سے کرنے ہوتے ہیں۔ جب وہ دنیا والوں کی نظروں میں چھوٹا ہوتا ہے اس وقت بھی وہ خدا کا نور ہوتا ہے۔ اللہ کا مقرر کیا ہوا ہوتا ہے۔ اہل عالم پر خدا کی دلیل ہوتا ہے۔ معصوم

ہوتا ہے۔ صاحب علم لدنی ہوتا ہے۔ قرآن ناطق ہوتا ہے۔ بچپن اور لڑکپن میں بھی امام کے افعال و اعمال وہی ہوتے ہیں جو ایک امام کے شایان شان ہوں۔

زین العابدینؑ امام تھے۔ اسی لئے ان کا بچپن، لڑکپن اور نوجوانی دنیا کے اور لوگوں کے بچپن لڑکپن اور نوجوانی سے مختلف تھی۔

کھیل کود سے انہیں کوئی تعلق اس لئے نہیں تھا کہ انہیں پتہ تھا کہ خدا نے جن وانس کو عبادت کیلئے پیدا کیا ہے لہو ولعب کیلئے نہیں۔ دنیا کے علم کی تحصیل ان کا مسئلہ اسلئے نہیں تھی کہ وہ صاحب علم لدنی تھے۔

گھر کا ماحول کسی بچے پر سب سے زیادہ اثر ڈالتا ہے۔ اور اسے وراثت میں جو خصوصیات ملی ہوتی ہیں ان کو نکھارتا ہے۔

جس کے گھر والوں میں رسولؐ بھی ہو امیر المومنینؑ بھی ہو۔ باپ بھی امام ہو چچا بھی امام ہو اسکے ورثے میں فضیلتیں ہی فضیلتیں ہوں گی۔ اسکے اخلاق میں بلندی ہی بلندی ہوگی۔ پھر گھر کا ماحول۔

خاندان کے سربراہ علی ابن ابی طالبؑ ہیں۔ جنکی شجاعت کا سارا عرب معترف ہے۔ اسلام کی اشاعت میں جنکی کوششوں کی ساری دنیا گواہ ہے۔ جنکی عبادت کا یہ عالم ہے کہ ہر رات ایک ہزار تکبیروں کی صدا انکے حجرے سے بلند ہوتی ہے۔ جنکی سخاوت کا یہ عالم ہے کہ کبھی کوئی سائل ان کے در سے خالی نہیں گیا۔ جنکے علم کا یہ عالم ہے کہ دنیا میں ان کے سوا کسی کو یہ فخر حاصل نہ ہوا کہ کہدے کہ جو چاہو پوچھ لو۔ ہر سوال کا جواب ایسا دیا ہو کہ منکر بھی کلمہ پڑھنے لگے۔ زہد کا یہ عالم ہے کہ جس تھیلی میں اپنے افطار کیلئے جو کا بھنا ہوا آٹا رکھتے ہیں اس پر مہر لگا دیتے ہیں تاکہ کوئی اس میں گھی، روغن کی آمیزش نہ کر دے۔ جنکے زور کا یہ عالم ہے کہ دو انگلیوں سے باب خیبر اکھاڑ دے۔ جنکے علم کا یہ عالم ہے کہ صرف اسلئے کہ اسلام کا

شیرازہ منتشر نہ ہو جائے، رسول اللہؐ کی ۲۳ سال کی محنت ضائع نہ ہو جائے۔ اپنے گلے میں رسی بندھوا لیتا ہے اور قبضہ شمشیر کی طرف نہیں دیکھتا۔

دادا علی مرتضیٰؑ کے بعد امام حسنؑ ہیں۔ جو چچا ہیں۔ پھر امام حسینؑ ہیں جو باپ ہیں۔ دادی فاطمہ زہراؑ کو بچے نے دیکھا نہیں لیکن ان کا ذکر تو سنا ہے۔ گھر کے اس ماحول میں جہاں بچے کو لوری نہیں دی جاتی آیتیں سنائی جاتی ہیں۔ سوتے وقت کہانیاں نہیں سنائی جاتیں رسولؐ کی حدیثیں سنائی جاتی ہیں۔ گھر میں جو باتیں ہوتی ہیں ان میں دنیا کا ذکر کم ہوتا ہے عاقبت کا زیادہ۔ جہاں اعلیٰ خصائل اور انسانی فضائل بچے کی گھٹی میں پڑے ہوں۔ جہاں لوگوں کی سب سے بڑی مشغولیت عبادت ہو۔ جہاں وطیرہ سخاوت ہو۔ جہاں شعار طہارت ہو۔ جہاں مزاج تقویٰ ہو۔ جہاں طریقہ زھد ہو۔ جہاں لوگوں کی حاجتیں روا کی جاتی ہوں۔ جہاں مشکل کشائی ہوتی ہو۔ جہاں شجاعت کا شہرہ ہو۔ جہاں اخلاق کا زور و شور ہو۔ جہاں علم کے چشمے ابلتے ہوں۔ جہاں دن لوگوں کی ہدایت میں کٹتے ہو۔ جہاں راتیں تسبیح و تہلیل و تقدیس و تمجید الٰہی میں صرف ہوتی ہوں۔ جہاں ایمان رگوں میں لہو کی جگہ دوڑتا ہو۔ جہاں محبت الٰہی ذہنوں پر چھائی ہوئی ہو۔ جہاں ہر لمحہ تبلیغ کی فکر ہو۔ ہر نفس اشاعت اسلام کیلئے وقف ہو۔ ایسے ماحول میں جو بچہ پلے گا وہ بڑے ہو کر زین العابدینؑ ہی بنے گا۔

عبداللہ بن مبارک نے ایک بار مدینے سے مکے کے سفر میں یہ دیکھا کہ ایک بچہ راہ سے ذرا ہٹ کر پیدل جا رہا ہے۔ عبداللہ بن مبارک کو تعجب ہوا۔ اس ویران صحرا میں اکیلا بچہ۔ نہ اسکے پاس سواری ہے، نہ زاد راہ ہے، نہ ہمسفر ہے، نہ کوئی بڑا ہے جو خبر گیری کر سکے۔ یہ بچہ کہاں جا رہا ہے، کیوں جا رہا ہے اور کون ہے۔ عبداللہ بن مبارک اس بچے کے پاس پہنچے اور احوال دریافت کیا۔

بچے نے کہا میری سواری میرے پیر ہیں۔ زاد راہ تقوی ہے۔ منزل مقصود

خانہ کعبہ ہے اور ہم سفر خدا ہے۔ بچے کے فصیح و بلیغ جملے نے عبداللہ بن مبارک کے ہوش اڑا دیئے۔

انہوں نے کہا، صاحبزادے ابھی تو آپ پر حج واجب بھی نہیں ہوا۔

بچے نے جواب دیا، اے شیخ کیا تم نے میری عمر کے کسی بچے کو مرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پھر میں کیسے اعتبار کروں کہ اس عمر تک زندہ رہوں گا جب حج واجب ہو۔ اور اسے ادا کروں۔

پوچھا گیا۔ تم آخر کون ہو۔

بچے نے کہا ہاشمی، فاطمی، مطلبی اور آگے بڑھ گیا۔

یہ ہے زین العابدین کے بچپن کی جھلک۔

لڑکپن میں ایک بار آپ بیمار پڑے۔ تالیف قلب کیلئے شفیق باپ نے پوچھا۔ جان پدر، کسی چیز کو دل چاہتا ہو تو بتاؤ۔

خدا رسیدہ بچے نے کہا بابا جان میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ خدا کے سوا نہ میری کوئی حاجت ہو نہ چاہت۔ جو میرا پروردگار چاہے۔ جو اس بڑی شان والے کی رضا ہو جو اس بادشاہ جلیل کی مشیت ہو۔ بس میں اسکے علاوہ اور کچھ نہ چاہوں۔ امام حسینؑ کا جی کھل گیا۔ ہنس کے فرمایا، بیٹے تمہارے اس جواب میں تمہارے جد امجد حضرت ابراھیمؑ کے جواب کی جھلک ہے۔ جب انہیں گوپھن کے ذریعے آگ کی طرف پھینک دیا گیا اور وہ دوش ہوا پر آگ کی طرف جا رہے تھے تو جبریل نے آکر کہا۔

پیغمبر خدا۔ کوئی حاجت ہو تو فرمائیے۔ اور حضرت ابراھیمؑ نے جواب دیا تھا کہ حاجت تو ہے مگر تجھ سے نہیں ہے اس مولا سے ہے جو دیکھ رہا ہے۔ اس ذات سے ہے جو کریم و رحیم بھی ہے اور قادر مطلق بھی ہے۔

تقرب خداوندی کیلئے عبادت ضروری ہے ۔ اور انسان عبادت میں جتنی تکلیف اٹھائے گا اتنا ہی اسے تقرب الٰی حاصل ہو گا ۔ ایک بار کسی نے دیکھا کہ امام زین العابدینؑ کوہ جبان پر نماز پڑھ رہے ہیں ۔ یہ مدینے سے باہر ایک پہاڑ ہے ۔ پوچھا کہ آپ یہاں آکر کیوں نماز پڑھ رہے تھے ۔ آپ نے فرمایا دھوپ کی تمازت سے یہ چٹان بہت تپتی ہے ۔ اس پر نماز پڑھتا ہوں تو اس چٹان کی تپش اور گرمی میرے رجوع الی اللہ میں اضافہ کرتی ہے ۔

عبادات میں کوئی عبادت بدنی ہے کوئی مالی ہے کوئی جانی ہے ۔ مثلاً نماز اور زکوۃ اور جہاد ۔ جس گھر سے دنیا نے عبادتیں کرنی سیکھیں وہاں رہنے والا جب نماز میں انتہائی تضرع کرے گا ۔ روزے پے درپے رکھے گا اور جو مال میسر ہو گا اس کا بیشتر حصہ خیرات کر دے گا تو کیا جہاد سے بے خبر رہے گا ۔ کیا وہ فنون حرب نہ سیکھے گا تاکہ خود کو جہاد کیلئے تیار رکھے ۔

جس گھر میں علیؑ رہے ہوں جو لافتیٰ تھے جس گھر میں عباسؑ رہتے ہوں ۔ جنکی پیدائش سے پہلے یہ خیال رکھا گیا کہ عرب کے انتہائی شجاع قبیلے میں علیؑ شادی کریں تاکہ جو اولاد ہو وہ شجاع ترین ہو ۔ جہاں محمد ابن حنفیہ رہتے ہوں جنھوں نے صفین میں صفیں پلٹ دی تھیں ۔ جہاں مسلم بن عقیلؑ ہوں جن پر حسینؑ کو ناز تھا ۔ جہاں عبداللہ ابن جعفرؑ ہوں جو جعفر طیارؑ کے ورثہ دار تھے ۔ وہاں پرورش پانے والا زین العابدینؑ کیا زور طاقت قوت شجاعت اور غیظ و جلال میں کسی سے کم ہو گا ۔ ضرب حیدری کی وراثت ان تک نہیں پہنچی ہو گی ۔

زین العابدینؑ جس طرح نماز سے شغف رکھتے تھے ۔ اسی طرح فن حرب سے بھی واقف تھے ۔ کیونکہ دین جہاد کے بغیر مکمل نہیں ہوتا ۔ اور جہاد کے لئے فن حرب میں مہارت ضروری ہے ۔

کربلا کیلئے روانہ ہونے سے پہلے مدینے میں ایک بار زین العابدینؑ نے ایک زرہ پہنی۔ اس زرہ کا دامن کچھ دراز تھا۔ آپ نے زرہ کو پیر کے نیچے دبایا اور ہاتھ سے زرہ کا اتنا حصہ پھاڑ کے الگ کر دیا جو زیادہ تھا۔ اس زرہ کی کچھ کڑیاں زنگ آلود تھیں جو ہاتھ میں چبھ گئیں۔ اسی اثر سے آپؑ بیمار ہو گئے۔ ہو سکتا ہے کہ زنگ آلود کڑیوں کا بھی مرض میں اتنا زیادہ ہاتھ نہ ہو۔ بس مشیت پروردگار ہی اس مرض کے پس پردہ کار فرما رہی ہو۔ کیونکہ اگر آپ بیمار نہ ہوتے تو کربلا میں جہاد ضرور کرتے اور شہادت پا جاتے۔ جس کے سبب سے نسل مصطفٰے منقطع ہو جاتی جبکہ سورہ کوثر میں پروردگار وعدہ کر چکا تھا کہ نسلِ محمدؐ پھیلے گی اور ان کے دشمن ہی ابتر ہوں گے۔

مسجد نبوی امام کی جولان گاہ تھی۔ یہاں کبھی آپ محراب عبادت میں مصروف ذکر الٰہی نظر آتے تھے۔ کبھی مجالس علمی کی زینت بن جاتے تھے۔ لوگوں نے اشاعت حدیث کے مقصد سے مسجد نبی میں حلقے بنا رکھے تھے۔ اگرچہ امامؑ عالم علم لدنی تھے۔ اور احادیث رسولؐ کا تو اجرا ہی آپ کے گھر سے ہوا تھا۔ اس سلسلے میں آپ کو کسی سے تحصیل علم کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن آپ ان حلقوں میں جا کر بیٹھتے تھے۔ ایک بار کسی شخص نے آپ کو زید بن اسلم کے حلقے میں دیکھا۔ اس شخص نے بعد میں آپ سے کہا۔ آپ اولاد رسولؐ ہیں۔ اور نسب کے لحاظ سے دنیا میں بہترین ہیں۔ آپ زید بن اسلم کے حلقہ درس حدیث میں کیوں شریک ہو جاتے ہیں۔ جبکہ وہ تو آزاد کردہ غلام ہیں۔ امامؑ نے تحمل کے ساتھ فرمایا۔ میرے نانا کا حکم ہے کہ علم جہاں سے ملے وہاں سے لے لو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ صاحب علم غلام ہے یا آزاد۔ اس ایک خوبصورت جملے نے جہاں علم کا اکرام بڑھایا ہے وہاں ان آزاد کردہ غلاموں کی عزت بھی بڑھائی ہے جو معاشرے کی نسبی عصبیت کا شکار تھے۔

کربلا میں جب امامؑ تشریف لائے تو آپ بائیس تیئس سال کے تھے۔ اس

وقت تک آپ نے مدینہ میں ایک اہم شخصیت کی حیثیت حاصل کر لی تھی ۔ خاندان رسالت کے چشم و چراغ ہونے کے علاوہ عبادت و ریاضت، زھد و تقوی اور علم و حلم میں کامل ہونے کی وجہ سے آپ نامور تھے ۔

کربلا کے بعد

کربلا سے بیکسوں کا قافلہ چلا۔ صحرا کی مسافت طے کی۔ کوفہ آگیا۔ یہ طویل مسافت کیسے طے ہوئی ہوگی۔ اسے بے وارثوں کا دل ہی جانتا ہوگا۔ گرمی کے دن تیز دھوپ لُو کے تھپیڑے پانی کا قحط۔ پیاس سے چھوٹے چھوٹے بچوں کا جینا محال۔ اونٹوں کی ننگی پیٹھ پر عورتیں سوار۔ گودوں میں بچے۔ ہاتھ پس گردن بندھے ہوئے۔ غم سے دل پاش پاش۔ رونے کی اجازت نہیں۔ اور اس پر بھی شمر کے دُرّوں کی اذیت۔ شہزادیوں کی پیٹھ زخمی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہتا ہوا۔ لبوں پر جبر نے تالے ڈالے ہوئے۔

اور آفت زدوں کے اس قافلے کا سالار۔ عابد بیمارؑ۔ پیروں میں آبلے پڑے ہوئے۔ آبلوں میں کانٹے چبھے ہوئے۔ خدا کے شیر کا پوتا زنجیروں میں جکڑا ہوا۔ اپنے سر کو جھکائے ہوئے۔ بیواؤں کی بے پردگی پر شرم سے۔ اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کی موت پر افسوس سے اور گردن میں پڑے ہوئے خاردار طوق کے بوجھ سے۔

یہ رسولؐ کی عترت ہے جسکی قیدی بنا کر تشہیر کی جا رہی ہے۔ اور یہ اسی رسولؐ کی امت ہے جو ان قیدیوں کو دیکھکر خوش ہے۔ بازاروں میں ہر طرف ہجوم ہے۔ عورتیں کوٹھوں اور چھتوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔ قیدیوں کی بیکسی کا تماشہ دیکھا جارہا ہے لوگ فاخرہ لباس پہنے پھر رہے ہیں۔ عید کا ساسماں ہے۔ مجمع اتنا ہے کہ قافلے کو آگے بڑھنا دشوار ہورہا ہے۔ ایک جگہ قافلہ رک جاتا ہے۔ ابھی تک شادیانے بج رہے ہیں۔ سبط رسولؐ کے قتل کا جشن منایا جارہا ہے۔ اللہ اکبر کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔

امامؑ نے نظریں اٹھا کر اس مجمع کثیر کا جائزہ لیا۔ جسکے ذہن کو غفلت کے پردوں نے ڈھانک رکھا تھا۔ اب امام کے لب گہرافشاں ہوتے ہیں۔

لیکن یہ کسی بیمار، کمزور اور حوصلہ ہارے ہوئے شخص کی معذرت نہیں ہے۔ فصاحت کا موجیں مارتا ہوا دریا۔ علی کا پُر جلال لہجہ۔ یہ الفاظ نہیں ہیں نوکیلے تیر ہیں جو لوگوں کے دلوں میں اترتے چلے جا رہے ہیں۔

"اے بری قوم! خدا تمہاری کھیتیوں کو سیراب نہ کرے۔ اے وہ قوم جس نے ہمارے ساتھ سلوک میں ہمارے جد کا بھی لحاظ نہ کیا۔ روز قیامت جب تم ہمارے اور رسول اللہؐ کے سامنے آؤ گے تو کیا عذر پیش کرو گے۔ تم ہم کو اونٹ کی ننگی پیٹھ پر اسیر کر کے لیجا رہے ہو۔ گویا ہم نے تم میں دین کی بنیادوں کو استوار نہیں کیا تھا۔"

قابل غور بات کہ ہے کہ امامؑ نے کہیں اس بات کا حوالہ نہیں دیا کہ ہمارے جد محمد مصطفیٰؐ عالم اسلام کے حکمراں تھے۔ یا ہمارے دادا علیؑ اسی منصب پر فائز تھے۔ نہ کہیں اس پر فخر کا اظہار ہے کہ ہمارے خاندان میں صدیوں سے عرب کی سرداری رہی ہے۔ کہیں یہ حوالہ نہیں کہ ہماری شجاعت نے تمہاری حفاظت کی اور ہماری سخاوت نے تمہاری کفالت کی یہاں صرف ایک حوالہ ہے۔ اللہ اور اسکے رسولؐ کا۔ صرف ایک شرف ہے۔ دین کی بنیادیں استوار کرنے کا۔

یہ مختصر شعر مجمع کے سوئے ہوئے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ ہر شخص چونک اٹھتا ہے۔ اب وہ خوشی کی لہر اپنی موت آپ مر چکی ہے۔ وہ میلے کا سماں، تماشے کا انداز، عید کی رونق، جشن کی فضا سب ختم۔ لوگ جیسے ہوش میں آگئے ہیں۔ دلوں پر ایک ہیبت سی ہے۔ ذہن سوچنے پر آمادہ ہیں کہ یہ کون شخص ہے۔ بائیس سال کا جوان جسکا رنگ بیماری اور کمزوری کی وجہ سے زرد ہے۔ اسکا سارا خاندان کٹ

چکا۔ سب کے سر نیزوں پر آویزاں ہیں ۔ یہ اکیلا تنہا بے وارث بے یار و مددگار ۔ اسکی آواز میں تو شکست کی لرزش ہونی چاہیے تھی۔ ایک سورما کا ساجلال کہاں سے آگیا۔ اسکا سارا کنبہ، اسکے گھر کی عورتیں ، اسکے خاندان کے معصوم بچے ۔ سب رسّیوں سے بندھے ہوئے ہیں ۔ اسکی فوج تو جنگل میں سر کٹا کے سو چکی ۔ اسکے اعصاب ابھی تک شکستہ نہیں ۔ ہارنے والا تو صدمے سے گنگ ہو جاتا ہے۔ اسکی زبان سے فصاحت کے سوتے کیسے پھوٹ رہے ہیں ۔ یہ کوئی غیر معمولی شخصیت ہے۔ جس پر زمانے کے حوادث اثر نہیں کرتے ۔

ہاں یہ اسی عہد کی عظیم ترین شخصیت ہے ۔ یہ شیر بیشہ شجاعت ہے ۔ اس خاندان کے لوگ کبھی ہراساں نہیں ہوتے ۔ انہیں موت سے بھی ڈر نہیں لگتا ہے ۔ تیرہ سال کا بچہ بھی کہتا ہے کہ موت تو شہد سے شیریں تر ہے ۔ اور صرف کہتا ہی نہیں ہے ۔ کرکے بھی دکھاتا ہے ۔ جبھی تو تین دن کے پیاسے بہتر سپاہیوں نے ہزاروں لاکھوں کی فوج میں کھلبلی ڈال دی تھی ۔

علی ابن الحسینؑ کی آواز گونجتی ہے ۔

"اے لوگو ! تم میں سے جو مجھے نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں علی ابن الحسینؑ ابن علیؑ ابن ابی طالبؑ ہوں ۔ میں اسکا بیٹا ہوں جسکی بے حرمتی کی گئی۔ جسکا مال لوٹا گیا۔ جسکے عیال کو قیدی بنایا گیا ۔ میں ساحل فرات پر ذبح ہونے والے کا فرزند ہوں جو مظلوم شہید کیا گیا ۔ اور یہ میرے فخر کے لئے کافی ہے"۔

اس سے پہلے دنیا کی آنکھوں نے ہمیشہ یہی دیکھا کہ جو جنگ جیتتا تھا ۔ وہ فخر کرتا تھا ۔ اور ہارنے والا، لٹنے والا، شکست کھانے والا ذلت محسوس کرتا تھا ۔ یہاں جیتنے والے چند لمحوں کے لئے خوش تو ہوئے لیکن اس شدید احساس نے ان کا پیچھا کبھی نہ چھوڑا کہ انہوں نے دنیا کی ہوس میں دین برباد کرلیا ہے ۔ اور جسکے ہاتھ

جکڑے ہوئے ہیں ۔ جسکا کنبہ قید ہے ۔ جسکو نوک نیزہ سے اذیت دی جا رہی ہے ۔ جسکی پشت دروں سے فگار ہے ۔ وہ فخر کر رہا ہے ۔ اور فخر بھی کس بات پر ہے ۔ جس پر آج تک کروڑوں آدمیوں کی آنکھیں اشک برساتی ہیں ۔ اسے فخر ہے اپنے عزیزوں کے سروں کے کٹنے پر ۔ اپنے خیام کے جلنے پر ۔ سامان لٹنے پر ۔ بدن پامال ہونے پر ۔ کیونکہ یہ سب قربانیاں خدا کی راہ میں دی گئی ہیں ۔

موت بد نصیبی ہے تو ان لوگوں کیلئے جو اسی دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں ۔ جو یہاں کی شان و شکوہ، مال و دولت اور غلبہ و اقتدار کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ انکے حصول کیلئے اور انکی بقا کیلئے ہر برے سے برا کام ہر گھٹیا سے گھٹیا حرکت، ہر بھیانک سے بھیانک جرم ہر بڑے سے بڑا گناہ اور ہر شدید سے شدید ظلم کرنے کو تیار رہتے ہیں ۔ جب موت انکے سامنے آتی ہے تو ان کے چہرے ان کے نامہ اعمال کی طرح سیاہ پڑ جاتے ہیں ۔

لیکن اہل حق تو موت کی تمنا کرتے ہیں ۔ انہیں اسکی فکر نہیں ہوتی کہ وہ موت پر جاگریں یا موت ان پر آپڑے ۔ سر پر تلوار لگتی ہے تو انکی زبان سے جملہ ادا ہوتا ہے کہ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا ۔

عقبیٰ پر یقین کرنے والوں کی نظر میں کامیابی کے وہ معنی نہیں ہوتے جو دنیاداروں کی لغت میں ہوتے ہیں ۔ دنیا والوں کیلئے دنیا کے لذائذ کا حصول کامیابی ہے۔ انکے خیال میں وہ کامیاب ہے جس کے پاس مال ہے ۔ دولت ہے ۔ جائیداد ہے مویشیاں ہیں ۔ کھیتیاں ہیں ۔ سرمایہ ہے ۔ محل ہے ۔ اقتدار ہے ۔ کھانے کا وقت ہو تو اسکے دسترخوان پر بہت سے کھانے ہوں ۔ جنھیں وہ کھائے اور اسکے وہ مصاحب کھائیں جو امیر ہیں ۔ سردار ہیں ۔ ارکان دولت ہیں ۔ جنکا اسکے اقتدار اور دولت کی بقا میں حصہ ہے ۔ آرام کا وقت ہو تو نرم تکیے ہوں ۔ گدگدے بستر ہوں ۔ رات ہو تو ہر طرح

کی رنگینیاں میسر ہوں ۔دنیا کی تمام فکروں کو مئے ناب میں غرق کردے ۔ خوابگاہ کی خلوت میں دل کے سکوں کیلئے حسینوں کے عشوے اور غمزے ہوں ۔ چتون کی شوخی وشرارت ہو ۔ اور دن ہو تو اسکے گرد حشم وخدم ہو ۔ حاجب ہوں پہرے دار ہوں ۔ ہٹو بچو کا شور ہو ۔ دوستوں سے یا تو بے فکری کی اور دل بستگی کی گفتگو ہو ۔یا پھر مشورے ہوں ۔ اس موضوع پر کہ سرمایہ کیسے بڑھے ملکیت اور جائیداد کیسے وسیع ہو ۔ سامان آرائش اور اسباب آسائش مزید کیا کیا مہیا کیا جائے ۔ کون کون دولت و اقتدار کیلئے خطرہ بن سکتا ہے ۔ کس کس کی سرکوبی کرنی ہے ۔ یہ ہیں ایک دنیادار کی کامیابی کی مختلف جہتیں سمتیں اور پہلو۔

مگر جو لوگ خدا پر یقین رکھتے ہیں اور یقین بھی ایسا کہ لوکشف الغطا کی سرحدوں کو چھوتا ہو ۔ انکے ہاں کامیابی کا مطلب، مقصد اور مفہوم صرف ایک ہے ۔ بقائے رب ۔ مرضی مولا ۔ خوشنودی پروردگار ۔ اطاعت خالق کائنات ۔ دنیا اپنی تمام رعنائیوں ودلکشیوں لذتوں عیش کوشیوں اور رنگینیوں کے باوجود انکے لیئے ایک خارش زدہ بھیڑ کی ناک کے بہتے ہوئے غلیظ پانی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ۔ وہ دنیا میں رہتے ضرور ہیں ۔ دنیا کو برتتے بھی ہیں ۔ لیکن ان کے پیش نظر دنیا نہیں ہوتی ۔ دین ہوتا ہے ۔ انکی زندگی کا ہر لمحہ اسی انداز سے بسر ہوتا ہے جو ہدایات آسمانی اور آیات قرآنی کے عین مطابق ہو ۔ تاکہ ان کا عمل قرآن کی تفسیر بن جائے ۔

اہل حق کے معیار پر وہ کامیاب نہیں جس نے مال جمع کیا بلکہ وہ کامیاب ہے جس نے خدا کی راہ میں سارا مال لٹا دیا ۔ یہاں بھوکا رہنا کامیابی ہے ۔ پیٹ پر پتھر باندھنا باعث فخر ہے ۔خود پانی سے افطار کرنا اور روٹیاں مسکینوں یتیموں او اسیروں کو دے دینا وجہ ناز ہے ۔ گھر میں بچوں کو فاقہ ہو لیکن سائل دروازے سے خالی نہ جائے ۔ یہاں چادر پر پیوند لگے ہونا ہی عزت کی بات ہے ۔ یہاں زندگی بھر بیوی اپنے

شوہر سے کسی چیز کی فرمائش نہیں کرتی ۔ کیونکہ اس نے جس کی گود میں پرورش پائی ہے وہ اپنے فقروفاقہ پر فخر کرتا تھا ۔ سلطان مدینہ تھا ۔ خندق کھودتا تھا ۔ پیٹ پر پتھر باندھتا تھا ۔

یہاں مال ہے تو صدقہ کر دیتے ہیں ۔ دولت ہے تو خیرات کر دیتے ہیں ۔ جائیداد ہے تو بیچ کر سائل کی ضرورت پوری کر دیتے ہیں ۔ اور گھر آکر کہتے ہیں کہ چادر دو تو گروی رکھکر بچوں کیلئے تھوڑا سا جو کا آٹا لے آؤں ۔

عمل نیک ان کا سرمایہ ہے ۔ قناعت ان کا محل ہے ۔ صبر ان کا اقتدار ہے ۔ دسترخوان پر بہت ہوا تو جو کی روٹی ہوتی ہے اور دودھ اور نمک اور اس پر بھی بیٹی سے کہا جاتا ہے ۔ تیرے باپ نے کبھی دو چیزیں ایک وقت میں نہیں کھائیں ۔ ان میں سے دودھ اٹھا لے بیٹے کے دسترخوان پر بہترین کھانے چنے ہیں ۔ فقرائے مدینہ کی دعوت ہے ۔ اور خود ان سوکھے ٹکڑوں سے افطار کیا جارہا ہے جو گھٹنے پر زور دیکر توڑے جاتے ہیں ۔ کبھی جو کے ستو ایک پیالے میں رکھکر ان پر مہر لگادی جاتی ہے کہ کہیں بیٹیاں باپ کی محبت میں آکر ان میں روغن ملا کے اسے مزیدار نہ کر دیں ۔ لباس خریدنے کا اگر کبھی موقعہ ہو تو آقا اپنے لئے سستا کرتہ خریدتا ہے ۔اور غلام کیلئے مہنگا ۔ سخاوت کا یہاں دریا بہتا ہے ۔ لیکن درم و دنیار کی تھیلی دینے سے پہلے یہ اندازہ نہیں لگایا جاتا کہ اس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں ۔ اس پر کرم کرنے سے کیا کیا سیاسی فوائد حاصل ہو سکیں گے ۔ یہ کتنے حقداروں کے منھ بند کرسکے گا ۔ یہاں تو دیتے وقت صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ خدا کے نام پر سوال کیا گیا ہے ۔ جو میسر ہے دیدو ۔ نہیں ہے تو قرض لے کر دیدو ۔ نماز میں ہو تو انگوٹھی اتار دو ۔ روٹیاں کجاوے میں ہیں تو کجاوہ دیدو کجاوہ اونٹ پر ہے تو اونٹ بھی دیدو اور اونٹ قطار میں ہے تو قطار ہی دیدو ۔ رات اسلئے آتی ہے کہ آرام کیا جائے ۔ لیکن ان کے ہاں رات بستر راحت کا نام

نہیں ہوتا ہے۔ سجادہ طاعت کا نام ہوتا ہے۔ دن میں کہیں مزدوری سے تھک کر نیند آبھی جاتی ہے تو زمین پر ہی لیٹ جاتے ہیں۔ بدن پر گرد لگ جاتی ہے۔ رسولؐ اپنے ہاتھوں سے جھڑاتے ہیں۔ ان کے ہاں رات کو آرام کیسا۔ اگر یہ آرام کریں تو بہت سے غریب اور یتیم بھوکے مرجائیں گے۔ اپنی پیٹھ پر اٹھا کر آٹا بھی پہنچانا ہوتا ہے۔ اور ضعیفہ کے بچے اگر بھوک سے رونے لگیں اور ضعیفہ کو بچے بہلانے پڑیں تو تنور بھی روشن کرنا ہوتا ہے۔ پھر معذرت بھی کی جاتی ہے کہ میں نے تیرا اور تیرے بچوں کا خیال نہ کیا مجھے معاف کردے۔ یتیم بچے کھا پی کر آسودہ ہو کر سوجائیں تو کچھو دنیاوی ذمہ داریوں سے فرصت ہوگئی۔ اب اپنے جسم و ذہن کی تمام توانائیوں کو معرفت کی مئے ناب میں غرق کردینا ہے۔ خوابگاہ کی خلوت میں سکون دل کے لئے دربار احدیت میں سجدے ہیں۔ اب صبح تک یہ ہیں اور محراب عبادت ہے۔

دن میں یا تو بچوں کیلئے معاش کی فکر ہے۔ مزدوری کرتے ہیں۔ یا پھر خوشنودی خالق کی فکر ہے۔ رسولؐ کی خدمت میں رہتے ہیں۔ رسولؐ کی جوتیاں مرمت کر دیں۔ یہی ان کا حشم و خدم ہے۔ شہر علم کے دربار میں ہر وقت حاضری ہے۔ آخرت کی باتیں ہیں۔ عاقبت کی گفتگو ہے۔ اور گفتگو میں موعظت ہے۔ حکمت ہے۔ دنیا کے دار فنا ہونے کا ذکر ہے۔ زاد راہ عقبیٰ ہی کی فکر ہے۔ اگر بولا جارہا ہے تو اس موضوع پر کہ کس کس کے کام آیا جاسکتا ہے۔ کس کس کی مدد کی جاسکتی ہے۔

خدا پر ان کو جو لازوال یقین ہے۔ اس نے انہیں تقویٰ کی اس معراج پر پہنچادیا ہے جہاں آدمی امام المتقین بن جاتا ہے۔ دنیا اسکی نگاہ سے گر جاتی ہے۔ اسکی منزل جوار رحمت پروردگار ہوتی ہے۔ اور اس منزل کیلئے شہادت لازمی ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے زہر آلود تلوار کا مہلک زخم کھانے پر وہ اپنی کامیابی کا اعلان کرتا ہے۔ اور

زندگی کے ختم ہونے پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ کیونکہ اس زندگی کا ہر نفس ہر لحہ ہر پل ہر ثانیہ ہر دقیقہ طاعت خداوندی میں صرف ہوا ہے۔ بندے نے اپنے اعمال خالق کے حضور پیش کر دیے ہیں۔ اب تو رحمت پروردگار اسکے انتظار میں ہے۔

یہ علی ابن الحسینؑ کا خاندانی پس منظر ہے۔ اس نے اسی مکتبہ فکر میں تربیت پائی ہے جہاں رسولؐ امیؐ پہلا معلم تھا۔ رسولؐ نے علیؑ کو اسی طرح علم منتقل کیا۔ جسطرح طائر اپنے بچوں کو بھراتے ہیں۔ جبھی تو علیؑ کہتے تھے کہ پوچھ لو۔ جو چاہے پوچھ لو قبل اس کے کہ میں وفات پاجاؤں۔ اور دعویٰ کرتے تھے کہ میں جانتا ہوں کہ کونسی آیت ناسخ ہے، کونسی منسوخ۔ کون سی متشابہ ہے کون سی محکم۔ کون سی حضر میں اتری کونسی سفر میں اتری۔ کس آیت کا اشارہ کس طرف ہے۔ کس آیت کا مصداق کون ہے۔

یہ قدرت کی قوت تخلیق کا شاہکار رسولؐ۔ کامل ترین انسان۔ پھر اس کامل ترین انسان کی تربیت سے جلا پایا ہوا علیؑ۔ علیؑ کی آغوش میں پالے ہوئے حسنینؑ۔ اور حسینؑ کا نور نظر علی بن الحسینؑ۔ یہ لڑی کتنی مضبوط ہے۔ یہ سلسلہ کتنا مستحکم ہے۔ ان میں بھی شعور محمد عربیؐ کی کارفرمائی ہے۔ جس نے کہا تھا کہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھدو پھر بھی وہی کروں گا جو حکم رب ہے۔ رسولؐ نے بھی تو کفار اور منافقین کے ہاتھوں زندگی بھر اذیتیں ہی اٹھائی تھیں۔ مصیبتیں ہی سہی تھیں۔ آفتیں ہی برداشت کی تھیں کبھی عقبہ بن معیط سر پر اوجھڑی ڈال رہا ہے۔ کبھی بڑھیا کوڑا پھینک رہی ہے۔ کبھی کفار قریش راہ میں کانٹے بچھا رہے ہیں۔ کبھی اہل طائف پتھر مار رہے ہیں۔ رسولؐ نے ان سب پریشانیوں کو کیوں برداشت کیا۔ اس لئے کہ اگر اسی طرح خدا کا نام پھیلنا ہے اسلام کو عروج پانا ہے تو پھر ساری مصیبتیں قبول اور خندہ پیشانی سے قبول۔ نہ شکوہ نہ شکایت نہ بددعا

علی ابن الحسینؑ اسی سلسلہ ہدایت سے تعلق رکھتا ہے ۔ اسکو بھی ہر صدمہ ہر رنج ہر دکھ قبول ہے ۔ کیونکہ یہ سب کچھ خدا کی راہ میں پیش آرہا ہے ۔ اور خدا بہترین اجر دینے والا بھی ہے ۔ بہترین انتقام لینے والا بھی ہے ۔اسکی گرفت سخت ہے ۔ اور کوئی اسکے دائرہ اختیار سے بھاگ کر کہاں جاسکتا ہے ۔

دربار کوفہ

آیئے ذرا چشم تصور سے کوفے کے دربار کا منظر دیکھیں ۔ دربار جسے ظلم کے ہاتھوں نے سجایا اور سنوارا تھا ۔ ابن زیاد تخت پر بڑے غرور کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے ۔ سینکڑوں لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہیں ۔ تخت کے پاس قیدی بے یارو مددگار کھڑے ہیں ۔ ان قیدیوں میں صرف ایک مرد ہے اسکے گلے میں طوق ہے ۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پیروں میں بیڑیاں ہیں ۔ بیمار بھی ہے اور زخمی بھی ہے کیونکہ کربلا سے کوفے تک اسے اونٹ کی پشت سے باندھ کر سفر کرایا گیا ہے ۔ عبیداللہ ابن زیاد تو یہ سوچ کر خوش ہے کہ اسے فتح ہوئی ۔ دنیا میں اسکا اقتدار مستحکم ہوا لیکن اور لوگ صرف حاکم کی خوشی میں خوش ہیں ۔ اس قیدی کو جس کے کنبے کے سارے مرد کربلا کے میدان میں ایک دن میں قتل کردئے گئے ۔ اور جو اس لٹے ہوئے قافلے کا واحد سہارا ہے۔ ابن زیاد دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے کہ یہ کون ہے ۔

کوئی بتاتا ہے اس کا نام علی ابن الحسینؑ ہے ۔

ابن زیاد پوچھتا ہے علی ابن الحسینؑ کو خدا نے قتل نہیں کیا؟

بیمار قیدی تڑپ کر جواب دیتا ہے ۔ "وہ میرا بھائی تھا جسے لوگوں نے قتل

کردیا" ابن زیاد طاقت اور اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر بحث پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور اصرار کرتا ہے۔ کہ نہیں اسے خدا نے قتل کیا ہے۔

رسولؐ کے گھرانے کے پاس ہر دلیل کی بنیاد قرآن ہوتا ہے۔ قیدی نے آیت پڑھی "خدا ہی لوگوں کے مرنے کے وقت انکی روحیں اپنے پاس بلا لیتا ہے اور بغیر حکم خدا کوئی شخص مر ہی نہیں سکتا"۔

مغرور تخت نشین قرآن کے قول فیصل کے بعد کیا دلیل لاسکتا ہے۔ اور اقتدار والے کی عادت یہ ہوتی ہے کہ وہ جواب برداشت نہیں کرتا۔ دھونس اور دھاندلی سے اپنی بات کو صحیح قرار دیتا ہے اور منواتا ہے۔ لیکن قیدی نے تو قرآن پیش کردیا۔ اسکا کیا جواب دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جھلا جاتا ہے۔ اس نے تو یہ سمجھا ہوا تھا کہ ان قیدیوں کے سارے دنیاوی سہارے ختم ہو چکے۔ فوج کٹ گئی۔ رشتے دار قتل ہو گئے نہ کوئی والی ہے نہ کوئی وارث۔ نہ کوئی مددگار۔ پھر سب قید میں ہیں۔ چاہے نیزوں سے ایذا دو۔ چاہے کوڑوں سے تکلیف پہنچاؤ۔ رونے کے سوا اور خدا سے فریاد کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ اب ان مصیبت زدوں میں اتنی جرأت کہاں ہوگی کہ جواب دے سکیں۔ اور اگر جواب دے بھی دیا تو قتل کی دھمکی سن کر چپ ہو جائیں گے۔ اور میری جیت ہو جائے گی۔

چنانچہ ابن زیاد جلاد سے کہتا ہے کہ اس بیمار جوان کو بھی قتل کر دیا جائے۔ بیبیاں لرز جاتی ہیں گھبرا جاتی ہیں۔ پھوپھی بیمار بھتیجے سے لپٹ جاتی ہیں۔ لیکن بھتیجا کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ زنجیروں میں بندھا ہوا ہے۔ لیکن ہے تو خدا کے شیر کا پوتا۔ ہاشمی خون ہے۔ رسولؐ کا ورثہ دار ہے۔ اس خاندان کے لوگ موت کو شہد سے شیریں تر سمجھتے ہیں۔

بیمار قیدی نے سر اٹھایا۔ قدم آگے بڑھائے اور کڑک کر کہا "او ابن زیاد

تو مجھے قتل کی دھمکی دیتا ہے۔ تجھے معلوم نہیں قتل ہونا ہماری عادت ہے اور شہادت ہمارا شرف۔

اللہ اکبر۔ قیدی۔ بیمار کنبے کا سوگوار۔ بے یارو مددگار۔ اور آواز میں یہ طنطنہ۔ لہجے میں یہ جلال۔ جملے میں ذوالفقار کی سی برش۔ ابن زیاد کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ اس خاندان کے سر کٹ جاتے ہیں۔ جھکتے نہیں ہیں۔ موت کی دھمکی رائیگاں جاتی ہے۔ شرمندہ ہوکر موضوع بدلنے کی خاطر اور قیدیوں سے پوچھنے لگتا ہے کہ تم کون ہو۔

بازار شام

کاروان اہلبیت دمشق کے شہر میں باب الساعات سے داخل ہوا۔ سب سے آگے نیزوں پر شہیدوں کے سر تھے۔ انکے پیچھے اونٹوں پر رسول کی عترت۔ بال کھلے ہوئے۔ چہروں پر گرد۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری۔ لبوں پر فریاد۔ بے کجاوہ اونٹ اور ان پر بے یارو مددگار قیدی جنکے ہاتھ پس گردن بندھے ہوئے۔

قیدیوں کو دیکھنے کیلئے پورا شہر امنڈا پڑتا تھا۔ لوگ جشن منارہے تھے۔ عید کا سماں تھا۔ مشہور یہ کیا گیا تھا کہ کسی نے حاکم شام سے بغاوت کی تھی۔ جنگ ہوئی۔ حاکم شام کامیاب ہوا۔ باغیوں کو قتل کردیا گیا اور انکی عورتوں کو اسیر بنالیا گیا۔ ایک بوڑھے شامی نے اس قافلے کو دیکھا اور کہا "خدا کا شکر ہے جس نے تمکو ہلاک کیا اور فتنہ کی جڑکو اکھاڑ ڈالا"۔

امام زین العابدینؑ نے یہ جملہ سنا۔

جس آدمی کے دل پر پورے کنبے کے جوانوں کی موت کا داغ تازہ ہو۔

جسکے خاندان کی عفت مآب عورمیں مجمع عام میں اپنے سر کے بالوں سے چہرے چھپانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اسکے دل کو اس جملے نے کسطرح چھید دیا ہوگا۔ کوئی اور ہوتا تو اپنی اس بے بسی و بے چارگی کے باوجود اس بوڑھے کو برا بھلا تو کہتا۔ اسے بددعا تو دیتا۔ لیکن یہ امام ہے۔ صبر میں سب سے بڑا۔ حلم کی معراج پر پہنچا ہوا۔ اسکے جذبات میں اشتعال کیسے آجائے۔ یہی تو تبلیغ کا وقت ہے۔ اہل ظلم نے عترت رسولؐ کے حوصلے پست کرنے کیلئے اور اپنی دانست میں شکست دینے کے بعد مزید ذلت دینے کیلئے۔ مزید تحقیر کرنے کیلئے جو تشہیر کی تھی۔ کربلا سے کوفے اور کوفے سے شام شہر بہ شہر پھرایا۔ اسی تشہیر کو امامؑ نے اپنے موقف کی وضاحت کیلئے استعمال کیا۔

امامؑ نے اس بوڑھے شامی سے مخاطب ہوکر کہا "تو نے قرآن پڑھا ہے؟"۔ وہ بولا" ہاں پڑھا ہے"۔ پھر امامؑ نے آئتیں تلاوت کیں۔ " قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ "۔ یہ آیت پڑھی ہے؟ "آت ذالقربیٰ حقہ"۔ یہ بھی پڑھی ہے؟ "انما یرید اللہ لیذہب عنکم الرجس اھل البیت یطہر کم تطہیرا ○ "۔ یہ آیت بھی پڑھی ہے۔ شامی بوڑھا اقرار میں سر ہلاتا رہا۔ ہاں یہ بھی پڑھی ہے۔ یہ آیت بھی پڑھی ہے۔ امامؑ نے بڑی نرمی سے کہا "بھائی یہ آیتیں ہماری ہی شان میں اتری ہیں۔ ہم ہی اہلبیت رسولؐ ہیں"۔

شامی بوڑھا حیران و پریشان امامؑ کو دیکھتا رہا۔ اسکے حواس گم ہو چکے تھے۔ وہ سوچنے لگا یااللہ۔ یہ کیا غضب ہوا؟ میں ان کی بے بسی پر خوش تھا جو کائنات میں سب سے افضل ہیں؟۔ میں انکے رونے پر ہنس رہا تھا جو اہل بیت رسولؐ ہیں؟۔ پھر بوڑھے کے لرزتے کانپتے ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور بوڑھے کی مرتعش آواز ابھری۔ "یاخدا میں توبہ کرتا ہوں۔ یااللہ میں ان لوگوں سے بیزار ہوں جنھوں نے حرم رسولؐ کے ساتھ ظلم و جبر روا رکھا۔ بارالٰہ مجھے معاف کردے۔

یہ جملے ایک عام بوڑھے آدمی کے ذاتی جذبات کا اظہار ہی نہ تھے۔ یہ جملے حسینؑ کی آفاقی فتح کا آغاز تھے۔ یہ جملے زین العابدینؑ اور انکے قافلے کے مقصد اعلیٰ کے حصول کی نوید تھے۔ مظلوموں کو، بیواؤں کو، یتیم بچوں کو اور انکے قافلہ سالار سید سجادؑ کو اسی طرح تو بازی پلٹ دینی تھی۔ اپنا تعارف کرا کے، خود کو پہچنوا کے یزید کے ظلم و جبر سے عوام کو آگاہ کرنا تھا۔ کربلا کے صحرا میں بہتر آدمیوں کی چھوٹی سی فوج کی وقتی شکست کو صبر کی تلوار کے جوہر دکھا کے عالمی اور دائمی فتح میں بدلنا تھا۔

تلوار سے مخالف کا گلا کاٹا جاسکتا ہے۔ برا کہنے والے کو موت کے گھاٹ اتارا جاسکتا ہے۔ اعتراض کرنے والے کو صفحہ ہستی سے حرف مکرر کی طرح مٹایا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ سارے کام بہت آسان ہیں۔ دنیاوی نقطہ نظر کے لوگ جنہیں تاریخ فاتحین کے نام سے یاد کرتی ہے، انہوں نے بھی یہی کیا۔ چنگیز، تیمور، شارلمین، ہنی بال، اٹیلا، سیزر، سکندر، ہٹلر۔ سب نے یہی کیا۔ اپنی طاقت کے سامنے لوگوں کو جھکادیا لیکن اب لوگ انہیں کن الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ کوئی قاتل کہتا ہے۔ کوئی وحشی کوئی بھیڑیا۔ لیکن ہر ظلم کو سہتے ہوئے، ہر جبر کو برداشت کرتے ہوئے، اعتراض کے نشتروں کے باوصف، طنز کے تیروں کے باوجود بڑے صبر کے ساتھ، بہت سکون کے ساتھ، انتہائی ملائمت، بے حد درجہ نرمی سے، اعلیٰ ترین اخلاق کے ساتھ، موثر ترین لہجے میں، دھیمے سے کوئی بات کہہ دینا اور پھر اس بات کا سننے والے کے دل میں اترنا، غفلت کے پردے ہٹا دینا، حقیقت کے دریچے کھول دینا۔ یہ ہے مشکل ترین کام۔ یہ بڑے لوگوں کا کام ہے۔ اسکے لئے فوق البشر چاہئے۔ یہ انسانی کردار کا معجزہ ہے۔ اور ایسے معجزے اللہ والے ہی دکھا سکتے ہیں۔

دربار یزید

یزید جیسے متکبر ظالم جابر اور سفاک کا دربار ہے۔ فتح کی خوشی میں جب شہر کی آئینہ بندی ہوئی ہے۔ تو دربار کی آرائش میں کیا کسر چھوڑی گئی ہوگی۔ سات سو کرسی نشین دربار میں حاضر ہیں۔ یزید اپنے تخت پر متمکن ہے۔ اور آج اسکی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ کیونکہ پوری اسلامی حکومت میں حسینؑ ہی وہ سورما تھا جو گرج کر کہہ سکتا تھا کہ میں فاسق وفاجر کی بیعت نہیں کرسکتا۔ اور حسینؑ کی ذاتی خصوصیات اور خاندانی پس منظر کی وجہ سے ہزاروں لوگ انکے ساتھ ہو سکتے تھے۔ اور ایسی صورت حال کو کوئی دنیاوی بادشاہ پسند نہیں کرتا۔ اس لئے کہ بادشاہت وہ نشہ ہے جس کے آگے نہ مذہب کی اہمیت رہ جاتی ہے نہ انسانی رشتوں کی۔ بادشاہت کے حصول اور بقا کی خاطر ہمیشہ بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا اور بیٹا باپ کے مقابل خنجر بکف آگیا۔ بادشاہت کی ہوس بڑی مکار ہوتی ہے۔ اگر بادشاہت کا استحکام ظاہری مذہب سے وابستہ ہو تو فوراً مذہب کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ یزید اسے باقی رکھ سکتا تھا۔ لیکن یزید کا کردار مذہب سے متضاد تھا۔ اور ان دونوں میں اتنا ہی فرق تھا جتنا سیاہ اور سفید میں، نیکی اور بدی میں، حق اور باطل میں ہوتا ہے۔ وہ علانیہ شراب پیتا تھا۔ ماؤں بہنوں بیٹیوں سے نکاح کرتا تھا۔ مسجد کے منبر پر بیٹھ کر اپنے بندر سے کھیلتا تھا۔ اسلام اور اسکے شعائر کا مذاق اڑاتا تھا۔ دین کی روح سے تو اس سے پہلے کے حکمران بھی منحرف تھے لیکن وہ کم از کم مذہب کے ظواہر پر عمل کرتے تھے۔ اور کھلم کھلا کوئی ایسا کام نہیں کرتے تھے جو عام انسانوں کی نگاہ میں مذہب کے خلاف ہو۔ لیکن یزید نے ستم یہ کیا تھا کہ خود کو خلیفہ بھی رسولؐ کا کہتا تھا۔ اپنی حکومت کو اسلامی حکومت کہتا تھا اور اسکے دل میں نہ خدا کا خوف تھا نہ رسولؐ کی عزت۔ نہ قرآن کی عظمت۔ مطلق العنان بادشاہ اپنی من مانی کو قانون کا درجہ دیتے ہیں۔ لیکن یہ دھاندلی دنیا کی حد تک رہتی

ہے۔ یزید اپنی من مانی کو مذہب کا درجہ دے رہا تھا۔ اور اگر حسینؑ اسے چیلنج نہ کرتے تو آج ہم انہی اعمال قبیح کو اسلام سمجھتے جو یزید کے کردار کا جزو تھے۔ یزید کے لئے حکومت کا استحکام اہم تھا۔ اسلئے وہ حسینؑ سے بیعت لینے پر اسقدر بضد تھا کہ اگر بیعت نہ کریں تو قتل کر دیا جائے۔ اور حسینؑ کے لیے مذہب کی حفاظت اہم تھی۔ حسینؑ نے بھی طے کر لیا تھا کہ اس سلسلے میں جو بھی قربانی دینی پڑے گی وہ اپنی پوری رضا کے ساتھ دینگے۔ دنیا کی طاقتیں کر بھی کیا سکتی ہیں۔ سر کاٹ سکتی ہیں۔ لاش پر گھوڑے دوڑا سکتی ہیں۔ گھر والوں کو قیدی بنا سکتی ہیں۔ لیکن حسینؑ کے انکار کو اقرار میں نہیں بدل سکتیں۔

یزید کی پہلی بڑی ناکامی یہی تھی کہ اسکا دنیاوی اقتدار حسینؑ کی بے سروسامانی سے شکست کھا گیا۔ لاکھوں کی فوج ایک آدمی کو جھکا نہیں سکی۔ لیکن اس وقت تک یزید اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ اسے فتح نصیب ہوئی ہے۔ کیونکہ قتل حسینؑ سے اس نے سفاکی، ظلم، بربریت، شقاوت، سنگدلی اور درندگی کی ایک ایسی مثال پیش کر دی ہے۔ جسکے بعد اسکی قلمرو میں کسی کو انکار بیعت کی مجال نہ ہوگی۔

نبوت کے خاندان محترم کی بیبیوں کو سجے ہوئے پر شکوہ دربار کے ایک کونے میں قیدی بنا کر جو کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اسکے دو مقاصد تھے۔ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اگر کوئی یزید کی بیعت سے انکار کرے گا یا یزید کو خلیفہ نہ مانے گا تو اسے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے قتل کر دیا جائے گا۔ مال لوٹ لیا جائیگا۔ گھر جلا دیا جائیگا۔ اور گھر والے قیدی بنالئے جائیں گے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ آل رسول کو demoralise کیا جائے۔ اس لٹے ہوئے قافلے میں جو لوگ ہیں۔ ان کے دل پر حکومت کی ہیبت بیٹھ جائے۔ اور قیدیوں کو اس امر کا یقین ہو جائے کہ وہ بہت کمزور ہیں۔ اسلئے انہیں مستقبل میں بھی کبھی نہ حکومت وقت کی مخالفت کرنی چاہیئے نہ اسکے کسی حکم کو ماننے سے انکار

کرنا چاہئے۔ یزید کا خیال تھا کہ حسینؑ کے خاندان کی عورتیں جب قیدیوں کی حیثیت سے دربار میں کھڑی رہیں گی تو اس سے انکی اہانت ہوگی، بے عزتی ہوگی، ہتک ہوگی۔ اور میری عزت مستحکم ہوجائیگی۔ لیکن یہ یزید کی دوسری بڑی غلطی تھی۔ کیونکہ دنیا والوں کی نگاہ میں دولت، اقتدار، بادشاہت، محل، فوج، دربار یہ سب عزت کی علامتیں ہوسکتی ہیں لیکن عزت کا ایک اور تصور بھی تو ہے۔ وہ تصور جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ "تم میں جو زیادہ متقی ہے وہ زیادہ عزت والا ہے"۔ یعنی عزت کا معیار ہوا خوف خدا، پرہیزگاری، تقوی، عمل نیک، حق سے وابستگی۔ اور یہ عزت کربلا والوں اور اہل حرم سے زیادہ کسے نصیب ہو سکتی ہے۔

یزید تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ دربار میں سات سو کرسی نشین موجود تھے۔ ایک طشت طلا میں یزید کے تخت کے نیچے اس کا سر تھا جو بہترین خلق تھا۔ محمدؐ کا نواسہ تھا۔ سامنے قیدی کھڑے تھے۔ بارہ عورتوں اور بچوں کے گلے ایک ہی رسی سے بندھے تھے۔ وہ بھی اسطرح کہ کوئی بی بی سیدھی کھڑی ہو جاتی تو اسکے پاس کی بچی کا گلا گھٹنے لگتا۔ اور ایک جوان جو بیمار تھا۔ اسکے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور پیروں میں بیڑیاں۔ گلے میں طوق خاردار تھا۔ کربلا سے شام کے دربار تک جو ایذائیں، صعوبتیں، تکلیفیں اور پریشانیاں انھوں نے اٹھائی تھیں وہ انکے چہروں سے ظاہر تھیں۔ چہرے جنہیں بیبیوں نے اپنے بالوں سے چھپایا تھا۔ دل غم سے پاش پاش تھے۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

عصمت وطہارت کے ایوان کی یہ شاہزادیاں کس بیچارگی اور کسمپرسی کے عالم میں کھڑی تھیں۔ اور یزید شراب پینے میں مصروف تھا۔ نامحرموں کے سامنے مجرموں کی طرح سر جھکائے جو بیٹیاں کھڑی تھیں انکے دلوں پر کیا قیامت گزر رہی تھی اسکی یزید کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔

سید سجادؑ نے یزید سے گفتگو کی اجازت طلب کی۔ یزید نے جواب دیا "ہاں جو کہنا چاہتے ہو کہو لیکن اس شرط پر کہ تم بیکار باتیں نہ کرو گے"۔ آپ نے فرمایا "اے یزید! خدا کے فضل و کرم سے میں جس منصب پر ہوں وہاں پہنچ کر انسان کبھی بیکار گفتگو نہیں کرتا"۔ پھر آپؑ نے کہا "اے یزید! میں خدا کی قسم دیکر تجھ سے پوچھتا ہوں کہ اگر رسول اللہؐ ہمیں اس حالت میں دیکھیں تو ان کا کیا حال ہوگا"۔

یزید کو کچھ حیا آئی۔ اس نے حکم دیا کہ جن زنجیروں میں امامؑ جکڑے ہوئے ہیں وہ کھول دی جائیں۔ یزید کا تو یہ خیال تھا کہ حسینؑ کے قتل ہونے سے اور انکے اہل حرم قید ہونے سے خاندان رسولؐ کی عزت گھٹ گئی ہے۔ لہٰذا اس نے خوش کر بڑے فخر سے کہا "تم نے دیکھا کہ خدا نے کیا کیا"۔ اس کا خیال تھا کہ امامؑ محجوب ہوجائیں گے، شرمندہ ہوجائیں گے۔ اور یہ سوچنے لگیں گے کہ ان کے ساتھ واقعی برا ہوا۔ اور جو کچھ ظلم و ستم ان کے ساتھ ہوا اسکا سبب انکار بیعت تھا۔ اگر بیعت سے انکار نہ کرتے تو حسینؑ بہت آرام و آسائش اور سکون کی زندگی گزار سکتے تھے۔

لیکن اس طرف جواب دینے والا حسینؑ کا جگر گوشہ تھا۔ جسکا نہ کوئی شجاعت میں ثانی تھا نہ فصاحت و بلاغت میں کوئی مقابل۔ اس نے کہا "اے یزید ہم نے وہ دیکھا جو قبل خلقت آسمان و زمین اللہ کے علم میں تھا"۔

جملے کے تیور بتا رہے ہیں۔ کہ میرا باپ مارا گیا۔ اسکے ساتھی اس پر قربان ہوگئے۔ گھر جل گیا۔ سامان لٹ گیا۔ اور ہم تیرے قیدی ہیں۔ تو جو ظلم چاہے ڈھا سکتا ہے۔ لیکن اپنی کسی غلط بات پر اب بھی ہم سے ہاں نہیں کراسکتا۔

اب یزید نے اپنی بات منوانے کیلئے دوسرا انداز اختیار کیا۔ وہ انداز جس میں کوئی آدمی بات سمجھاتا ہے۔ کہنے لگا "اے فرزند حسینؑ! تمہارے باپ نے میرے تعلقات کو قطع کیا۔ میرے حقوق سے انکار کیا میری سلطنت میں جھگڑا ڈالا۔ پس

خدا نے وہی کیا انکے ساتھ جو اسکو کرنا چاہیے تھا۔

کیسی مکاری اور ابلیسیت ہے اس انداز میں۔ گویا حسینؑ نے سلطنت میں جھگڑا ڈالا۔ یہ اس پروپیگنڈے کی بنیاد ہے جو آج تک یزیدی کارندے کر رہے ہیں کہ اقتدار کی خاطر جنگ ہوئی تھی۔ ایک فریق ہار گیا۔ ایک جیت گیا۔ دوسرا دھوکا وہ یہ کہکر دینا چاہ رہا ہے کہ خدا نے جو چاہا کیا۔ یعنی قتل حسینؑ کی ذمہ داری خدا کی ہے۔ بعد میں یزید کو قتل حسینؑ کے الزام سے بچانے کیلئے امویوں نے باقاعدہ فلسفہ جبر بنایا۔ جسکی روسے آدمی مجبور محض ہے۔ خدا کے ہاتھ میں ایک آلے کی طرح۔ خدا نے ایک آدمی کے ہاتھوں دوسرے کو قتل کرادیا۔ قاتل بیچارہ کیا کرسکتا تھا۔ وہ تو مجبور تھا۔ قدرت نے اسکے مقدر میں یہی لکھا تھا۔

امام زین العابدینؑ نے بڑے تحمل کے ساتھ یہ جملے سنے اور بلند بانگ لہجے میں جواب دیا۔ ایسا جواب جو بہت واضح، صاف اور موثر ہو۔ جس کے بعد کبھی باطل نہ شہادت حسین کے مقصد کو دھندلا سکے۔ اور نہ اس کی ذمہ داری یزید دوسروں پر ڈال سکے۔ واشگاف لفظوں میں امامؑ نے اعلان کیا "اے یزید! خدا سے ڈر۔ یہ کام خدا نے نہیں کیا۔ بلکہ تیری فوج نے کیا۔ قتل حسینؑ کا ذمہ دار تو ہے۔ میرے باپ نے ہرگز کوئی فتنہ پیدا نہیں کیا۔ میرے باپ نے ہرگز کسی کے حقوق ضبط نہیں کیے۔ خدا لعنت کرے ان لوگوں پر جنہوں نے میرے پدر بزرگوار کو قتل کیا۔

چند مختصر جملوں نے یزیدی فریب کے جال کو کاٹ کر پھینک دیا۔ شہادت حسینؑ کے مقصدِ عظیم پر جو پردے یزید نے ڈالنے چاہے تھے۔ ان سب کو چاک کردیا۔

اس قیدی کے جلال اور استقامت کے قربان۔ اس ظالم کا دربار اپنی شقاوت کی انتہا دکھا چکا ہے۔ اور جسے مزید ظلم کرنے میں کوئی باک نہیں ہے۔ اسکے

دربار میں ایک قیدی جو تنہا ہے، اکیلا ہے، بیمار ہے، ناتوان ہے، غمزدہ ہے، وہ اس شان سے اعلائے کلمۃ الحق کرتا ہے۔ یزید کو قتل حسینؑ کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور قاتلان حسینؑ پر لعنت کرتا ہے۔

شاہی کے پاس، ظلم وستم کے پاس جب کوئی جواب نہیں ہوتا، جب کوئی دلیل نہیں ہوتی، جب کوئی منطق نہیں ہوتی وہ اسی کا سہارا لیتی ہے کہ ایک اور ظلم سہی۔ ایک اور قتل سہی۔ شاید اس قتل سے حق دب جائے، حق چھپ جائے۔ چنانچہ یزید نے امامؑ کے قتل کا حکم دیدیا۔

یہ حکم امامؑ نے سنا۔ بی بیوں نے بھی سنا۔ ستم زدہ بیبیاں اسکے سوا کیا کر سکتی تھیں کہ نالہ و آہ کریں۔ بارگاہ خداوندی میں فریاد کریں۔

لیکن امامؑ نفس مطمئنہ ہے۔ ثبات وعزم کا کوہ گراں۔ موت کی دھمکی نہ اسکے لہجے کی سختی کو کم کر سکتی ہے۔ نہ اپنے موقف پر اسکی مضبوطی کو۔ موت اسے قبول ہے۔ صرف ایک درخواست کرتا ہے۔ ان بے کس اور بے وارث عورتوں کو ان کے وطن تک واپس پہنچادے کہ میرے سوا اب ان کے سر پر کوئی والی و وارث نہیں۔

یزید کیلئے اپنی دنیاوی بادشاہت کا استحکام اس قدر اہمیت رکھتا تھا کہ اس نے امام حسینؑ کو قتل کرنا بھی برا نہ سمجھا۔ لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ قتل حسینؑ کا رد عمل ہی کہیں اسکی سلطنت کو پارہ پارہ نہ کردے۔ چنانچہ اب اسکی کوشش یہ تھی کہ یا تو یہ ثابت کردے کہ حسینؑ واجب القتل تھے یا پھر اس بات کو ثابت کرے کہ قتل حسینؑ کا حکم اس نے نہیں دیا تھا۔ وہ جب بھی دربار میں قیدیوں کو بلواتا تو یہی تذکرہ شروع کرتا۔ لیکن اس شخص نے جسے کمزور، بیمار، ناتواں، مریض، یتیم، غمزدہ، اور سوگوار خاندان تصور کیا جاتا تھا اور جس سے یزید اور اسکے حامیوں کو قطعاً توقع نہیں تھی کہ وہ انکے ارادوں کی راہ میں دیوار ثابت ہوگا۔ اسی نے

انتہائی بے باکی کے ساتھ جابر حکمران کے منھ پر کڑوا سچ بول کر یہ دکھا دیا کہ شکست، فتح تلوار سے نہیں ہوتی ہے۔ دائمی فتح اسی کو نصیب ہوتی ہے جس نے گردنیں نہ کاٹی ہوں۔ بلکہ دلوں کو متاثر کیا ہو۔ایک بار دربار میں یزید نے کہا " تمہارے باپ دادا نے اس بات کی تمنا کی کہ حکومت انکے ہاتھ آئے۔ لیکن شکر ہے اس خدا کا جس نے ان کو قتل کرایا"۔

اس ایک جملے میں اس نے تین جھوٹی باتیں کہیں۔ اور اگر اسکا وہیں جواب نہ دیا جاتا تو تاریخ مسخ بھی ہو سکتی تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ حسینؑ ان سے پہلے علیؑ اور ان سے پہلے رسولؐ نے حکومت حاصل کرنی چاہی۔ اگر رسولؐ کی زندگی کی تمام کوششیں جو اعلائے کلمۃ الحق کے لئے تھیں۔ اور جنکی سمت ہمیشہ وحی خدا نے متعین کی تھی اسے حصول حکومت کی کاوش کہا جائے تو اس کہنے والے کو مسلمان تو کیا انسان بھی نہیں مانا جاسکتا۔ یزید کے وہ اشعار بھی تاریخ میں ابھی تک موجود ہیں جنکا مطلب یہ ہے کہ " نہ کوئی وحی آئی نہ فرشتہ اترا۔ بنی ہاشم نے حکومت حاصل کرنے کیلئے کھیل کھیلا تھا۔ کاش اس وقت وہ لوگ زندہ ہوتے جو بدر میں مارے گئے اور وہ حسینؑ کا سر دیکھتے تو کہتے یزید تیرے ہاتھ کبھی شل نہ ہوں "۔ جو دریدہ دہن اور گستاخ شخص رسولؐ کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے، وہ آل رسول کیلئے کیا نہ کہہ سکے گا۔ دوسری بات یہ کہ حق و باطل کی اس جنگ کو اس نے بادشاہت کے حصول کی رسہ کشی قرار دیا۔ اور کربلا کی وہ عالمگیر اہمیت کم کرنے کی سعی ناکام کی جو ایک ہزار برس سے روز بروز دنیا پر روشن تر ہوتی جارہی ہے کہ۔

کربلا کے معرکے میں تھا سوال اسلام کا

ورنہ تاج بادشاہی تو یہاں ٹھوکر میں ہے

تیسری بات یہ کہ اس ظلم کو یزید خدا سے منسوب کر رہا ہے۔ گویا خدا ہی

یزید کے ظلم کا حامی تھا یا قتل حسینؑ خدا کی مرضی کے مطابق ہوا۔

اب رسالتؐ کے چشم و چراغ نے جواب دیا۔

"اے پسر معاویہ! نبوت اور حکومت ہم اہلبیت سے ہی مخصوص ہے۔ تو اس وقت پیدا بھی نہ ہوا تھا جب معرکہ بدر و احد و خندق میں رسول خداؐ کا علم ہمارے دادا کے ہاتھ میں تھا اور کفار و مشرکین کا پرچم تیرے دادا نے بلند کر رکھا تھا۔

افسوس میرے باپ فرزند فاطمہؑ کا سر تیرے سامنے طشت میں رکھا جائے اور تو خوش ہو۔ اس ذلت کیلئے تیار ہوجا جو قیامت کے دن تجھے ہونے والی ہے"۔

ان مختصر جملوں میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ محمد مصطفےٰؐ کی نبوت حق ہے۔ یہ تاریخی حقیقت بھی بیان کی گئی ہے کہ ہم سلسلہ حق سے منسلک ہیں اور تو سلسلہ باطل سے۔ ایک شجر طیبہ ایک شجر خبیثہ۔ ایک کی طلب کا معیار اقتدار ہے دوسرے کی دعا کا مدعا لقائے پروردگار ہے۔

تاریخ کی نگاہوں نے آج تک کوئی اور قیدی اس جاہ و جلال کا دیکھا ہے جس نے مظلوم ہونے کے باوجود، تنہا ہونے کے باوجود بادشاہ کو اور اسکی تمام طاقت کو اس طرح کا بھرپور چیلنج دیا ہو اور وہ بھی اتنے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہ اس ذلت کیلئے تیار ہوجا جو روز قیامت تجھے ہونے والی ہے۔

اور سب سے بڑا کمال ان جملوں کا یہ ہے کہ یزید متکبر اپنے تمام غرور سلطنت کے باوجود دلیل کے مقابل دلیل اور الفاظ کے مقابلے میں الفاظ نہیں لاپاتا۔

ظلم کے پاس اپنی بات ثابت کرنے کیلئے ایک ہی منطق ہوتی ہے اور اسکا نام ہے تلوار۔ لیکن ظلم کی یہ آخری دھمکی بھی یہاں ناکام ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ تلوار تو اسکے موقف کو تبدیل کراسکتی ہے جو تلوار سے ڈرتا ہو۔ یہ بچے تو ذوالفقار کے

سائے میں جوان ہوئے ہیں۔ ان کیلئے موت شہد سے شیریں ہے۔

ایک بار یزید نے اثنائے کلام میں یہ آیت پڑھی "ما اصابکم من مصیبۃ فما کسبت ایدیکم" (جو مصیبت تم نے اپنے ہاتھوں خود پر ڈالی ہے) امامؑ کے سامنے حوالہ ہی اسلئے دیا کہ کربلا کے سانحے پر اس آیت کو غلط طور سے منطبق کرکے باطل کے اس نقطہ نظر کو کچھ قوت دے کہ حسینؑ کو پتہ تھا کہ یزید کے پاس لشکر زیادہ ہے اور انکے پاس صرف بہتر انصار ہیں۔ لہٰذا انہیں خود ہی سوچ لینا چاہئے تھا کہ جب وہ جنگ جیت نہیں سکتے تو لڑنے سے کیا فائدہ۔ بیعت ہی کرلیتے۔ بیعت نہیں کی تو آخر ہلاک ہوئے۔

یزید کو اس کا اندازہ کہاں ہوگا کہ قرآن نے لفظوں کے نئے مفہوم دئے ہیں۔ اور ہلاکت کا لفظ قرآن میں صرف باطل کیلئے آیا ہے۔ ان لوگوں کیلئے آیا ہے جو آخرت میں گھاٹے میں رہیں گے۔ تباہ تو وہ ہوئے، برباد وہ ہوئے، ہلاک تو وہ ہوئے جنہوں نے قتل حسینؑ اپنے نامہ اعمال میں لکھوایا اور جو ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ جب کوئی مرد خدا احقاق حق کی خاطر، سچ کی سربلندی کی خاطر باطل سے ٹکراتا ہے تو اسکے ذہن میں فتح و شکست نہیں ہوتی۔ اگر یوں ہوتا تو جب رسولؐ نے اعلان نبوت کیا تھا اس وقت تو وہ اکیلے ہی تھے۔ اور چاروں طرف دشمن تھے۔ دور دور تک دشمن تھے۔ بدر، احد، خندق، خیبر کون سا ایسا مرحلہ تھا جہاں مسلمان تعداد اور مادی قوت میں کفار و مشرکین سے زیادہ تھے۔ حق کی خاطر لڑنے والا اکیلا بھی لڑتا ہے۔ اور نہ گھبراتا ہے نہ ڈرتا ہے۔ فرار نہیں ہوتا۔ کرّار ہوتا ہے۔ اسے زرہ کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ اسے موت سے ڈر کب لگتا ہے۔ موت تو اسکی آرزو ہے۔ حسینؑ کی جنگ کربلا اپنے ہاتھوں خود پر ڈالی ہوی مصیبت نہ تھی۔ بلکہ دنیا کو یہ بتانے کی کوشش تھی کہ ہم مٹ جائیں یہ ہمیں قبول ہے لیکن نانا کا دین بچانا ضروری ہے۔

امامؑ نے ٹوکا "اے یزید! یہ آیت ہمارے بارے میں نہیں ہے۔ ہمارے لئے تو یہ آیت اتری ہے کہ

ما اصاب من مصیبتہ فی الارض ولا فی انفسکم الافی کتاب من قبل ان نبراھا ان ذلک علی اللہ یسیر لکیلا تا سو اعلی ما فاتکم و لا تفرعو بما اتا کم ۔

جبر، بربریت اور استبداد کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جو لوگ حکومت کرتے ہیں انہیں سب سے بڑی پریشانی اسی شخص سے ہوتی ہے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حکمرانوں کو جواب دینے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اور جابر حکمران سے بھی زیادہ اس شخص سے انہیں پریشانی ہوتی ہے جو حاکم کی پچھوڑی ہوئی ہڈیاں کھانے کے عادی ہوں اور کاسہ لیسی اور خوشامد کو اپنا وسیلہ رزق قرار دے چکے ہوں۔ یزید کے دربار میں بھی ایسے لوگ موجود تھے۔ انہوں نے حاکم کا تقرب حاصل کرنے کیلئے امام کے قتل کا مشورہ دیا۔

امامؑ نے فرمایا "اے یزید! فرعون کے مشیروں نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کے بارے میں فرعون کو یہ مشورہ دیا تھا کہ انہیں چھوڑ دے اور اولاد انبیا کو قتل نہ کر۔ تیرے درباریوں نے تجھے اسکے خلاف مشورہ دیا ہے"۔

اس ایک جملے میں کتنی باتیں پنہاں ہیں۔ ہم اولاد انبیاء ہیں۔ ہم وارث موسیٰؑ و ہارونؑ ہیں۔ تو وارث فرعون ہے اور تیرے مشورہ دینے والے فرعون کے مشیروں سے بھی زیادہ برے ہیں۔ جبکہ فرعون کے مشیر کافر تھے اور تیرے مشیر دعوی اسلام کرتے ہیں۔ یزید نے سر جھکا لیا۔

یہ سوچتے سوچتے یزید کی عقل جواب دے گئی کہ وہ علی ابن الحسینؑ کا کیا کرے۔ اسلئے کہ وہ اسکا کوئی حملہ کارگر نہیں ہونے دیتے۔ پہلے تو یزید کو گمان تھا کہ یا تو حسینؑ بیعت کرلیں گے۔ یا بیعت نہ کی تو میں انہیں قتل کرادوں گا۔ اور بات

ختم ہو جائے گی۔ یزید کی توجہ صرف مادی نقطہ نظر پر تھی۔ اس نے واقعی امامؑ کو قتل کرادیا۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔ کیونکہ آدمی قتل ہوگیا۔ اصول قتل نہیں ہوسکا۔ اب حسینؑ کا موقف زینبؑ اور علی ابن الحسینؑ کا موقف تھا۔

پہلی کوشش یزید کی یہی تھی کہ قتل حسین کا لوگوں کو زیادہ پتہ نہ چلے۔ چنانچہ اسکی فوج قیدیوں کو غیر معروف اور غیر آباد راہوں سے شام تک لے گئی۔ جہاں آبادیاں راہ میں آئیں وہاں یہ تاثر دیا گیا۔ کہ ایک شخص نے حاکم سے بغاوت کی تھی لیکن حسینؑ رسول کے نواسے تھے۔ انہیں کون نہیں جانتا تھا۔ بس یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ نوک نیزہ پر یہ سر حسینؑ کا ہے نواسہ رسولؐ کا ہے۔ اور ہم اسکے اہل حرم ہیں اہل خاندان ہیں۔ اتنا تعارف کافی تھا۔ زین العابدینؑ نے اور انکی پھوپھی جناب زینبؑ نے ہر جگہ یہ تعارف کرادیا۔ ظالم انہیں بازار سے دربار تک پھرا کر یہ سمجھتے تھے کہ وہ مزید کامیاب ہو رہے ہیں۔ اہل حرم کی تحقیر کرکے۔ لیکن فطرت ان کی خوش فہمی پر طعنہ زن تھی۔ کیونکہ اسی طرح تو حسینؑ کا مشن کامیاب ہورہا تھا۔ یزیدیوں کے ظلم کی تشہیر کرکے۔

جب یزید کو پتہ چل گیا کہ یہ چال کامیاب نہیں ہوسکتی حسینؑ کا قتل بھی ہر ایک کو معلوم ہوچکا ہے اور یہ بھی ہر ایک کو معلوم ہوچکا ہے کہ یہ وہی حسینؑ ہیں جو فرزند رسول تھے اور یہ معلوم کرنے کی کسی کو ضرورت نہیں کہ یہ قتل کیوں ہوا۔ سب جانتے ہیں کہ یہ معرکہ حق و باطل تھا۔ چلو اب اس بات پر ہی پردہ ڈال دیا جائے کہ اس جنگ کا سبب اصول تھے۔ اسکا سبب دین تھا۔ اسکا سبب یہ تھا کہ نیکی برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ بدی خود کو نیکی کہے اور حکومت کرے۔ لوگوں کو یہ باور کراؤ کہ اسکا سبب حصول اقتدار تھا۔ حسینؑ بادشاہ بننا چاہتے تھے۔ مجھ پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔ میں نے انھیں قتل کردیا۔ لیکن سید سجادؑ وہاں موجود ہیں۔ اسیری ہے، قید

ت، پابندی ہے، طوق و سلاسل ہے۔ لیکن لہو کی جگہ رگوں میں روح حریت بھی تو گردش کر رہی ہے۔ یزید نے جب بھی یہ بات کہی اسے جھٹلایا گیا۔ لوگوں کو حق بتلایا گیا۔ چلو اب آخری ترکیب کرتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ خدا ہر شے پر قادر ہے۔ جو کرتا ہے خدا ہی کرتا ہے۔ ہر ایک کی تقدیر خدا نے لکھی ہے۔ مجھے خدا نے بادشاہ بنا دیا اور حسینؑ کو قتل کرادیا۔ یہ سب خدا نے کیا۔ میں اس الزام سے بری ہوں۔ لیکن سید سجادؑ اب بھی موجود ہیں۔ انکی زبان فصیح ہے۔ برہان قاطع ہے۔ دلیل مضبوط ہے کیا کروں۔ اے خدا میرا اور حسینؑ کا معاملہ کیسا سخت آپڑا ہے۔

اچھا حسینؑ کو قتل کردیا۔ علی ابن الحسینؑ کو بھی قتل کردیا جائے۔ پھر تو مجھے کوئی نہیں جھٹلا سکے گا۔ کوئی نہیں ٹوک سکے گا۔ پھر تو میں جو جی میں آئے کرسکوں گا۔ جس چیز کو چاہوں گا دین میں داخل کروں گا اور جس چیز کو چاہوں گا دین سے خارج کرسکون گا۔ کسی بھی حرام کو حلال کرنے میں اور حلال کو حرام کرنے میں مجھے آزادی ہوگی۔

لیکن مصلحت خداوندی تمام کائنات پر محیط اپنے قدرت واختیار کے ساتھ نگرانی کررہی ہے۔ یزید قتل کا حکم دیتا ہے۔ جلاد وار کرتا ہے۔ لیکن تلوار اسکے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑتی ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ "یزید اس جوان کے قتل سے باز آورنہ تیری سلطنت کا شیرازہ بکھر جائیگا"۔

اسی سلطنت کی ہوس سے مجبور ہوکر تو یزید نے قتل حسینؑ کا ارتکاب کیا تھا۔ کیسی قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ اب اسی سلطنت کو باقی رکھنے کیلئے وہ مجبور ہے کہ نائب حسینؑ، وارث حسینؑ کے قتل سے باز رہے۔

دمشق کی جامع مسجد

علیؑ کعبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ مسجد میں شہید ہوئے تھے۔ انکی آدھی عمر کفار و مشرکین سے لڑنے میں گزری تھی اور باقی آدھی عمر اسلام کو ان لوگوں کے فتنوں سے بچانے میں گزری تھی جو مسلمانوں کی صفوں میں بھیس بدل کر آگئے تھے۔ لیکن امت نے اس کا صلہ کیا دیا تھا۔ حکومت شام کی حدود میں تمام منبروں سے علیؑ کو برا بھلا کہا جاتا تھا۔ اور یہ رسم برسوں سے جاری تھی۔

ایک دن یزید نے سوچا کہ علی ابن الحسینؑ کو اس طرح اذیت دی جائے کہ انہیں بھی دمشق کی جامع مسجد میں بلوایا جائے۔ اور انکے سامنے خطیب مسجد علیؑ کو اور آل محمدؐ کو برا بھلا کہے۔

اس نے دمشق کی مسجد میں امامؑ کو طلب کیا۔ امامؑ آگئے تو خطیب کو حکم دیا۔ وہ منبر پر بیٹھ گیا۔ بنی امیہ کی تعریفیں شروع کر دیں۔ امامؑ سنتے رہے۔ اب اس نے علیؑ اور اولاد علیؑ کو برا کہنا شروع کیا۔ امامؑ کی تیوریوں پر بل آگئے۔ لیکن صبر کیا۔ مگر خطیب منبر پر سے جھوٹ بولتا رہا۔ بہتان باندھتا رہا۔ الزام لگاتا رہا۔ ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔ منافقت کی بھی، جھوٹ بولنے کی بھی، خوشامد کی بھی۔ خطیب حدوں سے گزر گیا۔ آخر سید سجاد کو ٹوکنا پڑا "اے شخص تو نے مخلوق کی خوشی کے عوض خالق کی ناراضگی کا سودا کیا ہے۔ گھبرا نہیں۔ آتش جہنم تجھے جلانے کیلئے منتظر ہے"۔

پھر ایک شعر پڑھا۔ "تم لوگ منبر پر علی الاعلان اسکو برا کہتے ہو جسکی تلوار سے اس منبر کا ڈھانچہ مستحکم ہوا ہے"۔

خطیب کیلئے اب اسکے سوا کیا چارہ رہ گیا تھا کہ وہ منبر سے اتر آئے۔

اب امامؑ نے یزید سے کہا " اگر تو اجازت دے تو میں منبر پر چڑھ کر ایسا کلام کروں جو رضائے خداوندی کا باعث ہو اور اسکے سننے سے حاضرین بھی اجر پائیں "۔

یزید نے انکار کر دیا۔

یزید کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر امام زین العابدینؑ کو منبر پر جانے کا موقعہ ملا تو وہ قیامت برپا کردیں گے۔ خطیب معمولی انسان تھا۔ امامؑ علم وفضل کا سمندر ہیں۔ فصاحت انکی کنیز ہے۔ خطیب جھوٹ بول رہا تھا۔ اور جھوٹ کمزور ہوتا ہے امامؑ کی زبان پر صداقت ہو گی۔ صداقت جو طاقت ہوتی ہے۔ روشنی ہوتی ہے۔ اگر امام منبر پر بیٹھ گئے تو بنی امیہ کی رسوائی ہوگی۔

لیکن مجمع نے اصرار کیا۔ یزید نے پھر انکار کیا۔ اب مجمع کی بھی ہمت نہیں تھی کہ اصرار کرے۔ لیکن خود یزید کا بیٹا معاویہ کہنے لگا۔ " اجازت دیدیجے۔ بھلا یہ کر ہی کیا سکتے ہیں "۔

یزید نے اپنے بیٹے کو جواب دیا " تجھے کیا خبر۔ علم ان کو اس طرح بھرایا گیا ہے جس طرح طائر اپنے بچوں کو دانہ بھراتے ہیں۔ یہ فصاحت کے وارث ہیں۔

لیکن اب یزید مجبور ہوگیا۔ اجازت نہ دیتا تو لوگوں کو شبہ ہوتا کہ یزید کی حکومت میں ایسی کون سی کمزوری آگئی ہے کہ وہ ایک قیدی کو منبر پر آنے کی اجازت نہیں دے رہا۔ آخر فصاحت کا آفتاب منبر کے افق پر ابھرا۔ دنیا نے کبھی کوئی ایسا خطیب دیکھا ہے جسکے ہاتھوں میں ہتکڑیاں ہوں۔ پیروں میں بیڑیاں ہوں۔ گلے میں طوق ہو۔ قیدی ہو۔ کلیجے پر یتیمی کا داغ تازہ ہو۔ جو بھرے گھر کا عزادار ہو۔ غریب الوطن ہو۔ قیدی ہو۔ جسکی پشت تازیانوں سے فگار ہو۔ اور مصیبتوں کے اس ہجوم میں جب وہ خطاب کرے تو ابتدا خدائے بزرگ وبرتر کی حمد سے ہو۔

آپؑ نے فرمایا " تعریف زیبا ہے اس خدا کیلئے جسکی ذات کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ وہ ہر اول سے اول ہے۔اور ہر آخر سے آخر۔ وہ مخلوقات کی فنا کے بعد بھی باقی رہے گا۔ وہی دنوں اور راتوں کی قدر مقرر کرنے والا ہے اور انکے درمیان قسموں کا تقسیم کرنے والا۔ بس پاک ہے وہ اللہ جو حاکم اور عالم ہے"۔

دنیا میں تو یہی ہوتا ہے۔ کہ جب آدمی کو اطمینان ہو، سکون ہو، خوشیاں حاصل ہوں، اقتدار میسر ہو، چین سے دن گزر رہے ہوں، تو وہ کہتا ہے کہ خدا کا شکر ہے۔ لیکن جب زمانہ پلٹ جائے۔ لوگ نظریں پھیر لیں۔ ہر طرح کی آفتیں پریشانیاں اور مصیبتیں اسے گھیرلیں۔ ایسے میں آدمی تقدیر کو کوستا ہے۔ زمانے کا شکوہ کرتا ہے خدا سے بھی سوءظن برتتا ہے۔ اسے ایسا لگتا ہے کہ اس پر مصیبت کے یہ دن خدا نے ہی ڈالے ہیں۔ اور اگر یہ پریشانیاں مسلسل ہو جائیں تو آدمی یا خدا کو ظالم سمجھتا ہے یا اس سے منکر ہو جاتا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔

لیکن یہاں ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔ کربلا سے زیادہ ظلم کہاں ہوا ہوگا۔ سید سجادؑ سے زیادہ اذیتیں کسے اٹھانی پڑی ہوں گی۔ اور پھر بھی وہ کلام شروع کرتے ہیں تو حمد پروردگار سے۔ اور وہ حمد بھی اتنی مشرّح اتنی عارفانہ اتنی بلیغ۔

دنیا آل محمدؐ کو مصائب کی چکی میں جتنا پیس سکتی تھی پیس چکی۔ لیکن اب بھی زبان پر وہی ثناو صفتِ پروردگار ہے۔ اب بھی حمد کے زمزمے پھوٹ رہے ہیں۔ اب بھی لب زمزمِ شکر سے تر ہیں۔ اس عالم میں بھی جملوں میں فصاحت ہے۔ جواب میں دلیل ہے۔ الفاظ قرآن سے مستعار ہیں۔ خدا پر یہ یقین اور کسے حاصل ہوا ہوگا۔ اس یقین پر تو پروردگار کو بھی ناز ہوگا۔ انہی کا کردار دیکھکر تو آدمی پکار اٹھتا ہے کہ خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے۔

حمد و درود و سلام کے بعد امامؑ نے رشتہ کلام کو یوں جوڑا۔

"لوگو! خدا نے سخت بلا سے ہمارا امتحان لیا۔ اس نے ہمارے لئے ہدایت کو مخصوص کیا اور ہمارے دشمنوں کیلئے ہلاکت کو۔ خدا نے ہم کو تمام عالم پر فضیلت دی اور وہ چیزیں عطا فرمائیں جو دنیا میں کسی کے پاس نہیں۔

اے لوگو! اللہ نے ہم کو چھ خصوصیات اور فضیلتیں عطا کی ہیں۔ علم حلم شجاعت، سخاوت، فصاحت اور مومنین کے دلوں میں ہماری محبت۔ ہم ہی میں سے نبی ہیں جو سرکار دوعالم تھے۔ ہم ہی میں سے ابوطالبؑ ہیں جو صدیق تھے۔ ہمارے ہی جعفرؑ ہیں جنکا لقب طیار ہے ہمارے ہی حمزہؑ ہیں جو سیدالشھدا ہیں۔ ہم ہی میں سے علیؑ ہیں جو شیر خدا ہیں۔ ہم ہی میں سے سبطین ہیں۔ رسولؐ کے دونوں نواسے جو جوانان بہشت کے سردار ہیں"۔

یہ ہے حسینیت کے نقطہ نظر کی ترجمانی۔

یزید کا تو یہی فخر تھا کہ حکومت اسکی ہے۔ اقتدار اسکا ہے۔ فوج اسکی ہے۔ ملک اسکا ہے۔ کوئی اسے روک نہیں سکتا ٹوک نہیں سکتا۔ چاہے وہ حکومت کے غرور اور شراب کے نشے میں خدا کو جھٹلائے یا رسولؐ کو۔ نہ وحی کو مانے نہ قرآن کو۔ اسکا خیال تو یہی تھا کہ عزت اسے کہتے ہیں کہ آدمی تخت پر بیٹھا ہو۔ ملک زیر نگیں ہو۔ درباری گھیرے ہوئے ہوں۔ دشمن قتل ہو چکے ہوں۔ انکے گھر والے رسن بستہ غلاموں اور کنیزوں کی طرح سامنے کھڑے ہوں۔ اور جو بھی کہا جائے وہ سر جھکا کر سننے پر مجبور ہوں۔

لیکن حسینیت کا ترجمان بہانگ دہل اسے بتاتا ہے کہ عزت کا قرآنی، الوہی، آسمانی اور محمدی تصور کیا ہے۔ عزت وہ ہے جو خدا دے۔ فضیلت وہ ہے جو خدا عطا کرے۔ رتبہ وہ ہے جو آخرت میں ملے۔

دنیا کے منصب ہم کیا کرینگے۔ نبوت ہماری ہے۔ فوج کی طاقت ہمارے

لئے بیکار ہے۔ کیونکہ صداقت ہماری ہے۔ شہرت والقاب و خطابات دنیا سے ہمیں کیا مطلب۔ شہادت ہماری ہے۔ دربار اور محل ہمیں نہیں چاہیئے جنت ہماری ہے۔

اور پھر یک بارگی تعارف کی منزل آجاتی ہے۔

"تم میں سے جو مجھے نہیں جانتا وہ جان لے

میں فرزند مکہ و منیٰ ہوں۔ میں فرزند زمزم و صفا ہوں۔ میں اسکا فرزند ہوں جسکی چادر میں حجراسود اٹھایا گیا۔ جو لباس پہننے والوں میں سب سے افضل ہے۔ میں اسکا فرزند ہوں جو سعی وطواف اور حج کرنے والوں اور لبیک کہنے والوں میں سب سے افضل ہے۔ میں اسکا فرزند ہوں جو براق پر بیٹھ کر جبریل کے ساتھ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا۔ اور اپنے رب سے دو کمانوں بلکہ اس سے بھی کم کی قربت پر فائز ہوا۔ میں اسکا فرزند ہوں جس کے پیچھے ملائکہ آسمان نے نماز پڑھی۔ میں اسکا فرزند ہوں جو حوض کوثر کا مالک ہے۔ میں اسکا فرزند ہوں جس پر قرآن نازل ہوا۔ میں اسکا فرزند ہوں جس نے اپنے عہد کو پورا کیا۔ میں خدا کے رسولؐ کا فرزند ہوں۔ میں اسکا بیٹا ہوں جسکے لئے جنت کے دروازے کھولے گئے ہیں۔ جس پر اللہ کی خوشنودی نازل ہوئی۔

میں اسکا فرزند ہوں جو مومنوں میں صالح ترین تھا۔ نبیوں کا وارث تھا۔ مسلمانوں کا یعسوب تھا۔ مجاہدوں کا نور تھا۔ گمراہوں اور بے دینوں کا قاتل تھا۔ جو اکیلا جنگ کی بازی پلٹ دیتا تھا۔ میں اسکا فرزند ہوں جو سب سے بہادر تھا۔ سب سے زیادہ مستحکم ارادہ رکھتا تھا۔ جو حسنین کا پدر تھا۔ جو سبطین کا پدر تھا۔ علی ابن ابیطالبؑ تھا۔ میں فرزند فاطمہ زہراؑ ہوں جو سیدۃ النساء العالمین ہیں۔ میں فرزند خدیجۃ الکبریٰ ہوں۔

ملاحظہ کیا آپ نے۔ یہ تھی خطابت کی وہ معراج کمال جس سے یزید خوف زدہ تھا اور یہ تھا تعارف کا وہ انداز جس نے سننے والوں میں لرزہ ڈال دیا۔

ارے یہ قیدی جسے زنجیروں میں جکڑ کر مجرموں کی طرح رکھا جاتا ہے یہ رسول کی اولاد ہے۔ یہ سر جو تخت کے نیچے طشت طلا میں رکھا ہوتا ہے اور جسکے دانتوں پر یزید ملعون اپنی چھڑی لگاتا ہے۔ یہ حسینؑ کا سر ہے۔ حسینؑ جس کا گلا رسولؐ چومتے تھے۔ حسینؑ جسے رسولؐ کندھے پر بٹھاتے تھے۔ حسینؑ جسے جنت کے جوانوں کا سردار کہتے تھے۔

یزید نے یہ کیا ظلم کیا۔ اور وہ عورتیں جو دربار کے ایک کونے میں بالوں سے منھ کو چھپائے کھڑی رہتی ہیں۔ روتی رہتی ہیں۔ رسولؐ کی بیٹیاں ہیں۔ یہ جو چادر کی محتاج ہیں انہی کے در سے کوئی خالی نہ جاتا تھا۔ اور یہ بچے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے۔ جو اس رسی میں بندھے ہیں۔ علیؑ و فاطمہؑ کی اولاد ہیں۔ ان بچوں کے گلوں سے جو خون رس رہا ہے۔ اس سے رسّی سرخ ہوگئی ہے۔ ارے ان پر کوئی رحم کیوں نہیں کھاتا۔ ارے قیامت کیوں نہیں آجاتی۔

یہ خیالات تھے جو مجمع کے ذہنوں میں مچل رہے تھے۔

اور ابھی مظلوم سید بیکس کا بیان جاری تھا۔

"میں اسکا فرزند ہوں جو اپنے ہی لہو میں ریت پر آغشتہ ہوا۔ میں اسکا فرزند ہوں جو ظلم وستم سے مقتول ہوا۔ جس کا سر پس گردن سے کاٹا گیا۔ میں اسکا فرزند ہوں جو اب بھی زمین کربلا پر بے گور وکفن پڑا ہے۔ میں اسکا فرزند ہوں جسے پیاسا ذبح کیا گیا۔

میں اسکا فرزند ہوں جس پر اندھیرے میں جنات روئے۔ جس پر فضا میں طائیروں نے نوحہ کیا۔ جس کی بیکسی پر ملائکہ روئے"۔

اس خطبے کو ہوا کے دوش پر پھیلے ہوئے تیرہ صدیاں گزر گئیں لیکن اسکے

الفاظ پڑھکر آج بھی لہو کی روانی بڑھ جاتی ہے۔ دھڑکنیں تیز ہوجاتی ہیں۔ جذبات کے دریا میں سیلاب آجاتا ہے۔ اندازہ کریں اس وقت کیا ہوا ہوگا جب مسجد میں مجمع عام نے امامؑ کی زبان سے سنا ہوگا۔

لوگ سر پیٹنے لگے۔ آہ وفریاد کا شور برپا ہو گیا۔ یزید کو خوف ہوا کہ بغاوت نہ پیدا ہو جائے۔ فوراً موذن کو حکم دیا کہ اذان دیدے۔

بس یہی نکتہ ہے جہاں یزیدیت کو سب سے اچھی طرح سمجھا اور پہچانا جاسکتا ہے۔ اذان کا حکم دیا ہے۔ اچھی بات ہے۔ اسلامی بات ہے۔ لیکن کیا اسلئے کہ نماز کا وقت نکلا جارہاہے۔ ایسا نہ ہو کہ نماز قضا ہو جائے۔ جی نہیں۔ اذان کا حکم دینے کی وجہ صرف یہ ہے کہ زین العابدینؑ کی تقریر نے لوگوں کے دلوں کو گرما دیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ اشتعال میں آکر حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کریں۔ حکومت بچانے کیلئے اذان کا حکم دیا گیا ہے۔ دنیا بچانے کیلئے دین کو استعمال کیا ہے۔ انکے ہاں دین کا لبادہ صرف بھیس بدلنے کیلئے کام آتا ہے۔ ورنہ مقصد صرف دنیا طلبی ہوتا ہے۔

موذن نے گلدستہ اذان میں جاکر اذان دینی شروع کی " اللہ اکبر "

زین العابدینؑ نے کہا "بیشک اللہ بڑا ہے۔ عظیم ہے۔ جلیل ہے۔ بلند ہے۔ ہر اس چیز سے جس سے ڈرا جائے یا خوف کھایا جائے"۔

موذن اب نبوت رسولؐ کی شہادت پر آیا اشھدان محمد رسول اللہ

امامؑ نے تڑپ کے کہا " اے موذن تجھے خدا کی قسم ذرا ٹھہرجا"۔ موذن رک گیا۔ امامؑ نے باآواز بلند یزید سے پوچھا۔ " اے یزید! تو بتا کہ محمدؐ تیرے جد تھے یا میرے۔ اگر تو اپنے جد کہتا ہے تو تمام مجمع گواہی دے گا کہ تو جھوٹ بول رہا ہے۔ اور اگر تو اقرار کرتا ہے کہ میرے جد تھے تو بتلا کہ تو نے کیوں میرے باپ کو قتل کیا۔

ان کا مال لوٹا۔ ان کے اہل خاندان کو اسیر کیا۔ تجھ پر وائے ہو کہ روز قیامت میرے جد تیرے خلاف انصاف طلب ہوں گے"۔

یزید نے نماز کی صفیں درست کرنے کا حکم دیا۔

لیکن لوگوں نے خلافت کی نقاب کے پیچھے دنیاوی بادشاہت کا مکروہ چہرہ دیکھ لیا تھا۔ مجمع پیچ و تاب میں تھا۔ بہت سے لوگ نماز پڑھے بغیر مسجد سے چلے آئے۔

مدح کا تسلسل

فرزدق سے آج تک

خدا کو بندے کی عاجزی پسند ہے۔ فروتنی پسند ہے۔ خضوع و خشوع پسند ہے۔ انابت و استغفار پسند ہے۔ پوری توجہ ذہنی کے ساتھ مانگنا رجوع قلب کے ساتھ گڑگڑانا اور ساری دنیا سے کٹ کے اس کے دربار سے وابستہ ہونا پسند ہے۔ لیکن دنیا والے، دولت والے، اقتدار والے، نمود و نمائش اور قوت کے مظاہرے کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ جب وہ اس عظیم ترین دربار کا قصد کرتے ہیں تو بھی فوجوں کے رسالے ساتھ لے آتے ہیں۔ خادموں کے پرے ساتھ لے آتے ہیں۔ انہیں اپنی طاقت و ہیبت کے اظہار کا شوق تو ضرور ہوتا ہے لیکن مالک کائنات کی عظمت و جبروت کا ذرا سا بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ ورنہ یہ تو وہ جگہ ہے جہاں سب بندے ہوتے ہیں۔ غلام ہوتے ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہوتی۔ مساوات انسانی کا ایسا عالمگیر مظاہرہ اور کہاں ہو سکتا ہے۔ امیر ہو، غریب ہو، شاہ ہو، گدا ہو، طاقت والا ہو، بے بس ہو، پاس کا ہو، دور کا ہو، سب ایک ہی جیسے کپڑے کے احرام میں ملبوس ہوتے ہیں۔ سب کے لبوں پر لبیک اللھم لبیک کا نعرہ ہوتا ہے۔ سب اسی کی خوشنودی کیلئے کوشاں ہوتے ہیں۔ شیطانوں کو پتھر مار رہے ہیں۔ سعی کر رہے ہیں۔ دوڑ رہے ہیں۔ قربانی دے رہے ہیں۔ نمازیں پڑھ رہے ہیں۔ دعائیں کر رہے ہیں۔

ہشام بن عبدالملک شہزادہ ہے۔ اسکا باپ عالم اسلام کا بادشاہ ہے۔ شام عراق حجاز ایران سب جگہ اسی کی شہریاری ہے۔ ہشام حج کرنے آیا ہے۔ لیکن چھوٹا آدمی ہے۔ بڑے دربار کے آداب اسے پتہ نہیں ہیں۔ فانی انسان۔ جسکے دم کا بھروسہ نہیں۔ لیکن دنیاوی اقتدار پر پھولا ہوا ہے۔ شاہی حشم و خدم کے ساتھ آیا ہے۔ نقیب

ہیں چوبدار ہیں دربان ہیں ۔ تاج و تخت ہے زرق برق لباس ہے ۔ چاہتا ہے کہ جس طرح لوگ اور جگہ اسکی عزت و تکریم کرتے ہیں یہاں بھی ہو ۔ اسکا جلوس جب بازار سے گزرتا ہے تو سڑک خالی کر دی جاتی ہے ۔ یہاں بھی ایسا ہی ہو ۔ اتنے بڑے ہجوم میں سب کے ساتھ مل کر عام انسان کی طرح طواف کرنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ چاہتا ہے کہ لوگ راستہ دیدیں ۔ ایک طرف ہو جائیں ۔ ہٹ جائیں اور یہ آرام سے شہزادوں کی طرح طواف کر لے لیکن اسے یہ پتہ نہیں ہے کہ خدا کے دربار میں اکرام کا معیار صرف تقویٰ ہے ۔ یہاں کسی کی حکومت کا دبدبہ نہیں چلتا ۔ بادشاہت کا خیال نہیں کیا جاتا ۔ اقتدار، غلبہ، فوج، دولت ۔ اس سب سے یہاں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔

ھشام کوشش کرتا ہے کہ لوگ اسے دھکے نہ دیں ۔ اسکی بڑائی کا خیال کریں ۔ وہ شام کا شہزادہ ہے ۔ لیکن یہاں جو لوگ طواف میں مشغول و مصروف ہیں وہ یہاں خدا کی خوشنودی ڈھونڈنے آئے ہیں کسی ملک کے شہزادے کی خوشامد کرنے نہیں ۔ چنانچہ کوئی اس کا خیال نہیں کرتا ۔ زمزم کے پاس منبر بچھوا کر ھشام بیٹھ جاتا ہے اور انتظار کرتا ہے کہ جب ہجوم کم ہو تو طواف کر لے گا ۔

اور عین اس وقت ایک دبلا پتلا شخص جسکے چہرے کا رنگ زرد ہے ۔ بدن لاغر اور کمزور ہے ۔ گیسو دونوں شانوں پر لہرا رہے ہیں ۔ خوف الٰہی سے لرزتا ہوا کانپتا ہوا تلبیہ پڑھتا ہوا آتا ہے ۔ طواف کرنے والوں کا ہجوم اتنا ہی ہے جتنا پہلے تھا ۔ لیکن اس شخص کیلئے جو خوف خدا سے رو رہا ہے ۔ جو انتہائی عاجزی اور فروتنی کے ساتھ سر جھکائے ہوئے خدا کے دربار میں داخل ہو رہا ہے ۔ جو تنہا ہے ۔ جو کسی سے نہیں کہہ رہا ہے کہ میرے آگے سے ہٹ جاؤ مجھے راستہ دو ۔ جسکے ساتھ کوئی خدام نہیں ہیں ۔ دربان نہیں ہیں ۔ نقیب نہیں ہیں ۔ ہٹو بچو کا شور مچانے والے نہیں ہیں ۔ جس کو اس عالی ترین بارگاہ میں کھڑے ہونے کے آداب آتے ہیں ۔ جو خالق کائنات کے

حضور میں عجزو انکساری اور سپردگی کا سلیقہ جانتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی بڑے غیر محسوس طور پر لوگ خود بخود راستہ دے دیتے ہیں۔ وہ ایسے سکون اور دل جمعی کے ساتھ طواف کرتا ہے جیسے یہاں وہ بالکل اکیلا ہو۔ شہزادے کے ساتھ آنے والے شام کے باشندے حیران ہیں انہیں اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہشام کا اسقدر بڑا دنیاوی اقتدار کسی نے راستہ نہ دیا اور یہ شخص جسکے ساتھ کوئی نہیں یہ کسی طرح زور زبردستی طاقت یا کبر سے بھی کام نہیں لے رہا۔ خود بخود لوگ اسکے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ اسکا کس قدر احترام ہے۔ یہ کون ہے۔

ایک شامی گھبرا کے ہشام سے پوچھتا ہے۔ یہ کون ہے۔ ہشام کیا کہے۔ ہشام کو اچھی طرح معلوم ہے یہ علی ابن الحسینؑ ہیں۔ جنہیں دنیا امام زین العابدینؑ کے نام سے پکارتی ہے۔ خاندان رسالت کے چشم و چراغ۔ وارث رسولؐ۔ بہترین خلق۔ لیکن کیا وہ اس شامی کو جو اسے نہیں پہچانتا۔ یہ سب بتا کر دوسرے لفظوں میں یہ اعلان کر دے کہ روحانی عظمت و اقتدار اصل چیز ہے۔ بادشاہت، سلطنت، تخت و تاج، فوج کثیر، خزانہ شاہی۔ یہ سب بے قدر چیزیں ہیں۔ ہیچ ہیں۔ جب تک آفتاب کے چہرے پر نور ہے، دریا کی موجیں مچلتی ہیں، پھول کھلتے ہیں، آسمان باقی اور ستارے اپنی جگہ قائم ہیں اس وقت تک انکی حکومت رہے گی۔ لوگ ان کا ذکر کرینگے اور درود بھیجیں گے۔ نام سنیں گے اور عقیدت سے اشک بہائیں گے۔ ان کے آگے شکوہ سلطانی اور غرور جہاں بانی کیا چیز ہے۔ دنیا فانی، عارضی، دنیا کے عیش چند روزہ، جو آج محلوں میں آرام کرتے ہیں۔ تخت پر جلوس کرتے ہیں۔ تاج سے سر کو سجاتے ہیں۔ کل ان کے سر لوگوں کی ٹھوکروں میں ہونگے۔ محل کھنڈر ہو جائیں گے۔

ہشام اپنی دانست میں بڑی عقلمندی کرتا ہے۔ کہدیتا ہے کہ میں نہیں جانتا ہشام کے پاس ھمام بن غالب ابو فراس فرزدق کھڑا ہے۔ وہ شخص جو بنی امیہ کا

درباری شاعر ہے۔ قاعدے سے اسکی ہمدردیاں ہشام کے ساتھ ہونی چاہئیں کیونکہ وہ ان کا نوکر ہے۔ لیکن دینی حمیت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ وہ یہ جھوٹ برداشت نہیں کرتا۔ وہ ہشام سے کہتا ہے کہ اگر تو نہیں جانتا کہ یہ کون ہیں تو سن میں بتاتا ہوں اور ایک فی البدیہہ قصیدہ سناتا ہے۔ اپنے وقت کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ افصح عرب ہے۔ لوگ جمع ہیں۔ واہ واہ کا شور ہو رہا ہے۔ داد و تحسین سے شاعر کا جوش اور بڑھ رہا ہے۔ مداحی کا دریا امنڈ رہا ہے۔ اشعار کے گوہر آبدار اپنی چمک دمک سے لوگوں کو گرویدہ کئے ہوئے ہیں۔

★ یہ وہ ہیں جنکے نشان قدم کو بطحا پہچانتا ہے اور کعبہ وحل و حرم ان سے واقف ہیں۔

★ یہ انکے بیٹے ہیں جو اللہ کے بندوں میں سب سے بہتر تھا۔ یہ پاک و پاکیزہ ہیں اور پرہیزگاروں کے سردار ہیں۔

★ یہ احمد مختارؐ کے بیٹے ہیں۔ جب تک لوح پر قلم رواں ہے اس وقت تک ان پر اللہ کی صلوٰۃ۔

★ ان کا نام علیؑ ہے۔ یہ رسول اللہؐ کے بیٹے ہیں۔ ان کے نور ھدایت سے اماموں کی ہدایت ہوتی ہے۔

★ یہی ہیں جنکے چچا جعفر طیارؓ تھے اور حمزہؓ تھے۔ جو شیر کی طرح تھے۔ ان کی محبت کی قسم۔

★ یہ ابن فاطمہؑ ہیں جو سیدہ النسا عالم تھیں۔ اور علیؑ کے بیٹے ہیں جنکی تلوار میں موت تھی۔

★ اور کون قول اس سے زیادہ برا ہو گا جو تو نے کہا۔ انکی تعریف سے نہ عرب

کو انکار ہے نہ عجم کو۔

★ اگر رکن کو پتہ ہو جائے کہ یہ اسے چومنے کے لیے آئے ہیں تو وہ خود ان کے نقشِ قدم کو چوم لے۔

★ جب یہ رکن حطیم کے استلام کیلئے آتے ہیں تو وہ خود انکے مس کرنے سے راحت محسوس کرتا ہے۔

★ انکی پیشانی کی صبح سے نورِ ہدایت پھوٹتا ہے۔ جس طرح مشرق کی تاریکی کو سورج غارت کر دیتا ہے۔

★ انکے شجرے کی ابتدا رسول اللہؐ سے ہوتی ہے۔ جنکے عناصر پاک تھے اور سیرت نیک تھی۔

★ تو انہیں نہیں جانتا۔ یہ ابن فاطمہؑ ہیں۔ انکے نانا وہ ہیں جن پر خدا نے رسالت ختم کی ہے۔

★ جب قریش انہیں دیکھتے ہیں تو انکے مکارم کی بابت کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ کرم کی انتہا ہیں۔

★ جب لوگ مصیبت زدہ ہوں تو یہ ان کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ انکے شمائل شیریں ہیں اور نعمتیں پر لطف۔

★ جب یہ کہتے ہیں تو سب کان لگا کر سنتے ہیں۔ اور جب بولتے ہیں تو منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔

★ اللہ نے انہیں شروع ہی سے فضل و شرف عطا کیا ہے اور لوح پر قلم نے یہی لکھا ہے۔

* انکے ہاتھ میں جو عصا ہے اسکی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ اور پنجہ تعجب میں ڈالتا ہے۔ اور ناک اونچی ہے غیور کی نشانی۔

* ان کا جد سارے انبیا سے افضل ہے اور اسکی امت کو بھی اور امتوں پر شرف و فضیلت حاصل ہے۔

* ان کے ہاتھوں سے صرف مدد ہوتی ہے اور فائدہ پہنچتا ہے۔ اور انکی سخاوت کبھی کم نہیں ہوتی۔

* یہ اتنے نیک خو ہیں کہ ان سے کسی کو ڈر نہیں ۔ یہ حلم اور کرم کی فضیلتوں کی زینت ہیں۔

* جب یہ غیظ میں ہوں تو شیر ہوتے ہیں۔ اور جب غضب پر آئیں تو موت ان سے کانپتی ہے۔

* مخلوق میں کون ایسا ہے جس کی گردن پر ان کا یا انکے بزرگوں کا احسان و کرم نہیں ہے۔

* عالی طینت ہیں۔ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ انکی سخاوت میں کشائش ہے اور ارادوں میں دانش۔

* یہ شرف کی ان بلند چوٹیوں پر پہنچے ہیں جہاں پہنچنے سے سارے اہل عرب اور اہل عجم قاصر ہیں۔

* ان کے گھرانے سے محبت دین ہے اور ان سے بغض کفر ہے اور ان سے تعلق و تمسک نجات ہے۔

* یہ فیض کے بادل ہیں جب قحط پڑتا ہے۔ اور جب خوف سامنے ہو تو صحرا

کے شیر ہیں۔

★ جب اہل تقویٰ کا ذکر ہو تو یہ انکے امام ہیں۔ جب پوچھا جائے کہ خلق میں کون بہترین ہے تو لوگ انہی کو بتاتے ہیں۔

★ ذکر خدا کے بعد انہی کا ذکر سب سے مقدم ہے۔ ہر کلام کی انہی سے ابتدا ہے اور انہی پر اختتام ہے۔

★ انکی محبت ہر ضرر اور غم کو دور کرتی ہے۔ اور احسان اور نعمتیں تو انکی کنیزیں اور غلام ہیں۔

★ کوئی فیاض انکے کرم کی انتہا کو نہیں پہنچ سکتا۔ اور جس پر یہ کرم کریں اسکا کیا ٹھکانہ۔

★ جس نے ہاتھ کھول دیئے اسکا مال کم نہیں ہوتا۔ ان کے پاس مال ہو یا نہ ہو سب برابر ہے۔

★ قریش میں انکے مکانات چمکتے نظر آتے ہیں۔ مصیبتوں میں اور مسائل میں حکمت دیتے ہیں۔

★ جب صحابہ پر مصیبت پڑی تو انہوں نے ہی مدد کی۔ انہوں نے چھپایا ہم نہیں چھپاتے۔

★ انکی آنکھیں حیا سے جھکی رہتی ہیں اور لوگوں کی نگاہیں انکی ہیبت سے جھکی رہتی ہیں۔ اگر یہ نہ مسکرائیں تو کون ان سے بات کر سکے۔

★ تشہد کے سوا انہوں نے کبھی نہیں نہیں کہا۔ اگر تشہد نہ ہوتا تو آپ کی نہیں بھی ہاں ہو جاتی۔

★ ان کا احسان و عنایت خلق خدا پر تمام ہوا تو نہ غم رہا نہ مفلسی۔

★ ان کے آباء قریش میں سے ہیں جن میں محمدؐ ہیں اور علیؑ جو انکے بعد امام ہیں۔

★ اگر سمجھو تو انکی فضیلت پر بدر کا میدان اور احد کی گھاٹی اور خندق اور یوم فتح مکہ شاہد ہیں۔

★ جس نے اللہ کو جانا اس نے انکی ولا کو جانا۔ امتوں نے انہی کے گھر سے دین پایا ہے۔

خاندن رسالتؐ سے محبت کرنے والوں کو یہ قصیدہ سن کے جتنی مسرت ہوئی ہوگی ہشام اس کو سنکر اتنا ہی جلا۔ وہ بات کو دبانا چاہ رہا تھا۔ تاکہ شامیوں کو نہ پتہ چل سکے کہ اہلبیت محمدؐ کا کیا وقار ہے۔ یہاں تو فرزدق نے مدحت کے چشمے بہادیئے۔ کس حسن و خوبی کے ساتھ اس وارث رسولؐ کے فضائل بیان کیئے کہ دلوں پر نقش ہو جائیں۔

یہ کعبہ ہے۔ یہاں ہشام کا بس نہیں چلتا۔ فرزدق جب مکے سے دو منزل کے فاصلے پر مقام عسفان میں پہنچتا ہے تو اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ یہ ہے حق گوئی کی سزا۔ اور بادشاہت کا جبر۔

یہ قید تو خیر عارضی ہے۔ کیونکہ ہشام کو یہ بھی معلوم ہے کہ اگر فرزدق میرے خلاف ہو گیا تو ایسی ہجو کہہ دے گا جو بچے بچے کی زبان پر آجائے گی۔ چنانچہ اسے رہا کر دیتا ہے۔ اس شکوے کے ساتھ کہ تو نے ہماری شان میں کبھی ایسا قصیدہ نہیں کہا۔ فرزدق نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ " تو اپنے کو ان جیسا بنالے میں تیرے لئے بھی کہدوں گا"۔ اب کوئی اپنے کو ان جیسا کیسے بنائے۔

ان سا عید قدرت نے بنایا ہی نہیں اور

امام زین العابدینؑ عطیہ بھجواتے ہیں ۔ امام ہیں ۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ فرزدق کو دربار بنی امیہ سے کیا ملتا ہے ۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ فرزدق کو ابھی کتنے سال زندہ رہنا ہے ۔

یہ عطیہ اتنا ہے کہ فرزدق کو باقی زندگی یہ نہیں سوچنا کہ معاش کیلئے کیا کیا جائے ۔ یہ وہ ہیں کہ جب دیتے ہیں تو اتنا دیتے ہیں کہ لینے والے کو شکوہ کوتاہی داماں ہو جاتا ہے ۔

فرزدق کے زندہ جاوید قصیدے کا ترجمہ منظوم

مرزا حیدر عباس

چومتی ہے ارض بطحا اس کا ہر نقش قدم
خوب اسے پہچانتے ہیں کعبہ و حلّ و حرم
پڑ گیا کیا فرق ۔ گر تو نے نہ پہچانا اسے
جانتا ہے اسکو تو سارا عرب سارا عجم
تو ہے ناواقف تو سن لے یہ ہے ابن فاطمہؑ
جد اسی کے ہیں محمدؐ صاحب جو دو کرم
اسکا یہ نور نظر ہے جو کہ ہے خیرالبشر
صاحب معراج پاکیزہ نسب والا حشم
فاطمہ زہراؑ کے دل کا چین ہے یہ لاڈلا
ہے علیؑ کا لال جو تھے صاحب سیف و قلم

نام ہے اسکا علیؑ ابن الحسینؑ ابن علیؑ
ہے یہی شمع ہدایت اور قندیل حرم

دیکھ کر اسکو پکار اٹھتے ہیں خاصان قریش
یہ وہ ہے جس کے کرم پر ختم ہے جودو کرم

گر حجر ہو جائے یہ آئے ہیں اسکو چومنے
چوم لے خود بڑھ کے ان کے ہاتھ رکن محترم

پھوٹتا ہے اس کی پیشانی سے یوں نور ھدیٰ
جیسے ہو خورشید سے مشرق کی ظلمت کا العدم

جو شرف اسکو ملا روز ازل سے ہی ملا
مدح میں اسکی ہوا ہے لوح پر جاری قلم

غیظ آ جائے تو پھر مشکل ہے اسکا سامنا
موت بھی کانپے اگر یہ تیغ کو کر لے علم

ہے مثالِ ابر دریا بار اسکا فیض عام
حشر تک ہو گا نہ کم موج عطا کا پیچ و خم

یہ غریبوں کا سہارا ہے یتیموں کی امید
جو ہے جو اسکی عطا ہے فیض اسکا یم بہ یم

اسکے در سے آج تک خالی کوئی لوٹا نہیں
لا ۔ تشہد کے سوا کہتا نہیں یہ خوش شیَم

اپنے وعدوں کا نبھانا اسکی فطرت میں دخیل
رحمت حق کی طرح ہے وسعت خوانِ کرم

زاہدوں کا پیشوا ہے اہل تقویٰ کا امام
پیش خالق اس سے زیادہ کس کا اعزاز و حشم

امن ہو تو اسکا دامن ہے فقیروں کی پناہ
جنگ میں اسکے مقابل شیر بھی کر جائیں رم

اس گھرانے کا ہے یہ جسکی محبت دین ہے
قرب اسکا جو بھی پالے اسپہ واجب ہے ارم

ابتدا و انتہا میں باعث برکت یہ نام
ذکر اسکا ذکر حق کے بعد سب سے محترم

کون ہیں جو اسکی عظمت کے نہیں ہیں معترف
گردنیں کن کی نہیں ہیں اسکے احسانوں سے خم

گفتگو اسکی ہے جیسے فکر کا کھلتا چمن
جسکو سننے وقت کا بحر رواں جاتا ہے تھم

نعمت و احساں تو ہیں اسکی کنیزیں اور غلام
ہے مودت اسکی تریاق ہجوم رنج و غم

دہر میں اسکی فضیلت کو چھپا سکتا ہے کون
خندق و بدر و احد سب اسکے شاہد ہیں بہم

اس گھرانے نے صحابہ کی مدد کی ہر طرح
وہ چھپاتے تھے مگر ایسا نہیں کرتے ہیں ہم

ہے کہاں اسکی عطا کو مال گھٹ جانے کی فکر
پانی پینے سے کہیں دریا بھی ہو سکتا ہے کم

اے خوشا اسکی نگاہ لطف جس پر پڑ گئی
وہ گدا ہو فخر سلطاں جس پہ یہ کر دے کرم

ہے یہی عالم میں تنہا وارث خلق عظیم
رہتی دنیا تک رہے صلوٰۃ اس پر دم بہ دم

وادیٔ عز و شرف میں اسکا وہ اعلیٰ مقام
جس سے ہیں سب لوگ قاصر وہ عرب ہوں یا عجم
اسکے بید مشک کی خوشبو ہے کیسی حشر خیز
صاف ظاہر رخ سے ہے کتنا ہے یہ عالی ھمم
سامنے اسکے جھکی رہتی ہیں نظریں خوف سے
بولنے کی کس میں ہمت گر نہ ہو اسکا کرم
اسکے جد سارے رسولوں میں مثال آفتاب
اور امت اسکے جد پاک کی خیر الامم
اس پیمبر کے گلستاں کا ہے یہ تازہ نہال
جس کے اعلیٰ ہیں فضائل جسکے پاکیزہ شیَم
خلق پر ہے ابر کی صورت سے اسکا فیض عام
کم قیامت تک کبھی ہو گا نہیں اس کا کرم
حلم و حسن خلق سے ہے اس طرح آراستہ
کوئی ثانی اس کا عالم میں نہیں حق کی قسم
چھا گیا ہے فضل اسکا خلق پر اس طرح سے
ہو گئی دنیا سے افلاس و غریبی کا العدم
آخری حد یہ سخا و جود و فیاضی کی ہے
کوئی اس جیسا نہیں گو لاکھ ہوں اہل کرم
دوست تو پھر دوست ہیں دشمن پہ یہ کھاتا ہے رحم
ہے سخاوت اسکی طینت اس کی عادت ہے کرم
جو خدا کو مانتا ہے اسکے رہبر ہیں یہی
ان کے گھر سے دین پاکر ہم ہوئے خیر الامم

ہے رواں اسکی رگوں میں حمزہ و جعفر کا خون
جن کا لوہا مانتے تھے سب شجاعت کی قسم
اس کے مس کرنے سے خود آسودہ ہوتا ہے حطیم
اسکا بڑھتا ہے شرف پہنچیں جہاں اسکے قدم

میر انیس

سر شبیر سے کہتے تھے یہ رو رو سجادؑ
رنج دیتے ہیں مجھے راہ میں اعدا کیا کیا
طوق و زنجیر سنبھالوں کہ مہار اونٹوں کی
کام اتنے ہیں کروں میں تن تنہا کیا کیا
دیکھا مرنے پہ کمر باندھتے جب بابا کو
سر اٹھا تکیے پہ سجاد نے پٹکا کیا کیا
منع جو رونے کو کرتا تو یہ کہتے سجادؑ
کیوں نہ روؤں ستم ان آنکھوں نے دیکھا کیا کیا
دیکھ کر ہاتھ کٹے باپ کے عابد نے کہا
بعد مرنے کے بھی صدمہ تمہیں پہنچا کیا کیا
کہتے عابد خبرِ قتل عزیزاں سن کر
اپنی بیماری کا ہونا ہے مداوا کیا کیا
باغ میں دیکھتے جب سرو تو عابد کہتے
کٹ گئے تیغ ستم سے قدِ رعنا کیا کیا

پھنسے ہوئے تھے بلاؤں میں سید سجادؑ
چھلی تھی طوق سے گردن جدا رسن سے جدا

حشر میں سجادؑ دیں گے یہ حساب
باپ کے ماتم میں رونا ہی رہا
شہسوار دوش احمد کا پسر
قید میں پیدل کئی منزل گیا
بیڑیوں سے پنڈلیاں زخمی ہوئیں
طوق سے نازک گلا چھل چھل گیا

بروز عید بھی آیا جو کوئی ملنے کو
غم حسینؑ میں عابد کو نوحہ گر دیکھا

سجادؑ غرق تھے عرقِ شرم میں انیسؔ
کنبہ نبیؐ کا بلوے میں جب بے نقاب تھا

باپ کو روتے تھے سجادؑ تو کہتی تھی یہ خلق
دیکھ لے جس نے نہ ہو نوحؑ کا طوفاں دیکھا
کہتا سجادؑ سے جو یہ کہ نہ حضرت کو کبھی
مائل سیر گل و سنبل و ریحاں دیکھا
اس سے فرماتے تھے وہ خاک کرے سیر چمن
جس نے تاراج محمدؐ کا گلستاں دیکھا

بھاری تھا اس قدر کہ لعیں لے نہ جا سکے
عابد کو لائے کھینچ کے طوق گراں تلک
تھیں بیڑیاں بھی گوشت میں پیوست ہو گئی
عابد کے پاؤں سوج گئے تھے یہاں تلک
دو نہریں آنسوؤں کی بہا کرتی تھیں مدام
ہجر پدر میں روتے تھے عابد یہاں تلک

زرد چہرہ ہے نحیف و زار ہوں
ماتم سجادؑ میں بیمار ہوں

اللہ ری ناتوانی سجادؑ راہ میں
اک اک قدم پہ بیٹھ گئے نقش پا کے ساتھ

غش آیا راہ میں جس دم تو کہتے تھے سجادؑ
وہ درد ہیں جو امید شفا نہیں رکھتے
تپِ دروں غمِ فرقت ورم پیادہ روی
مرض تو اتنے ہیں اور کچھ دوا نہیں رکھتے

مرزا دبیر

کانٹا اٹھا کے پاؤں میں عابد نے رکھ لیا
تا اور راہ گیروں کو اس سے ضرر نہ ہو

پاؤں سجادؑ کا اے مجرئی زنجیر میں ہے
دم گلے میں ہے گلا طوق گلو گیر میں ہے
خطبہ عابد نے پڑھا جب تو یہ بولی فضہ
کیا فصاحت پسرِ شاہ کی تقریر میں ہے

کہا عابد نے تنِ شاہ پہ لو چلتی ہے
چاہئے دھوپ میں کیا سایۂ دیوار مجھے

عابد نے جو بندھوایا گلا بولی یہ زینبؑ
بس حیدر کرارؑ کے بھی تھے چلن ایسے

جو ہوتے ہیں بے ہوش رستے میں عابدؑ
غضب ہے لعیں بیڑیاں کھینچتے ہیں

عابد پکارے گور غریباں بنا کے آہ
بیمار کے نصیب میں خاک شفا نہ تھی
رعشہ، ورم، بخار و قلق، ضعف و درد سر
عابد کو اتنے عارضے تھے اور دوا نہ تھی
کہہ اے فلک قسم ہے تجھے اپنے ظلم کی
عابد کی پشت لائقِ صد تازیانہ تھی

مشکل کشائی کیجیے سجاد نے کہا

یا مرتضیٰ علیؑ میری گردن رسن میں ہے

ہاتھ اس کے باندھے شمر نے پہنائیں بیڑیاں

جس ناتوان کو عبرِ دست و پا نہ تھی

مقتل میں خیمہ گاہ میں زنداں میں راہ میں

روئے پدر کو عابدؑ مضطر کہاں کہاں

عابد کو غم یہی تھا کہ بابا ہیں بے کفن

دل حسرت شفا میں نہ فکر دوا میں تھا

عابدؑ نے دفن کر کے شہیدوں کو یہ کہا

حصہ نہ اس مریض کا خاک شفا میں تھا

مرزا غالب

ہمارا منہ ہے کہ دیں اس کے صبر و ضبط کی داد

مگر نبیؐ و علیؑ مرحبا کہیں اس کو

زمام ناقہ کف اسکے میں ہے کہ اہل یقیں

پس از حسینؑ علیؑ پیشوا کہیں اس کو

وہ ریگ وادی تفتہ پہ گام فرسا ہے

کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اس کو

امام وقت کی یہ قدر ہے کہ اہل عناد

پیادہ لے چلیں اور نا سزا کہیں اس کو

مصحفی

پسینہ تن سے جو عابدؑ کے پونچھے تھی زینبؑ

دوئم بھی نم ہے جو رومال اولیں تر ہے

میر خلیق

کہتے تھے لعیں گرچہ رسن بستہ ہے عابد

خلقت کی وے عقدہ کشائی نہیں جاتی

راجہ محمود آباد (امیر احمد خان محبوب)

وہ دربارِ شقی اور سید سجادؑ کا خطبہ

لسان اللہ کے فرزند کی تقریر کیا کہنا

مولانا مصطفےٰ جوہر

دو قدم چل کر مرے آقا کہیں تو بیٹھئے

کہتا تھا عابدؑ سے زنجیروں کا لنگر بار بار

ذاکر یاور عباس

عابدؑ نے گزاری تو ہے اک عمر مگر یوں

زنداں میں کبھی گھر ہے تو زنداں کبھی گھر میں

اسعد شاہ جہاں پوری

خوشا صبر و رضائے عابدؑ بیمار کا عالم

تبسم جلوہ گر تھا روزنِ دیوارِ زنداں سے

سیماب اکبرآبادی

اے صبر و رضا کی منزل میں کانٹوں پہ سفر کرنے والے
چھالوں کی چھاگل لیتا چل رستے میں دریا کوئی نہیں

میر محمد علی عارف

ٹپک پڑتے ہیں آنسو یاد کر کے حال عابدؑ کا
لرز جاتے ہیں جب زنجیر آہن گر بناتے ہیں

کوکب لکھنوی

اسیر طوقِ آہن بے گنہ جلاد کرتے ہیں
دعائے بخشش امت مگر سجادؑ کرتے ہیں

دلگیر

اللہ رے ضعف عابدؑ بیمار کا اثر
وہری تو بیڑیاں تھیں ولیکن صدا نہ تھی
دلگیر لب پہ عابد مضطرؑ کے عمر بھر
کچھ بات غیر گفتگوئے کربلا نہ تھی

میر انیس

زخمی عابد کے قدم تھے مگر اللہ رے صبر
کف پا سے نہ سر خار مغیلاں کھینچا

مرزا عشق

عابد دل فگار شام و سحر
پا برہنہ جو راہ چلتے ہیں

ڈوب جاتی ہے خون میں زنجیر

پاؤں سے خار جب نکلتے ہیں

واجد علی شاہ اختر

یہ رہ میں عابد ناشاد کرتے تھے فریاد

صدائے گریہ ہے زنجیر کے ہلانے میں

فقیر محمد گویا

سالک مسلک تسلیم و رضا ہے عابدؑ

مجرئی قید ہے پر عقدہ کشا ہے عابدؑ

حجر اسود ہوا جس کے لئے گویا مداح

وہ امامِ دوجہاں راہ نما ہے عابدؑ

اقبال کاظمی

سب لوگ مانگتے ہیں صحت کی بھیک اس سے

ہوتے ہیں دیکھو ایسے بیمار کربلا کے

مرزا حیدر عباس

شہید کر سکے سجاد کو نہ دشمن دیں

کہ اس کے ساتھ دعاؤں کا اک حصار بھی تھا

بیمار کے سوجے ہوئے پیروں کا یہ اعجاز ہے

زنجیر کی آواز میں تسبیح کا انداز ہے

میر اسد علی متین

فریاد ہے بابا بیداد ہے بابا کوڑوں کی جفا اور تن سجادؑ ہے بابا

کچھ حصر نہیں ظلم کا خولی و عمر پر جو ہے مری قسمت سے وہ جلاد ہے بابا

دکھ پایا ہے بابا غم چھایا ہے بابا
سجاد غریب الغربا آیا ہے بابا

کیا عرض کروں حال کہ لکنت ہے زباں میں
تقدیر نے جو کچھ مجھے دکھلایا ہے بابا

سر مر گیا میں شرم سے جب آل نبی کو
حاکم نے پئے جائزہ بلوایا ہے بابا

چلاتی بہت ہائے پدر کہہ کے سکینہ
ننھا گلا جب رسی سے بندھوایا ہے بابا

غیظ آ چکا تھا پی کے مگر خون جگر کا
جبراً دل رنجور کو سمجھایا ہے بابا

کہتے تھے عابد اے پدر پہنے پھرا میں بیڑیاں
صحرا بصحرا در بدر پہنے پھرا میں بیڑیاں

ماں بہنیں پھپھیاں کھولے سر بیٹھی تھی قیدی اونٹوں پر
اور آگے آگے نوحہ گر پہنے پھرا میں بیڑیاں

ہر روز صدمہ پیاس کا تھا کربلا سے بھی سوا
گرمی میں یعنی ننگے سر پہنے پھرا میں بیڑیاں

حضرت تو ہیں تربت نشیں مجھ کو کہے کون آفریں
کس سے کہوں باچشم تر پہنے پھرا میں بیڑیاں

شکوہ ہے رستے سے سوا ایذائے شہر شام کا
تکلیف سے گو راہ بھر پہنے پھرا میں بیڑیاں

علی ابن الحسین

نجم آفندی

صبر کی شمشیر والے ، دردو غم کے تاج دار
ہے تری طوار میں بھی کاٹ مثل ذوالفقار
تیری ماں وہ ذی شرف ہے نو اماموں کی جو ماں
اے عرب کے شہزادے اے عجم کے شہریار
قید خانے میں تجلی چہرۂ پُر نور کی
حریت کی شان سے روشن جہان تنگ و تار
بعد تیرے سات اماموں نے کیا زنداں پسند
دین و دنیا میں میسر کس کو ایسے ورثہ دار
ایک ہی دن کیلئے تھی جنگ عاشورہ مگر
آج تک زندہ ہے تیری انقلابی کار زار
جھومتے جاتے ہیں جس پر آج آزاد و اسیر
اک اشارہ تیرے نقش پا کا ہے وہ کار زار
وہ دعاؤں کا صحیفہ وہ زبور اہل دل
جس کے اک اک حرف پر صدقے بیاض روزگار
بے تشدد جنگ سیکھی تجھ سے اہل ہوش نے
آج تیرے صبر کے جوہر ہوئے ہیں آشکار
کل حقارت سے جسے دیکھا تھا اہل شام نے
وہ اسیری آج ہے سرمایہ صد افتخار
ضبط سے تیرے نمایاں اضطراب کائنات
بے کسی میں تیری پنہاں انقلاب روزگار

لاکھوں بوسے تیرے زخمی پاؤں کی زنجیر پر

جس کی ہر آواز تھی تجھ کو نوائے خوشگوار

نجم اسکی نذر ہے یہ ولولہ انگیز نظم

جس کی حسرت ناک خاموشی تھی طوفاں درکنار

عبدالرؤف عروج صاحب کے مرثیے سے اقتباس

بیخ مرگ و ہلاکت ہے علی ابن الحسینؑ

قاطع ظلم و شقاوت ہے علی ابن الحسینؑ

رافع بام امامت ہے علی ابن الحسینؑ

شافع روز شفاعت ہے علی ابن الحسین

رحم اسکا عام ہے اخلاص میں اجلال میں

دوڑتا ہے خون بنکر نبض ماہ وسال میں

لفظ کن کا مدعا تقدیر کا منشا علیؑ

علم و عرفاں کا سمندر عفو کا دریا علیؑ

جرأت و ایثار میں بے مثل بے ہمتا علیؑ

یہ علی ابن الحسینؑ ابن علیؑ گویا علیؑ

اس نے افتاد جہاں کا رخ بدل کر رکھدیا

جہل و نخوت کے خداؤں کو کچل کر رکھدیا

مطلع فکر و نظر پر آشکارا ہے علیؑ
خود بھنور آواز دیتے ہیں کنارا ہے علیؑ
ہاں غریبوں کا ضعیفوں کا سہارا ہے علیؑ
ہاں حرم کا لاڈلا زمزم کا پیارا ہے علیؑ

یہ علیؑ ابن الحسینؑ آموزگارِ بندگی
زندگی کو سونپ دیتا ہے شعارِ بندگی

یہ علی ابن الحسینؑ اسکا زمانے پر کرم
یہ فضائے قدس میں مہر عرب ماہ عجم
علم و دانش جود و تقوی اسکا سامان حشم
اسکی عظمت کی قسم کھاتی ہے دیوار حرم

آسمانوں کی زمینوں کی خبر رکھتا ہے یہ
منقلب ہوتے زمانوں پر نظر رکھتا ہے یہ

بندگی کا ہر قدم پر حق ادا اس نے کیا
زندگی کو حق نما حق آشنا اس نے کیا
زندگی ناقص تھی اسکو کیمیا اس نے کیا
کربلا کی خاک کو خاک شفا اس نے کیا

کربلا کی سرخیاں اس نے فضا میں گھول دیں
اس طرح سے فکر انسانی کی گرھیں کھول

زہد میں ایثار میں لطف و عطا میں صرف وہ
عفو میں اخلاص میں صبر و رضا میں صرف وہ
دبدبے میں عزم میں صدق و صفا میں صرف وہ
کربلا میں تھے بہتر اس بلا میں صرف وہ

اس نے دیکھا اس بلا کے دور تک آثار ہیں
اس بلا کی اشتہا کو بستیں درکار ہیں

شکر کی توفیق خالق کی رضا دیتا ہے وہ
بے پری کو وسعت ارض و سما دیتا ہے وہ
بے کف دریوزہ گر دنیا سوا دیتا ہے وہ
زندگی عریاں تھی ملبوس دعا دیتا ہے وہ

فقر و عرفاں کی ضیا سے آگہی کے نور سے
اس کی راہیں جگمگاتی ہیں خودی کے نور سے

ہے بیاباں میں بہاروں کی ہوا اسکی دعا
یا زمیں پر آسمانوں کی فضا اسکی دعا
یا مسلسل رحمتوں کا سلسلہ اسکی دعا
یا مکمل معجزہ ہی معجزہ اسکی دعا

وہ دعا اک رابطہ ہے ساجد و مسجود میں
دوسرا کوئی نہیں دنیائے ہست و بود میں

ہیں دعائیں اسکی شیون ہائے دنیا کا علاج
ہیں دعائیں اسکی خاموشی میں گویا احتجاج
وہ دعاؤں سے مٹاتا ہے طلسم تخت و تاج
وہ دعاؤں سے بناتا ہے زمانے کا مزاج

ہیں دعائیں صبر بھی تسلیم بھی ایثار بھی
زندگی کے معرکے میں ڈھال بھی تلوار بھی

اسکی ہیبت سے پریشاں حکمرانوں کی نگاہ
اسکی عظمت سے نگوں سر طرہ و تاج و کلاہ

ڈھونڈتی ہے آدمی کی عافیت اسکی پناہ
ہیں دعائیں اسکا لشکر درگزر اسکی سپاہ
زندگی کا زندگی کی روشنی کا نام ہے
کیا علی ابن الحسینؑ ایک آدمی کا نام ہے

وہ خودی کی رمز سکھاتا ہوا آگے بڑھا
کلمۂ توحید دہراتا ہوا آگے بڑھا
عرصہ آفاق پہ چھاتا ہوا آگے بڑھا
ہر ملوکیت کو ٹھکراتا ہوا آگے بڑھا
ظلم کی زنجیر ہاتھوں میں سلاسل پاؤں میں
اور اسکے ساتھ آزادی کی منزل پاؤں میں

خواب ابراھیم کی کیا کیا تھیں تعبیریں بہیں
جذبہ بیداری انساں کی تفسیریں بہیں
شام کے آذر کدے میں اس نے تکبیریں کہیں
روک سکتی تھیں اسے پاؤں کی زنجیریں کہیں
وہ نہ سہما صاحبان لشکر و دربار سے
کٹ گئے طاغوت اسکی جرأت گفتار سے

بے خودی کیا یہ غلاموں کو سکھاتا ہے علیؑ
ظلم کے نفرت کے چنگل سے چھڑاتا ہے علیؑ
اپنی تکبیروں سے باطل کو مٹاتا ہے علیؑ
اپنی زنجیروں سے دنیا کو جگاتا ہے علیؑ
یہ علی ابن الحسینؑ اس پہ خودی کو ناز ہے
اولیں آزادی اقوام کی آواز ہے

اس سے روشن اس سے تاباں زندگی کا ہر افق
یہ الٹتا ہے زمانے کے حوادث کا ورق
کاشفِ فکر و نظر اسکی صداقت کا سبق
یہ علی ابن الحسینؑ آئینہ کردارِ حق

دشمنوں کو صبر کی قوت سے پسپا کر دیا
تشنگی کو دی وہ سیرابی کہ دریا کر دیا

ہوں حوادث کے تھپیڑے یا بلا کی آندھیاں
خود پرستی کی ہلاکت کی انا کی آندھیاں
ظالموں کے ظلم ہائے ناروا کی آندھیاں
داستاں گویوں کے فہمِ نارسا کی آندھیاں

کچھ اثر ان کا عقیدت کے سفینے پر نہیں
دل پہ اس کا نام کندہ ہے نگینے پر نہیں

وہ امامِ جزو و کل وہ کربلا کی یادگار
وہ صداقت کا نگہباں وہ خودی کا پاس دار
اس سے ایماں سربلند اس سے عبادت خوشگوار
اس سے زمزم میں روانی اس سے کعبہ پر بہار

وہ بڑھا اسود کی جانب بھیڑ ساری چھٹ گئی
کثرتِ حجاج کائی کی طرح سے پھٹ گئی

وہ امام اسکی امامت دونوں عالم کی خبر
وہ امام اسکی امامت جلوہ شام و سحر
وہ امام اسکی امامت حق شناس و حق نگر
ہاں مگر ہشام بن عبدالملک کو کیا خبر

جبر تاج و تخت سے ایماں بدل سکتے نہیں
اقتدار و شرع دونوں ساتھ چل سکتے نہیں

کون ہے یہ پوچھ زندانوں سے درباروں سے پوچھ
کون ہے یہ شام کے کوفے کے بازاروں سے پوچھ
کون ہے یہ، یثرب و بطحا کے میناروں سے پوچھ
یہ نہیں ممکن تو ہم جیسے عزاداروں سے پوچھ

اسکی منت کی ہیں زنجیریں ہمارے ہاتھ میں
یا نجات بند غم کے استعارے ہاتھ میں

جذبہ عباس کے سوز وفا کی روشنی
سینۂ اکبر کے اخلاص و صفا کی روشنی
اصغر بے شیر کے عزم و غا کی روشنی
یہ مدینے کا اجالا کربلا کی روشنی

کربلا کی روشنی اس نے بکھیری عام کی
نذر دیتے ہیں عقیدت کیش اسکے نام کی

جب کوئی افتاد آئے کام آتا ہے یہی
دیرے بھٹکے ہوؤں کو رہ پہ لاتا ہے یہی
پتھروں کو موم کر کے دل بناتا یہی
کربلا کی خاک سے سورج اگاتا ہے یہی

دل میں کچھ اسکی محبت کے سوا شامل نہیں
یہ فرزدق کے قصیدے کا ورق ہے دل نہیں

امید فاضلی کے مرثیئے سے اقتباس

زعم و نخوت میں ادھر تخت پہ تھا ابن زیاد
اور ادھر سر کو جھکائے ہوئے بیکس سجاد
اس طرف طنز کے نشتر لئے حرف بیداد
سچ ادھر لب پہ جو آیا تو پکارا جلاد
ہم کو کہتا ہے شقی اسکی سزا دی جائے
گردن عابد بیمار اڑا دی جائے

بولے عابد کہ شہادت ہے فضیلت اپنی
سر کٹانا سر مقتل ہے سعادت اپنی
جان دینا رہ حق میں ہے عبادت اپنی
تیغ کی دھار پہ چلنا تو ہے فطرت اپنی
کاش تو جانتا عابد کو ڈرانے والے
کب ڈرے موت سے احمد کے گھرانے والے

بات جب حد سے بڑھی تب سر دربار یزید
مطلع تیرگی شام پہ ابھرا خورشید
حمد کے بعد اٹھائی جو سخن کی تمہید
نور یسین نے کی نور نظر کی تائید
صبح طیبہ کا سر شام پھر آغاز ہوا
عقل کی آنکھ کھلی علم کا در باز ہوا

جس کا سایہ نہ تھا اس نور کے سائے سائے
منبر احمد مختار پہ سجاد آئے
جہل کی دھوپ ڈھلی علم کے بادل چھائے
ہوش و ادراک نے گم کردہ زمانے پائے

وارث علم فصاحت کے گہر رولتے تھے
یا پس پردہ سجادؑ ۔ علیؑ بولتے تھے

پھر سے تاریخ نے دہرایا محمدؐ کا عمل
روح بوجہل میں پھر سے ہوئی برپا ہلچل
جگمگا اٹھا سر شام مدینے کا کنول
پھر قلم جیت گیا ہار گئی تیغ اجل

لب بیمار سے قرآن خدا بول اٹھا
عقدہ مشکل تھا تو خود عقدہ کشا بول اٹھا

ابھری آواز تو کعبے کی جلالت جاگی
افق نطق پہ الفاظ کی قسمت جاگی
جاگے الفاظ تو قرآن کی فصاحت جاگی
اس فصاحت میں ید اللہ کی ضربت جاگی

اور اس ضرب نے پندار ستم توڑ دیا
ایک بیمار نے طاقت کا بھرم توڑ دیا

ابھری آواز کہ عزت تو ہے اللہ کی دین
مجھ کو پہچان لے کہتے ہیں علی ابن حسینؑ
مجھ کو ورثے میں ملا علم رسول الثقلینؐ
خط تمیز ہوں میں باطل و حق کے مابین

منزل علم پیمبر ہیں تو میں جادہ ہوں
مجھ کو عزت یہ ملی ہے کہ نبی زادہ ہوں

اس کا فرزند ہوں نازل ہوا قرآن جس پر
اسکا فرزند ہوں کہتے ہیں جسے علم کا در
اس کا فرزند ہوں تطہیر ہے جسکی چادر
اسکا فرزند ہوں جو خوں میں نہایا بڑھ کر

جس پہ روتے ہیں ملک لخت جگر اسکا ہوں
لاش روندی گئی جس کی میں پسر اسکا ہوں

نام آیا جو محمدؐ کا اذاں میں تو کہا
نام کیا نام ہے یہ نام خدا صل علی
یہ ہے وہ نام جو تخلیق کا عنوان ہوا
اے موذن تجھے مولا کی قسم ٹھیر ذرا

نام نامی کی جلالت تو بیاں ہو جائے
کس کا وارث ہوں یہ لوگوں پہ عیاں ہو جائے

پھر یہ ارشاد کہ محبوب احد کس کے ہیں
مثل قرآن مبیں لفظ سند کس کے ہیں
جن کا ہے نام اذانوں میں وہ جد کس کے ہیں
جلوے پھیلے ہوئے تا شام ابد کس کے ہیں

وارثِ احمد مختار بھلا تو ہے کہ میں
پسرِ مکہ و فرزند منیٰ تو ہے کہ میں

یہ تھا وہ وقت کہ حق گوئی پہ تعزیریں تھیں
فکر قرآن بدل جائے یہ تدبیریں تھیں

اپنے ماخذ سے جدا لفظ کی تعبیریں تھیں
حق پرستوں کیلئے طوق تھے زنجیریں تھیں

ایک بیمار نے یوں حق کی مسیحائی کی
ڈوبتی نبضیں ابھرنے لگیں سچائی کی

یہ وہ بیمار تھا کہتے ہیں جسے سب سجادؑ
پاک دل پاک نظر نیک نفس نیک نہاد
ہر نفس معرکہ علم میں مصروف جہاد
اس نے وہ فکر دی ٹھہرے جو یقیں کی بنیاد

صورت ابر کرم اسکی دعائیں برسیں
ہاتھ اٹھنے بھی نہ پائے کہ گھٹائیں برسیں

فہم شاہی سے پرے اسکے یقیں کی پرواز
وہ تیقن وہ تضرع دم تسبیح و نماز
صاحب زہد و ورع واقف تہذیب نیاز
وہ دعاؤں کا صحیفہ وہ محبت کا گداز

اسکے انفاس کی خوشبو کو صبا چومتی تھی
جب وہ چلتا تھا تو کعبے کی فضا جھومتی تھی

یہ وہ عابد ہے کہ نازاں ہے عبادت جس پر
یہ وہ سجاد کہ دن رات رہا سجدہ بہ سر
یہ وہ رہبر کہ مودت رہیں الیاس و خضر
یہ وہ بیمار کہ چھینا گیا جسکا بستر

ایک ہی دن میں بھرے گھر کو کیا صبر اس نے
ایسا صابر کہ تہتر کو کیا صبر اس نے

زنداں سے چھٹ کے صاحب آزار آئے ہیں

نجم آفندی

کوفے کو فتح کر کے عزادار آئے ہیں — قیدی بلا کے شام کا دربار آئے ہیں
اشکوں کی نذر لے کے دل افگار آئے ہیں — زنداں سے چھٹ کے صاحب آزار آئے ہیں
اٹھو حسین عابدِ بیمار آئے ہیں

قربانیوں کو صبر سے محکم بنا دیا — سب کو تمہارے درد کا محرم بنا دیا
ہر اہل دل کو صاحب ماتم بنا دیا — ماتم زدوں کے قافلہ سالار آئے ہیں
اٹھو حسین عابدِ بیمار آئے ہیں

جس جس نے دل پہ داغ لیا تھا وہ ساتھ ہے — اکبر کو جس نے صبر کیا تھا وہ ساتھ ہے
اصغر کو جس نے نذر دیا تھا وہ ساتھ ہے — صورت دکھاؤ طالب دیدار آئے ہیں
اٹھو حسین عابدِ بیمار آئے ہیں

تھے جس کے منتظر وہ خزینہ کہیں نہیں — وہ غم نصیب شاہ مدینہ کہیں نہیں
سب ہیں تمہاری بالی سکینہ کہیں نہیں — کھو کر اسے یہ بیکس و ناچار آئے ہیں
اٹھو حسین عابدِ بیمار آئے ہیں

ساحل پہ کوئی روکنے والا نہیں رہا — کیا قافلہ حضور کا پیاسا نہیں رہا
اب گھاٹ پر فرات کے پہرہ نہیں رہا — لے کر خبر یہ آپ کے غم خوار آئے ہیں
اٹھو حسین عابدِ بیمار آئے ہیں

فریاد و اشک و آہ کی رخصت بھی مل گئی — ہاتھوں کو قید و بند سے فرصت بھی مل گئی
ماتم کی غمزدوں کو اجازت بھی مل گئی — مجلس کرینگے گے دھوم سے زوار آئے ہیں
اٹھو حسین عابدِ بیمار آئے ہیں

ارمان دل نبی کے دل آرام ہے کوئی — اہل وطن سے جان وطن کام ہے کوئی
نانا کی قبر کے لئے پیغام ہے کوئی — یثرب کی سمت جانے کو تیار آئے ہیں
اٹھو حسین عابدِ بیمار آئے ہیں

دعا اور اسکی ضرورت

آیئے پہلے ذرا کائنات کے وسیع پس منظر میں انسان کی حیثیت کا تعین کریں ۔ ہماری زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی سے ڈھکا ہوا ہے ۔ اور اس پانی میں لاکھوں قسم کی مچھلیوں کے علاوہ مزید لاکھوں قسم کے جانور ہیں جن میں دیو پیکر جانوروں سے لیکر بمشکل نظر آنے والے جرثومے اور کیڑے مکوڑے تک شامل ہیں ۔ پھر زمین کے اس چوتھائی خشک حصے میں عظیم الشان پہاڑ بھی ہیں ۔ اور ناپیدا کنار صحرا بھی دشوار گزار جنگل بھی ہیں ۔ دلدلیں بھی ۔ اور ان صحراؤں پہاڑوں جنگلوں میں لاکھوں کروڑوں طرح کی مخلوق ہے ۔ انسان کی نوع بھی ان کروڑوں مخلوقات میں سے ایک ہے ۔ وہ نہ جسم اور قدوقامت میں سب سے بڑا ہے نہ مضبوطی میں سب سے بڑھکر ۔ نہ اسکے احساسات تمام جانوروں سے زیادہ تیز ہیں ۔ نہ اسکی عمر سب سے زیادہ ہوتی ھے ۔ نہ اسکی تعداد باقی جانوروں کی تعداد کا مقابلہ کر سکتی ہے ۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انسان زمین کی تمام دیگر مخلوقات سے اشرف ھے تو پھر ہم دوسرے مرحلے میں پہنچتے ہیں جہاں یہ طے کرنا رہ جاتا ہے کہ زمین کی کائنات میں کیا حیثیت ہے ۔

زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے ۔ زمین کے علاوہ اس نظام شمسی میں چاند زہرہ، مریخ، یورینس، مشتری، زحل، عطارد، پلوٹو اور نیپچون شامل ہیں ۔ ان میں سے کئی سیارے زمین سے کئی گنا بڑے ہیں ۔ یہ نظام شمسی گلیکسی یا کہکشاں کا ایک حقیر ترین حصّہ ہے ۔ کیوں کہ ہماری ہی کہکشاں میں ہمارے نظام شمسی جیسے کروڑوں نظام شمسی ہیں ۔ اور کائنات میں اربوں کہکشائیں ہیں ۔ پھر لطف یہ کہ ہماری کہکشاں میں جو کروڑوں نظام شمسی ہیں ان میں سے ہر ایک ہر لمحہ گردش میں ہونے کے باوجود کبھی

کسی دوسرے نظام شمسی سے نہیں ٹکرا سکتا ۔ کیونکہ کسی بھی دو نظام ہائے شمسی کا درمیانی فاصلہ اتنا ہے جیسے ایک سمندر میں دو جہاز ۔ اگر کائنات کے تمام سیاروں اور ستاروں کو شمار کرنا چاہیں تو ہم INFINITY کے علاوہ کسی اور لفظ کا سہارا نہیں لے سکتے کیونکہ اسکے معنی ہیں " انتہائی تعداد جو ممکن ہو سکتی ہے " ۔ ایک مثال سے اسے یوں سمجھایا جاسکتا ہے کہ دنیا کے تمام ساحلوں پر جتنے ریت کے ذرے ہیں اتنے ستارے اور سیارے کائنات میں موجود ہیں ۔ انسان ایک مٹھی ریت اٹھا کر اسکے ذرے گننے پر قادر نہیں ہے ۔ دنیا کے تمام ساحلوں پر موجود ریت کے تمام ذرے تعداد میں کتنے ہوں گے ۔ یہ سوچ کر ہی عقل انسانی کو پسینہ آجاتا ہے ۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اتنا معلوم ہونے کے باوجود آج بھی انسان وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ کائنات محدود ہے یا لامحدود ۔

کائنات کے پس منظر میں زمین کی حیثیت یہ ہے کہ جیسے دنیا کے تمام ساحلوں پر موجود ریت کے تمام ذروں میں سے ایک ذرہ ۔ پھر ہماری زمین پر لاکھوں کروڑوں مخلوقات موجود ہیں ۔ انسان ان میں سے ایک ہے ۔

اگر کائنات کی وسعت پر نظر کی جائے کائنات میں زمین کی حیثیت کا خیال کیا جائے اور پھر پلٹ کر اپنے اس دعوے کو دیکھا جائے کہ ہم یعنی انسان اس کائنات کا محور ہیں ۔ ہم سے اس وسیع کاشانے کی رونق ہے ۔ ہم اسکی زندگی ہیں ۔ تو ہمیں خود حجاب آجاتا ہے ۔

اس وسیع کائنات کے پس منظر میں تو زمین کی کوئی حیثیت نہیں انسان کی کیا حیثیت ہوگی ۔

انسان کا جسم کمزور ۔ علم محدود ۔ طاقت ناکافی ۔ عناصر فطرت اسکے خلاف نبرد آزما بیماریاں اسکے تعاقب میں حادثات اسکی تلاش میں موت سے وہ گھبرایا ہوا ۔

نہ ہتھ کی طرح مضبوط ۔ نہ ہاتھی کی طرح جسیم ۔ نہ شیر کی طرح طاقت ور ۔ نہ کچھوے کی طرح طول عمر اسے حاصل ۔ نہ آنکھیں ایسی روشن کہ رات کے اندھیرے میں دیکھ سکے ۔ نہ سماعت ایسی کہ میلوں دور کی آواز سن سکے جبکہ یہ صفتیں ان جانوروں میں موجود ہیں جنہیں وہ خود سے بہت ارزل سمجھتا ہے ۔

نہ اسکی عقل ایسی تیز کہ آنے والی کل کے حالات سے مطلع کر سکے ۔ نہ حواس اتنے فعال کہ حادثات سے محفوظ رکھ سکیں ۔ خود کو دنیا کا بے تاج بادشاہ جانتا ہے مگر اپنی سانس تک پر اختیار نہیں ۔ اپنے ذخیرہ علم پر ناز مگر نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم ۔ نہ یہ بتا سکتا ہے کہ دیوار کے پیچھے کیا ہورہا ہے ۔ نہ یہ جان سکتا ہے کہ اسکے اپنے چھوٹے سے جسم کے ننھے ننھے اعضا اپنے افعال صحیح طرح سے انجام دے رہے ہیں یا نہیں ۔ بغیر آلات کی مدد کے اپنے جسم کا درجہ حرارت اور اپنے خون کا دباؤ معلوم نہیں کر سکتا ۔ ہر ضرورت کیلئے دوسرں کا منت کش اور ہر کام کیلئے دوسروں پر انحصار کرنے کے لئے مجبور ۔

اس بے بضاعتی اور ناطاقتی پر دعوئ یہ کہ عناصر فطرت میرے غلام کائنات مجھ سے مسخر ۔ زندگی کلاں مرکز و محور ۔ انفس و آفاق کی دلکشی اور صحن عالم کی رونق میرے دم سے ۔ میں مخلوقات میں سب سے افضل ۔ میری طاقت دنیا میں سب سے فزوں تر ۔ واقعی انسان کتنا بھولا ہے ۔

اگر انسان حقائق سے نظریں نہ چرائے تو جانے کہ اسکی اصل ناپائیدار ۔ اسکی بنیاد کمزور ۔ اسکی صلاحیت محدود اور اسکی طاقتیں ناقابل اعتبار ہیں ۔ جب وہ کائنات کے پس منظر میں اتنا بے بضاعت اور حقیر ہے تو خالق کائنات کی شان اور جلالت کے سامنے کس قدر حقیر ہوگا ۔

جب تک انسان علم نہیں حاصل کرتا اسے خدا کی معرفت نہیں حاصل ہوتی

اور جب تک آدمی کو خدا کی معرفت حاصل ہو اسکی عبادت میں خلوص پیدا نہیں ہوتا۔ وہ جہنم سے ڈر کے عبادت کر سکتا ہے جنت کے لالچ میں عبادت کر سکتا ہے لیکن یہ منزل کہ خدا کی عبادت اس لئے کی جائے کہ وہ ہے ہی عبادت کے لائق یہ منزل یقین کی منزل ہے۔ اور معرفت کے زینے کو طے کئے بغیر آدمی اس منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔

اب آدمی کو یہ کون بتائے کہ خدا کیا ہے۔ کیسا ہے۔

خدا جسم و جسمانیت سے منزہ۔ نہ آدمی اسکو دیکھ کے پہچان سکتا ہے۔ نہ اپنے حواس سے جان سکتا ہے۔ نہ اس کے پاس آدمی خود جاسکتا ہے نہ اسے بلا سکتا ہے۔ نہ کہیں اس سے مل سکتا ہے۔ نہ کسی سے اسکا پتہ پوچھ سکتا ہے۔ حواس کو تو چھوڑیں۔ یہاں عقل و ادراک بھی معذور نظر آتے ہیں۔ کیونکہ خدا کا نہ تصور کیا جاسکتا ھے نہ قیاس۔ وہ وہم و گمان سے دور نہیں بالاتر ہے۔

اب انسان کی رہنمائی صحیفہ کاملہ کرتی ہے۔

وہ خوبصورت ترین الفاظ کو نازک ترین پیرائے میں استعمال کرتے ہوئے ازلی اور ابدی صداقت سے انسان کا تعارف کراتی ہے۔ اور وہ بھی اس سطح پر کہ عقل سرگرداں نہ رہ جائے۔ روح تشنہ نہ رہ جائے۔ معرفت ناکمل نہ رہ جائے۔ خدا نے انسان کو اس تیرہ خاکداں میں بھیجا تو اکیلا نہیں چھوڑا بے سہارا نہیں چھوڑا۔ حالات کی کروٹوں اور حادثات کی گردشوں میں اسکی گھبرائی ہوئی روح پریشان ذہن اور بے قرار دل کو بار بار یہ پیغام دیا کہ میں تیری ہر ضرورت کا کفیل ہوں۔ جو حاجت ہو مجھ سے کہہ۔ میرے دربار میں عرض کر۔ کبھی کہا ادعونی استجب لکم تم پکارو میں تمھاری دعا قبول کروں گا۔ کبھی سمجھایا اجیب دعوۃ الداع اذا دعان۔ میں تمھاری پکار سنتا ہوں۔ کبھی بتایا فاذکرونی اذکرکم۔ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ رسولؐ نے

دعا کو عبادت کے مغز کا درجہ دیا۔ اور یہ بھی بتایا کہ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ تم کسی چیز سے بھاگتے ہو اور وہ تمہارے لئے مفید ہوتی ہے۔ اور کسی چیز کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہو اور وہ تمہارے لئے مضر ہوتی ہے۔ تو خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ پس خدا پر بھروسہ کرو۔ اپنی دعا کے قبول نہ ہونے سے بدگمان مت ہو کہ خدا نے تمہاری سنی نہیں یا تمہاری مدد نہیں کی۔ وہ تمہارے لئے جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔

لیل ونہار کی گردشیں، زمانے کے حادثات، ہر قسم کی بیماریاں، ہر طرح کی پریشانیاں، کبھی یہ فکر دامنگیر کہ جو کچھ حاصل ہے اس میں کمی نہ آجائے کبھی یہ تمنا دل پر قابض کہ جو چیزیں حاصل نہیں ہیں وہ بھی مل جائیں۔ دنیا میں کون ہے جو ان زنجیروں سے آزاد ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ فتوحات کسی بھی حد تک پہنچ جائیں۔ آدمی پوری زمین کا سینہ روند دے۔ دنیا کے نقشے پر موجود تمام ممالک کو زیرنگیں کرلے لیکن کہیں بھی انسان پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ دولت کی کوئی مقدار۔ مناصب کا کوئی معیار۔ اختیارات کی کوئی حد۔ طاقت کی کوئی انتہا۔ کوئی چیز انسان کو مکمل طور پر مطمئن نہیں کرتی۔ کیونکہ خواہش کی تمنا کی شوق کی کوئی آخری حدود نہیں ہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب

ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

اسی لئے انسان کسی بھی رتبے کو پہنچ جائے محتاج رہتا ہے۔ کیونکہ ہر پہلو کی آسودگی انسان کو نہیں مل سکتی۔ آدمی سیاست کے اوج پر پہنچکر بھی اور بادشاہ ہوکر بھی اپنی بیماریوں کے سبب پریشان ہوسکتا ہے۔ صحت مند آدمی کی مالی حالت خستہ ہوسکتی ہے۔ مالدار کی حسرت کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ اسکی اولاد ہی نہیں ہے۔ صاحب اولاد کو یہ مسئلہ ہوسکتا ہے کہ اسکی کی اولاد نیک اور سعادت مند نہیں ہے۔

نیک اولاد والوں کو یہ مسئلہ ہو سکتا ہے کہ اسکا بیٹا بے روزگار ہے۔ برسرروزگار کا درد سر ہو سکتا ہے کہ وہ کام اسے پسند نہیں ہے۔ جسے پسند کا کام مل جائے اسکی پریشانی کہ ہو سکتی ہے۔ کہ نوکری گھر سے دور ہے۔ آدمی کی زندگی ایک بہت بڑا دائرہ ہے۔ اس میں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے خانے ہیں۔ اور ہر خانے میں سینکڑوں مسئلوں پریشانیوں فکروں اور غموں کے امکانات ہیں۔ لہٰذا پوری دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہو سکتا جو ایک لمحے کے لئے بھی احتیاج سے آزاد ہو۔

جب انسان کی پوری زندگی میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آتا کہ اسے کسی قسم کا بھی مسئلہ درپیش نہ ہو۔ کسی قسم کی بھی مدد کی ضرورت نہ ہو۔ تو دعا کی ضرورت مسلّم۔ کیونکہ آدمی اپنا دکھ درد کسی سے کہے تو ممکن ہے کہ دوسرا نہ سنے۔ سنے تو مدد کی کوشش نہ کرے۔ اور کوشش کرے تو کامیاب نہ ہوسکے۔ اسلئے کیا یہ سب سے بہتر نہیں ہے کہ آدمی اسے سنائے جو سمیع بھی ہے بصیر بھی۔ ہر چیز کا علم بھی رکھتا ہے۔ اسے اجالے میں پکارو یا اندھیرے میں آواز دو۔ مجمع عام میں اسے یاد کرو یا تنہائی میں۔ روز و شب کا کوئی لمحہ نہیں جب وہ اپنے بندوں کی طرف سے غافل ہو یا دیکھ نہ رہا ہو کہ بندہ کس مصیبت میں گرفتار ہے۔ پھر اسکا وعدہ بھی ہو کہ تم پکارو تو سہی۔ میں تمھاری پکار سنوں گا۔ تم مجھ پر بھروسہ کر کے تو دیکھو میں تمھاری ہر مشکل حل کروں گا۔ اور وہ قادر مطلق ہے۔ جو چاہے کرتا ہے۔ کائنات کا بلا شریک غیرے مالک ہے حکمران ہے۔ کائنات میں کوئی اسکے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔

پھر آدمی ہر کرب میں ہر مصیبت میں ہر بلا میں پریشانی میں ہر رنج میں ہر دکھ میں ہر غم میں اسی کو کیوں نہ پکارے۔ جو ہر مصیبت کو دور کرتا ہے۔ ہر بلا کو روک سکتا ہے۔ ہر پریشانی کو ختم کر سکتا ہے ہر رنج کو خوشی سے ہر دکھ کو فرحت سے اور ہر غم کو مسرت سے بدل سکتا ہے۔

لیکن کہاں خالق سماوات اور مالک کائنات کا دربار جلیل اور کہاں فانی انسان ۔ ہر دربار کے کچھ آداب ہوتے ہیں ۔ درخواست پیش کرنے اور عرض گزارنے کے سلیقے ہوتے ہیں ۔ مالک الملک کا دربار عالی جس میں عزتیں بانٹی جاتی ہیں، قسمتیں بدلی جاتی ہیں ۔ زندگیاں عطا کی جاتی ہیں ۔ اس دربار کے لائق آدمی اپنے کو بنائے کیسے ۔ اور اپنی آرزوئیں انفس و آفاق کے حکمران کے حضور کن الفاظ میں پیش کرے ۔

صحیفہ کاملہ وہ کتاب ہے جو انسان کو اللہ کے دربار میں اپنی گزارشات پیش کرنے کا طریقہ بتاتی ہے ۔ اور انسان کی روح کو عبودیت کے اعلیٰ مفاہیم سکھاتی ہے ۔ بنیادی طور پر یہ دعائیں ہیں۔ ایک بندے کی عرض داشت اللہ جل جلالہ کے عظیم دربار میں۔ لیکن ان دعاؤں کی بہت سی جہتیں ہیں ۔ ایک پہلو یہ ہے کہ فصاحت کے اعتبار سے یہ دعائیں عربی ادب کے معجزات میں شمار ہوتی ہیں ۔ ایک پہلو یہ ہے کہ یہ انتہائی سریع التاثیر ہیں ۔ ایک پہلو یہ ہے کہ ان دعاؤں میں معانی کی دنیائیں آباد ہیں۔ معرفت کے آبشار گر رہے ہیں ۔ محبت خداوندی کے پھول کھل رہے ہیں ۔ انکی ایک تہہ فلسفیانہ بھی ہے ۔ اسلئے کہ فلسفہ حقیقت ازلی کو تلاش کرنے کی ایک کوشش ہی تو ہے۔ لیکن سب سے بڑی خصوصیت ان دعاؤں کی یہ ہے کہ ان میں ایک ایسے انسان کے نازک احساسات شامل ہیں جسکی پوری زندگی لفظ عبادت کی تشریح و تفسیر تھی ۔ الفاظ کی نرمی لہجے کی عاجزی دلوں میں رقت پیدا کرتی ہے ۔ یہ دعائیں الہام کا مرتبہ رکھتی ہیں ۔ ہر دل جو خدا کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتا ہے وہ دعا کرتا ہے ۔ لیکن کیا ذات احدیت کا یہ عرفان کسی اور کے ہاں مل سکتا ہے ۔ اور ادبیت کی یہ شان کسی اور کے ہاں پائی جاسکتی ہے ۔

ان دعاؤں میں کہیں بھی یہ انداز نہیں ہے کہ یہ میری خواہشیں ہیں۔ اے خدا تو انہیں پورا کر دے ۔ ان میں سے کسی دعا کا دنیاوی عیش و آرام سے تعلق نہیں

یہاں تو یہ انداز ہے کہ دل بھی جھک جاتا ہے ہر سجدے میں پیشانی کے ساتھ ۔ اس معرفت ای کے ساتھ جو ایک امام کو حاصل ہوتی ہے دعا کا انداز یہی ہونا چاہیے کہ اے پروردگار ۔ تو ہر بات سے واقف ہے ۔ مجھے اپنی حاجتوں کے لئے اظہار کی کیا ضرورت۔ میں اپنی ذات کی نفی کرتا ہوں ۔ اور مکمل سپردگی کے ساتھ خود کو تیرے سامنے زمین عجز پر سجدہ ریز کرتا ہوں ۔ رضاً بقضائیہ و تسلیماً لامرہ ۔ میں ہر اس بات پر راضی ہوں جو تونے میرے لئے مقدر کردی ہے ۔ اور ہر اس بات کو تسلیم کرتا ہوں جسکا تو نے میرے سلسلے میں حکم دیا ہے ۔ میرے تمام مسائل تیرے سامنے ہیں تیری ہی مرضی سب سے بہتر ہے اور تیرا ہی فیصلہ سب سے برتر ہے ۔ تو کائنات کا خالق اور مالک ہے ۔ ہر چیز تیری ہے ۔ تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اب یہ تیری مرضی کہ تو میرے معاملات میں کیا چیز منظور کرتا ہے ۔ میرے گناہ بہت سہی لیکن تیری چادر رحمت سے تو کوئی چیز وسیع تر نہیں ہو سکتی ۔ تو جہنم میں ڈالے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں اور تو جنت میں بھیج دے تو یہ تیرا فضل ہے ۔ اور احسان ہے ۔

کسی بھی انسان کی دعا اسکی سوچ کا آئینہ ہوتی ہے آدمی وہی مانگتا ہے جو بہت ضروری سمجھتا ہے ۔ جسکی سب سے زیادہ قدر کرتا ہے۔ جسے باقی تمام چیزوں پر ترجیح دیتا ہے اور آدمی کی ترجیحات ہی اسکا فکری و ذہنی معیار مقرر کرتی ہیں ۔

صحیفہ کاملہ اٹھائیے ۔ اس مقدس کتاب کو کہیں سے بھی پڑھنا شروع کیجیے ۔ عجیب جادوانہ کیف ہے ۔ تھوڑی دیر کے لئے روح ایک نئی فضا میں سانس لینا شروع کردیتی ہے۔ معرفت کی فضا میں جہاں عبدیت ہی زندگی کا مقصد بھی ہے اور حاصل بھی ۔ جب ذہن اس فضا میں کھو جاتا ہے تو دنیا، اسکی آسائشیں، اسکی دلفریبیاں سب اپنی قدر کھو بیٹھتی ہیں ۔ آدمی کی نظروں میں دنیا ہیچ ہوجاتی ہے ۔ آدمی محسوس کرتا ہے کہ میں اس سے مانگ رہا ہوں جس کے ہاں شاہ وگدا کی تفریق نہیں۔ سبھی اسکے در

دولت کے محتاج ہیں ۔ پھر روح مناجات میں سرشاری محسوس کرتی ہے ۔ بندے کو اچانک محسوس ہوتا ہے کہ کائنات کی اعلیٰ ترین ہستی سے اسکا رابطہ قائم ہوگیا ہے ۔ اور اس سے اہم لمحہ فانی انسان کی زندگی میں کوئی اور نہیں آتا ۔

صحیفہ کاملہ میں انچتر (۵۴) دعائیں ہیں ان کے علاوہ پندرہ (۱۵) مناجاتیں ہیں ۔ ان دعاؤں میں جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں ۔

خدائے بزرگ و برتر کی حمد کے طور پر دعا، رسول اکرمؐ کی نعت کے طور پر دعا، ذکر آل محمدؐ کے طور پر دعا، خدا کی پناہ مانگنے کے سلسلے میں دعا، ظالموں سے برات کے سلسلے میں دعا، شیطان کے حامیوں سے پناہ کے سلسلے میں دعا، ماں باپ کے لئے دعا، فرزندوں کے لئے دعا، پڑوسیوں اور دوستوں کے لئے دعا، سرحد والوں کے لئے دعا ہر صبح کی دعا، ہر شام کی دعا، ہفتے کے سات دنوں کے لئے الگ الگ دعا، نماز عیدین کے بعد کی دعا، نماز جمعہ کے بعد کی دعا، طلب مغفرت کے لئے دعا، ادائیگی قرض کے لئے دعا، قضائے الٰہی پر راضی رہنے کے سلسلے میں دعا، خوف خدا کے سلسلے میں دعا طلب توبہ کے سلسلے میں دعا، بندوں کی ذمہ داریوں کی معذرت کے سلسلے میں دعا، کسی کو گناہ کی رسوائی میں دیکھ کر دعا، کسی کو ظلم میں دیکھ کر دعا، بادل کی گرج اور بجلی کی چمک دیکھ کر دعا، نیا چاند دیکھ کر دعا، آغاز رمضان پر دعا، اختتام رمضان پر دعا، ختم قرآن پر دعا، حصول مکارم اخلاق کے سلسلے میں دعا، ادائے شکر میں کمی کے اعتراف کے سلسلے میں دعا، کسی مصیبت کے نازل ہونے پر دعا، کسی حاجت کے پورے ہونے پر دعا، رزق کی تنگی پر دعا، موت کے ذکر پر دعا، غم و اندوہ کا ہجوم ہونے پر دعا، گناہوں کی پردہ پوشی کے لئے دعا، دشمنوں کے مکر سے بچنے کیلئے دعا، اعتراف گناہ کے طور پر دعا، اور بارگاہ احدیت میں عاجزی کے اظہار کے طور پر دعا۔

ان دعاؤں کے علاوہ صحیفہ کاملہ میں مناجاتیں بھی ہیں۔ یہ مناجاتیں بھی دعائیں ہی ہیں ان کے عنوانات کچھ ایسے ہیں جیسے زاہدوں کی دعا، ذکر کرنے والوں کی دعا، اطاعت کرنے والوں کی دعا، خوف خدا رکھنے والوں کی دعا اور توبہ کرنے والوں کی دعا۔

دعاؤں کے حوالے سے ایسی جامعیت شاید دنیا کی کسی اور کتاب میں نہیں ملے گی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوسکتا جس میں انسان کو دعا کی ضرورت ہو اور اس سلسلے میں صحیفہ کاملہ میں موقع کی مناسبت سے دعا موجود نہ ہو۔ ہر ایک کیلئے دعا، ہر موقع کی دعا، ہر کیفیت فکر کے لئے دعا، بیمار ہو جائے تو دعا، صحت پا جائے تو دعا، قرض میں گھر جائے تو دعا، مصیبت سے چھٹکارہ مل جائے تو دعا، نعمت ملے تو شکر کے طور پر دعا، آفت پڑے تو دل کو سہارا دینے کے لئے صبر کے طور پر دعا، رنج و آلام ہو تو دعا، راحت و آرام ہو تو دعا، صبح دعا، شام دعا، آخرت کا خیال آجائے تو دعا، دنیا کی فکر ستائے تو دعا، نزول رحمت کی دعا، حصول مغفرت کی دعا، گناہوں کو مٹانے کی دعا، نعمتوں کو بڑھانے کی دعا، دوستوں کے لئے دعا، رشتے داروں کے لئے دعا، اپنے قصوروں کے اعتراف کے طور پر دعا، اپنی عاجزی کے اظہار پر دعا، ہر حاجت میں دعا، ہر حالت میں دعا، ہر آن ہر پل ہر ساعت میں دعا۔ اور ان دعاؤں میں جو سپردگی ہے، جو اپنی ذات کی نفی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دعائیں نہیں ہیں سجدوں کا ایک تسلسل ہے اور ان سجدوں میں حسین ابن علیؑ کا وہ سجدہ بھی شامل ہے جس کا دامن دامن قیامت سے بندھا ہوا ہے۔

جیسے ذوالجلال و الاکرام کے دربار میں انسان حاضر ہوتا ہے۔ جیسے قادر مطلق اور پوری کائنات کے مالک و مختار کے سامنے آدمی جا کے کھڑا ہوتا ہے۔ اس عظیم ترین بارگاہ میں میں حاضر ہونے کے لئے جو ادب ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ جو دل کی صفائی

وہاں کیلئے لازمی ہے۔ جو روح کی پاکیزگی وہاں کیلئے ضروری ہے۔ اسکی کبریائی اور عظمت کا احساس جس طرح دل میں جاگزیں ہونا چاہیئے۔ اپنی عاجزی کا تصور جس طرح مکمل ہونا چاہیئے۔ جس طرح اسکے خیال کے بعد دنیا کی کسی بھی طاقت اور کسی بھی شخصیت کی مدد ہیچ، بیکار اور فضول لگنی چاہیئے۔ جس طرح اس کے دربار میں سر جھکا کر اور اسکے بھروسے پر دنیا کو دھتکار کر انسان کی روح کو بالیدہ، دل کو مطمئن، جان کو آسودہ اور ذہن کو بے فکر ہو جانا چاہیئے۔ ان تمام باتوں کا سامان صحیفہ کاملہ کی دعاؤں میں ہے اور بدرجہ اتم ہے۔ اور آدمی بے اختیار اس کے حضور میں سجدہ ریز ہوجاتا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ دل بھی جھک جاتا ہے ہر سجدے میں پیشانی کے ساتھ۔ اور دل کو جب اسکی جبروت کا احساس ہو جاتا ہے تو اپنی عبادت کی کمی اور بھی شدید لگتی ہے۔ یہ احساس ندامت آنکھوں سے چھلکتے ہوئے آنسوؤں میں ڈھل جاتا ہے۔ اور ان قطروں کو پروردگار کی شان کریمی موتی سمجھ کے چن لیتی ہے۔

ان دعاؤں میں احساس کی نزاکت بھی بے مثال ہے۔ خیالات کی رفعت بھی لازوال ہے۔ خلوص کی بے مثال گرمی بھی ہے۔ لہجے کی شاعرانہ نرمی بھی ہے۔ الفاظ کی بندش سے گمان ہوتا ہے کہ کوئی مرصع ساز نگ جڑتا ہوا چلا گیا ہے۔ اور خیالات کی روانی سے یوں لگتا ہے جیسے ایک دریا ہے جو امنڈتا ہوا، بڑھتا ہوا چلا آرہا ہے۔

صحیفہ کاملہ کی دو دعاؤں، دعائے مکارم اخلاق اور دعائے توبہ سے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ پہلے دعائے مکارم اخلاق کے کچھ حصے۔

"میرے ایمان کو درجہ کمال تک پہنچا دے۔ میرے یقین کو افضل الیقین بنادے۔ میری نیت کو بہترین نیت کی انتہا بنا۔ میرے عمل کو حسن عمل کی حدتک لے جا۔ میں نے جو سوچا ہے۔ اسے اپنے کرم سے پورا کر۔ میرے یقین کو استوار کر۔

اپنی قدرت سے میرے حالات کی اصلاح کر ۔ میں جن چیزوں میں مصروف ہوں ان سے بے نیاز کر دے ۔ مجھے اس کام میں لگادے جسکے بارے میں کل سوال کیا جائیگا ۔ مجھے فرصت دے ان کاموں کو کرنے کی جن کیلئے مجھے پیدا کیا تھا ۔ اپنا رزق مجھ پر وسیع کر ۔ مہلت دے کر میری آزمائش نہ کر ۔ مجھے عزت دے مگر تکبر سے دور رکھ ۔ مجھ سے اپنی عبادت کرا ۔ اور مجھے اپنی عبادت پر غرور نہ ہونے دے ۔ میرے ہاتھوں سے لوگوں کو بھلائی پہنچانا جاری رکھ ۔ اوراحسان جتا کے اس بھلائی کو مٹانے سے مجھے باز رکھ ۔ مجھے اخلاق کی بلندیاں عطا فرما ۔ اور فخر سے مجھے بچائے رکھ ۔

جب تک میری زندگی تیری طاعت میں صرف ہو مجھے زندہ رکھ ۔ لیکن جب میری زندگی شیطان کی چراگاہ بننے لگے تو میری روح قبض کرلے ۔

مجھے توفیق دے کہ جو کوئی مجھ سے قریب ہو میں اسکی خیر خواہی کروں ۔ اور جو مجھے چھوڑ جائے اسکا بدلہ حسن سلوک سے دوں ۔ جو مجھے محروم رکھے اسے عطاکروں۔ اور قطع رحمی کرنے والے کے ساتھ صلہ رحمی کروں ۔ اور جس نے میری غیبت کی اسکا بھی اچھائی کے ساتھ ذکر کروں ۔ نیکی کا شکریہ ادا کروں ۔ اور بدی کو نظرانداز کروں ۔

اور مجھ پر ظلم نہ ہو جبکہ تو اس ظلم کو مجھ سے دور کرنے کی طاقت رکھتا ہے ۔ اور نہ میں کسی پر ظلم کروں جبکہ تو مجھے ظلم سے روک دینے پر قادر ہے ۔ اور میں بھٹکنے نہ پاؤں جبکہ مجھے منزل پر پہنچانا تیرے بس میں ہے ۔ اور میں محتاج نہ ہوجاؤں جبکہ میری فارغ البالی تیری بارگاہ سے ہے۔ اور میں سرکشی نہ کر بیٹھوں جبکہ میری تاب و تواں تیری جانب سے ہے۔ اے اللہ میں تیری مغفرت کی پناہ لینے آیا ہوں اور تیرے عفو کا قصد کیا ہے ۔ اور تیرے درگزر کا مشتاق ہوں اور تیرے فضل پر بھروسہ کیا ہے ۔ حالانکہ میرے پاس کچھ نہیں جو تیرے فضل کو مجھ پر واجب کرے ۔

اور نہ میرے عمل میں کوئی ایسی بات ہے کہ میں تیری معافی کا مستحق ہوجاؤں ۔ تو اب جبکہ میں نے اپنے ہی خلاف فیصلہ دیدیا ہے میرے پاس تیرے فضل کے سوا کیا دھرا ہے ۔ پس اے اللہ، محمدؐ اور ان کی آلؑ پر صلواۃ بھیج ۔ اور مجھ پر اپنا فضل کر اے اللہ میری زبان کو ہدایت سے گویا کر اور میرے دل میں تقویٰ ڈال دے اور مجھے اس بات کی توفیق دے جو سب سے زیادہ پاکیزہ ہے ۔ اور وہ کام مجھ سے لے جو پسندیدہ ترین ہے ۔

اے اللہ مجھے بہترین راستے پر چلا ۔ اور اپنے دین پر مجھے موت دے ۔ اور اپنے ہی دین پر مجھے زندہ اٹھا ۔ اے اللہ اگر میں غمگین ہوجاؤں تو میرا مال متاع تو ہی ہے ۔ اگر مجھے محروم کر دیا جائے تو میری امیدگاہ تو ہی ہے ۔ اگر ہجوم غم نے مجھے دبا رکھا ہو تو فریاد تجھی سے ہے ۔ اور تیرے ہی دست قدرت میں ہے ہاتھ سے گئی ہوئی چیز کا عوض دینا ۔ بگڑی ہوی بات کا سدھارنا اور جو چیز تجھے ناپسند ہو اسکو تبدیل کر دینا ۔ پس نزول بلا سے پہلے، عافیت مانگنے سے پہلے، توانگری اور بھٹکنے سے پہلے راست روی دے کر مجھ پر احسان فرما ۔ مجھ کو برائیوں سے دور رکھ اپنے لطف سے ۔ میری پرورش کر اپنی نعمت سے، میری اصلاح کر اپنے کرم سے، میرا علاج کر اپنے احسان سے ۔ مجھے سایہ دے اپنے صحن میں ۔ مجھے چادر اڑھا اپنی رضا کی ۔

مجھے فضول خرچی سے باز رکھ ۔ میری روزی کو رائگاں جانے سے بچا ۔ میرے مال میں برکت دے کر اسے زیادہ کر اور جو کچھ میں اس میں سے خرچ کروں ۔ اسکی بدولت مجھے نیکی کی راہ ہدایت تک پہنچا دے ۔

اے اللہ مجھے صحت دے عبادت کے لئے اور فراغت دے زہد کے لئے، علم دے عمل کرنے کے لئے اور پرہیزگاری دے بقدر اعتدال ۔

اے اللہ صلواہ بھیج محمدؐ و آل محمدؐ پر ۔ اور بدل دے میرے دشمنوں کی

دشمنی کو دوستی سے اور سرکشوں کے حسد کو محبت سے۔ راست بازوں کی بے اعتمادی کو اعتماد سے اور قریبوں کی عداوت کو مودّت سے، رشتے داروں کی قطع تعلق کو صلہ رحمی سے اور لوگوں کے ترک نصرت کو نصرت سے۔ خوشامدیوں کی خوشامد کو خلوص سے۔ ظاہر داروں کے برتاؤ کو حسن معاشرت سے اور ظالموں کے خوف کی تلخی کو ان کی شیرینی سے"۔

اب دعائے توبہ کے کچھ حصے۔

"میرے معبود میں یہاں تیرے باب عزت پر کھڑا ہوں۔ جیسے کوئی بے بس ہتھیار ڈال کر کھڑا ہوتا ہے۔ اور شرمسار ہوکر تجھ سے یوں سوال کر رہا ہوں جیسے فقیر محتاج سوال کرتا ہے۔

اے معبود کیا تیرے حضور اپنی کمائی کی برائی کا اقرار مجھے نفع دے سکتا ہے۔ اور کیا اپنے کئے کی برائی کا اعتراف عذاب سے نجات دے سکتا ہے۔ یا کیا تو نے میرے یہاں کھڑے کھڑے میرے لئے اپنا غضب واجب کر لیا ہے۔ یا میری دعا کے وقت تو نے اپنی ناراضگی کو میرے لئے لازم کر لیا ہے۔ سبحان اللہ میں تیری رحمت سے مایوس نہیں ہوں جبکہ تو نے توبہ کا دروازہ میرے لئے کھول رکھا ہے۔ بلکہ میں تو اس بندہ بیچارہ کی سی بات کرتا ہوں جس نے آپ ہی اپنا بگاڑ کیا۔ اور اپنے رب کی حرمت کو خفیف سمجھا۔ جس کے گناہ بڑھتے ہوئے نمایاں ہوگئے۔ اور جسکے دن پھرتے پھرتے پیچھے مڑگئے۔ حتیٰ کہ جب اس نے دیکھا کہ عمل کی مدت بیت چکی ہے اور عمر انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ اور اسے یقین ہوگیا کہ اب اسکے لئے تجھ سے بھاگنے کی راہ نہیں اور تجھ سے گریز کا کوئی راستہ نہیں رہا تو تیری طرف رجوع کرلیا اور صدق نیت سے تیرے حضور توبہ کرلی۔ اور تیرے سامنے پاک و پاکیزہ دل کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ پھر لرزتی ہوئی دلی آواز سے تجھے پکارا۔ تیرے سامنے ایسا جھکا کہ خمیدہ ہوگیا اور سر جھکاکر دُھرا

ہوگیا۔ خوف سے اسکے پاؤں کانپنے لگے اور آنسوؤں نے اسکے رخساروں کو تر کردیا۔

اے وہ جس نے اپنے بندوں کو قبول توبہ کا عادی بنادیا ہے۔ اور توبہ کے ذریعے ان کی بگڑی کو بنانا چاہا ہے۔ اے وہ جو بندوں کے ذرا سے عمل سے خوش ہوجاتا ہے۔ اور قلیل عمل کا کثیر بدلہ دیتا ہے۔ اے وہ جس نے دعا قبول ہونے کی ضمانت دی ہے۔ اے وہ جس نے اپنی مہربانی سے بندوں سے بہترین جزا کا وعدہ کیا ہے۔

بڑے بڑے گناہوں کو معاف کردینا تیرے لئے کوئی بڑی بات نہیں اور بڑے سے بڑے قصور سے درگزر کرنا تیرے لئے کوئی مشکل بات نہیں۔ کھلی ہوئی برائیوں سے چشم پوشی کرنا تجھ پر گراں نہیں۔ تو اس بندے کو پسند کرتا ہے جو تکبّر چھوڑ کر تیری طرف مائل ہوجائے۔ اصرار ترک کردے اور استغفار کا پابند ہو جائے۔

میں تیری بارگاہ میں تکبّر سے دست بردار ہوتا ہوں۔ گناہوں پر اصرار سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اپنی کوتاہیوں پر استغفار کرتا ہوں اور جو کام میرے بس سے باہر ہے اس کی بجا آوری کے لئے تجھ سے مدد سے طلب کرتا ہوں۔ اے اللہ محمدؐ اور آل محمدؐ پر صلواۃ بھیج۔ اور تیرے جو حقوق مجھ پر واجب ہیں بخش دے۔ اور تیری طرف سے جس سزا کا میں مستوجب ہوں اس سے محفوظ رکھ۔ اور جس انجام کا خطاکاروں کو خوف ہے اس سے بچالے۔ کیونکہ تو معاف کرنے پر قادر ہے۔ اور مغفرت کی امید تجھی سے کی جاتی ہے"۔

دعائیں (اقتباسات)

الٰہی! ستارے آسمانوں میں ڈوب گئے۔ تیرے بندوں کی آنکھوں میں نیند آگئی۔ لیکن تیرے دروازے سائلوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ میں بھی تیری سرکار میں

آیا ہوا ہوں۔ تاکہ تو مجھے بخش دے۔ مجھ پر رحم کرے۔ اور روز قیامت مجھے میرے جد حضرت رسول خدا کا چہرہ دکھا دے۔

تیرے عزت و جلال کی قسم! اگر میں نے کوئی معصیت کی ہے تو اسلئے نہیں کہ تیری مخالفت کا خیال میرے دل میں ہو۔ یا تیرے عذاب سے بے خبر ہوں۔ بلکہ اس لئے کہ میرا نفس مجھ پر غالب آگیا ہے۔

خداوندا! اس رات میں مدد کر اور میرے گناہوں کو اپنی رحمت کے پردے میں چھپالے۔ خداوندا تیرے عذاب سے کون چھڑانے والا ہے۔ اگر میں تیری رسی کو چھوڑدوں تو پھر کس کی رسی کو پکڑ کر نجات حاصل کروں۔

آہ! کل جب تیرا سامنا ہوگا تو میرا کیا حال ہوگا۔ جب تو متقیوں سے کہے گا کہ گزر جاؤ اور گنہگاروں سے کہے گا کہ گر جاؤ۔ تو مجھے بتا کہ میں متقیوں کے ساتھ گزر جانے والوں میں سے ہوں یا گنہگاروں کے ساتھ نیچے گرنے والوں میں۔

افسوس! طول عمر نے میری خطائیں بڑھادیں۔ اور میں نے توبہ نہ کی۔ کیا یہ وقت نہیں کہ میں اپنے رب سے حیا کروں۔

اے میری آرزوؤں کے مرکز! اگر تو مجھے آگ میں جلائیگا تو پھر مجھے نجات کی کس سے امید ہو سکتی ہے۔ اور میری محبت کس کام آئیگی۔ میں اپنے روزی اعمال لیکر تیری سرکار میں آیا ہوں۔ دنیا میں کسی نے میری طرح گناہ نہ کئے ہوں گے۔

اے نفس! زندگانی دنیا کے اوپر کب تک تجھے سکون و اطمنان رہے گا۔ اور کب تک دنیا اور اسکی آبادی پر تجھے بھروسہ رہے گا۔ کیا تو اسلاف کی موت سے عبرت نہیں حاصل کرتا۔ کیا تجھے اس سے عبرت نہیں حاصل ہوتی کہ دنیا نے تیرے بھائیوں کو کس طرح تجھ سے جدا کر کے خاک میں ملا دیا ہے۔ دنیا والو! ذرا سوچو تو۔

تمہارے اسلاف کہاں چلے گئے۔ تمہارے اہل و عیال اور تمہارے اقارب کیا ہوئے۔ انبیا و مرسلین کہاں چھپ گئے۔ واللہ موت نے ان سب کو چھین دیا۔ زمانے نے ان کو مٹادیا اور ہم بھی انہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ بیشک ہم خدا کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف جانے والے ہیں۔

ستائش اللہ تعالیٰ کے لئے جو دلوں پر اپنی عظمت کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔ اور آنکھوں سے اپنی عزت کے ساتھ پنہاں ہے۔ نہ آنکھیں اسکے دیدار کی تاب رکھتی ہیں نہ انسانی عقلیں اسکی عظمت کی حد تک پہنچ سکتی ہیں۔ وہ عظمت و کبریائی کے ساتھ شان و جبروت کا مالک اور عزت واحسان و بزرگی کے ساتھ خلق پر مہربان اور حسن و جمال کے ساتھ نقائص سے منزہ ومبرا اور فخر و کمال کے ساتھ شرف اور بزرگی کا سرمایہ دار اور بخشش و نعمت کے ساتھ تمام خلق کی امیدگاہ ہے۔

وہ خالق جسکا کوئی نظیر نہیں۔ وہ یکتا جسکا کوئی مثل نہیں۔ وہ بزرگی کا مالک جسکا کوئی مد مقابل نہیں۔ وہ سردار و حاکم جسکا کوئی ہمسر نہیں۔ وہ خدا جسکا کوئی دوسرا نہیں۔ وہ پیدا کرنے والا جسکا کوئی شریک نہیں۔ وہ رزق عطا کرنے والا جسکا کوئی مددگار نہیں۔ وہ سب سے پہلے اور لازوال ہے۔ وہ ہمیشہ رہنے والا غیر فانی ہے۔ وہ قائم و دائم ہے۔ بغیر کسی زحمت کے وہ باقی ہے۔ بغیر کسی آخری حد کے وہ صفت آفریں ہے۔ بغیر کسی پشت پناہ کے۔ وہ پروردگار ہے۔ بغیر کسی شریک کے وہ خلق کرنے والا ہے بغیر کسی تکلیف کے۔ وہ کام کرنے والا ہے بغیر عاجزی کے۔ اسکی کوئی حد نہیں مکان میں۔ اور نہ انتہا ہے زمانے میں۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یونہی ہمیشہ ہمیشہ خدا ہے۔ زندہ، قائم قدیم، قادر، علم و حکمت کا مالک۔ زبردست اور حلیم۔ جس چیز کو چاہے روکنے والا اور جس کام کو چاہے کرنے والا۔ اسکے لئے ہی خلق ہے اور اس کیلئے ہے حکم۔ تمام زمین اسکے قبضہ قدرت میں ہے۔ اور آسمان بھی اسکے

دست تصرف میں لپٹے ہوئے ہیں ۔ پاک ہے وہ خدا اور بلند ہے ان خیالات سے جو مشرکین نے قائم کئے ہوئے ہیں ۔

خدایا! ہمارے دلوں کی سلامتی اپنی عظمت کی یاد میں قرار دے ۔ اور ہمارے جسم کی بیکاری کے موقعہ کو بھی اپنی نعمتوں کے شکریے میں صرف کر دے ۔ اور ہماری زبانوں کی گویائی کو اپنے احسان کی توصیف سے مخصوص کر دے ۔

تمام کائنات اس بات کی معترف ہے کہ تو جس کو سزا دے اس پر ظلم نہیں کرتا ۔ اور گواہ ہے اس بات کی کہ تو جس کو معاف کر دے تیرا احسان ہے اور ہر شخص اقرار کرے گا اپنے نفس کی کوتاہی کا ان فرائض کے ادا کرنے میں جو تو نے عاید کئے ہیں ۔ اگر شیطان انہیں فریب نہ دیتا تیری اطاعت سے تو کوئی تیری نافرمانی نہ کرتا ۔ اور اگر باطل کو انکے سامنے حق کے لباس میں پیش نہ کرتا تو تیرے راستے سے کوئی گمراہ نہ ہوتا ۔ تو مبارک ہے اس بات میں کہ تیری توصیف احسان کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے ۔ اور بزرگ ہے تو اس امر سے کہ تجھ سے اندیشہ ہو عدالت کے خلاف طریقے کا ۔ تجھ سے ظلم و جور کا اندیشہ نہیں ہو سکتا اس شخص پر جو تیری نافرمانی کرے اور تجھ سے حق تلفی کا خوف نہیں ہو سکتا اس شخص کے بارے میں جو تیری اطاعت کرے ۔

تو بڑا احسان کرنے والا صاحب کرم ہے ۔ اے وہ جسکی عظمت کے عجائبات ختم ہونے والے نہیں ، ہم کو ملحدانہ خیالات سے اپنی عظمت کے پردوں میں چھپاکر بچالے ۔ اے وہ کہ جسکی سلطنت کی مدت کم ہونے والی نہیں اپنے غضب اور ناراضگی سے ہمیں آزاد رکھ ۔ اے وہ جسکی رحمت کے خزانے ختم ہونے والے نہیں ۔ اپنی رحمت میں ہمارا حصہ بھی قرار دے ۔ اے وہ جسکے نظارے کی تاب ہماری آنکھوں کو نہیں ، اپنی بارگاہ سے ہم کو قریب کر لے ۔ اے وہ جسکی عظمت کے سامنے تمام عظمتیں

پست ہیں۔ ہمیں عزت عطا فرما۔ اے وہ جسکے سامنے باطنی راز کی خبریں بھی ظاہر ہیں۔
ہم کو اپنے سامنے رسوا نہ کرنا۔

اے وہ جو اس شخص پر بھی رحم کرتا ہے جس پر بندے رحم نہیں کرتے۔ اور اے وہ جو اسے بھی قبول کرتا ہے جسے شہر قبول نہیں کرتے۔ اور اے وہ جو اہل حاجت کو حقیر نہیں سمجھتا۔ اور عاجزی و گریہ و زاری کرنے والوں کو محروم نہیں کرتا۔ اے وہ جو تھوڑے سے عمل کو قبول کرلیتا ہے اور بڑا صلہ دیتا ہے۔ اے وہ جو خود اس کے قریب آجاتا ہے جو اس کے قریب جائے۔ اے وہ جو اپنی طرف پکارتا ہے اس شخص کو جو اسکی طرف سے منھ پھرائے۔ اور اے وہ جو اپنی نعمتوں میں تغیر نہیں کرتا اور نہ جلدی کرتا ہے انتقام لینے میں۔

پس تیرے ہی لئے سب سے اعلیٰ بلندی ہے جو ہر بلندی سے بالا ہے۔ اور تیرے ہی لئے بزرگ تر جلال ہے جو ہر جلال سے بلند ہے۔ ہر جلیل القدر تیرے نزدیک چھوٹا ہے اور ہر صاحب شرف تیرے شرف کے سامنے حقیر ہے۔ محروم رہے وہ لوگ جو گئے تیرے غیر کے پاس۔ اور ناکام ہوگئے تیرے سوا کسی کے پاس جانے والے اور برباد ہوگئے تیرے غیر کا قصد کرنے والے۔ اور تلاش رزق میں نکلنے والے مہمان بنائے جانے سے محروم رہے۔ سوائے ان کے جنہوں نے تیرے فضل سے روزی مانگی۔

میرے آج کے دن کو ناامیدی پر ختم نہ کر۔ اور میرا سوال منھ پر مار کر رد نہ فرما۔ بیشک تجھے کوئی تنگی لاحق نہیں ہوتی اس بات میں جسکا تو ارادہ کرے۔ اور نہ اس چیز سے عاجز ہے جسکا تجھ سے سوال کیا جائے۔ اور تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

خداوند اگر میری آنکھیں خواب آلود ہوگئیں اس وقت جب تیری نمازوں کا وقت تھا۔ تو میری حالت سے واقف ہے۔ اور ایک محدود زمانے تک چشم پوشی سے کام

لیتا ہے۔ افسوس ہے ان آنکھوں کے حال پر یہ کیونکر صبر کریں گی اس وقت جب کے ان پر عذاب کیا جائیگا۔ خداوندا! اکثر میرے پاؤں تیری اطاعت کے راستوں سے الگ گامزن ہوئے۔ تو اس پر مطلوبہ اور محدود زمانے تک چشم پوشی سے کام لیتا ہے۔ افسوس ہے ان پیروں کے حال پر، یہ کیونکر صبر کرینگے جب ان پر عذاب ہوگا۔ خداوندا! بہت ایسا ہوا کہ میں نے ایسی باتوں کا ارتکاب کیا جن میں میرے نفسانی اغراض شریک تھے، تو اس پر مطلع ہوا۔ افسوس یہ میرا جسم کیونکر صبر کرسکے گا جب اس پر عذاب ہوگا۔ خداوندا! کاش میں اپنی ماں کے بطن سے پیدا نہ ہوا ہوتا۔ خداوندا! کاش درندے پہاڑوں پر میرے ٹکڑے کر ڈالتے اور مجھے بحیثیت مجرم تیرے سامنے کھڑا نہ ہونا ہوتا۔ خداوندا! کاش میرے پر پروانہ ہوتے کہ تیرے خوف و ہیبت سے فضا میں پرواز کرتا۔ خداوندا! افسوس میرے حال پر اگر آتش جہنم میری منزل ہو۔ خداوندا! افسوس در افسوس مجھ پر اگر جہنم کے زہریلے پھلوں سے مجھے کھانا نصیب ہو۔ خداوندا! افسوس میرے حال پر اگر قطران (تارکول) کا میرا لباس ہو۔ خداوندا! افسوس در افسوس میرے حال پر اگر آب گرم میرے پینے کے لئے ملے۔ خداوندا افسوس در افسوس میرے حال پر اگر میں تیرے سامنے آؤں اس حال میں کہ تو مجھ سے ناراض ہو۔ اس صورت میں کون ہے جو تجھ کو مجھ سے رضامند بنائے۔ یا کون سے اچھے اعمال میرے ہونگے جنکے سبب سے میں تیرے سامنے سر اٹھاؤں۔ اور جن کا تذکرہ اپنی زبان پر لاؤں کچھ نہیں سوائے اس امید کے جو تیرے کرم سے ہے۔ کیونکہ تیری رحمت تیرے غضب سے آگے ہے۔ اور تو نے کہا ہے کہ میرے بندوں کو بتلا دیں کہ میں بڑا بخشنے والا ہوں اور ترس کھانے والا ہوں اور یہ کہ میرا عذاب بہت سخت ہوگا۔ بالکل سچ کہا تو نے اے میرے مالک، تیرے غضب کو کوئی چیز ٹال نہیں سکتی۔ سوائے تیرے ہی حکم کے اور کوئی چیز تیرے عذاب سے پناہ نہیں دے سکتی سوائے تیری رحمت کے۔ اور تجھ سے کوئی چیز بھی نہیں مل سکتی۔ سوائے تیری ہی بارگاہ میں

گڑگڑاہٹ کے۔ اچھا پھر میں تیرے سامنے کھڑا ہوں بالکل ذلیل بے قدر شکستہ حال اور بے سرو سامان۔ اگر تو مجھے معاف کردے تو کوئی بڑی بات نہیں۔ کیونکہ ہمیشہ سے تیری رحمت میرے شامل حال رہی ہے۔ اور تو نے صحت وسلامتی کا لباس مجھ کو پہنا رکھا ہے۔ اور اگر تو مجھے سزا دے تو میں اسکا مستحق ہوں۔ اور وہ تیری عدالت کا نتیجہ ہوگا۔ خداوندا! اگر میں تیرے ہی پوشیدہ اوصاف اور تیرے ہی اس کمال ذات کا جو تجاب راز میں مضمر ہے واسطہ دے کر یہ سوال کرتا ہوں کہ میرے اس بیتاب نفس اور اس مضطرب جسم اور اس نازک جلد اور ان کمزور ہڈیوں پر رحم کرنا۔ یہ میرا جسم جو اس آفتاب کی حرارت کو برداشت نہیں کرسکتا تیری آگ کو کیسے برداشت کرے گا۔ اور یہ جو تیرے بادل کی گرج کی آواز سے تھرا اٹھتا ہے تیرے غضب کی آوز کو کیسے سن سکتا ہے۔ معافی معافی معافی۔ بے شک گناہوں نے مجھے دھوکہ دیا۔ تیری نعمتوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیرے میں رکھا مگر میں نے تیرا شکریہ بہت کم ادا کیا۔ میرے اعمال انتہائی کمزور ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جس پر میں بھروسہ کروں سوائے تیری رحمت کے۔ اے سب رحیموں سے زیادہ رحیم۔

صحیفہ

صحیفہ دل کے زندہ کرنے کا سامان ہے۔ حاشیہ قرآن ہے۔

پیرایہ دعا میں ہر وہ بات کہدی گئی ہے جس پر عمل پیرا ہوکر انسان فلاح دنیوی و آخروی حاصل کرسکتا ہے اس میں بہتر معاشرے کی تشکیل کے اصول بھی ہیں اور حکمت کے جواہر ریزے بھی اسکا اسلوب آسمانی کتابوں کا ہے۔ اس کا انداز نگارش عرش و لوح کے صحیفوں کا ہے۔ صحیفے کے ذریعے امام نے لوگوں کو اللہ جل جلالہ سے تکلم کرنا سکھایا۔ عرضِ حاجت کرنا سکھایا۔

صحیفے میں اللہ سے ڈرایا بھی گیا ہے تاکہ آدمی گناہوں سے دور رہے اور بشارت بھی دی گئی ہے تاکہ آدمی عمل نیک میں سبقت کرے۔

ان دعاؤں کے پڑھنے کا ثواب الگ ہے۔ ردّ بلا کشائش رزق اور حل مشکل کے فوائد الگ اور زندگی کے روحانی نظریئے کو سمجھنے کا موقعہ الگ ملتا ہے۔ گویا یہ دعائیں ذکر و فکر کا ایک نایاب موقعہ فراہم کرتی ہیں۔ یہ دعائیں اسکے لبوں سے نکلی ہیں جو روحانیت کی راہوں کا رہنما ہے۔ عبودیت کے تقاضے کو پہچانتا ہے۔ خدا سے کلام کے آداب کو سمجھتا ہے۔ یہ دعائیں جان کی بھی حفاظت کرتی ہیں۔ ایمان کی بھی۔ دین کی بھی سمجھ دیتی ہیں۔ خدا پر یقین کو بھی پختہ کرتی ہیں۔ اسکی لازوال عظمت و بزرگی اور جلال و جبروت کا گہرا نقش بھی دل پر بٹھاتی ہیں۔ اس کی اطاعت کی راہ پر چلاتی ہیں۔ اخلاق میں رفعت اور کردار میں عظمت پیدا کرتی ہیں۔

دعا

علم کے عظیم ترین مخزن اور پروردگار کی کتاب مبین نے دعا کے سلسلے میں پکار پکار کر کہا۔

جب میرے بندے میرے بارے میں تم سے پوچھیں تو کہہ دو کہ میں انکے پاس ہی تو ہوں۔ اور جب کوئی مجھ سے دعا مانگتا ہے تو میں قبول کرتا ہوں۔

وہ کون ہے کہ جب مضطر و لاچار اسے پکارے تو وہ قبول کرتا ہے اور ہر دکھ درد کو دور کرتا ہے۔

اور تمہارا پروردگار ارشاد فرماتا ہے کہ تم مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا۔ وہ لوگ جو غرور و تکبر کی وجہ سے میری عبادت سے منھ موڑ لیتے ہیں وہ ذلیل ہوکر

واصل جہنم ہونگے

وہی زندہ ہے اور اسکے سوا کوئی معبود نہیں ۔ پس تم دین میں مخلص بن کر اس سے دعا مانگو ۔

زمین اور آسمان میں جو بھی ہیں سب اسی سے مانگتے ہیں ۔

پس تم لوگ خدا کی عبادت کو خالص کر کے اسی کو پکارو اگرچہ کفار برا مانیں ۔

اور اچھے نام خدا ہی کے ہیں تو اسے انہیں ناموں سے پکارو ۔

وہ لوگ نیکیوں کی طرف تیزی سے بڑھتے تھے اور ہمارے فضل و کرم سے امید لگائے ہوئے تھے اور ہمارے عذاب سے ڈرتے ہوئے دعائیں مانگتے تھے اور ہمارے سامنے سرنیاز جھکائے ہوئے تھے ۔

خدا کے حبیب نے اور ائمہ ھدیٰ نے دعا کی اہمیت کو مومنوں کے دلوں پر نقش کرنے کے لئے بار بار کہا ۔

۱ ۔ دعا مومن کا ہتھیار ہے اور دین کا ستون ہے ۔

۲ ۔ دعا مومن کی سپر ہے ۔

۳ ۔ جب تم بار بار دروازہ کھٹکھٹاؤ گے تو وہ تمہارے لئے کھول دیا جائیگا ۔

۴ ۔ دعا بلا اور مصیبت کو ٹال دیتی ہے ۔

۵ ۔ خدا نے دعا کا نام عبادت رکھا ہے اور اسکے ترک کو غرور سے تعبیر کیا ہے ۔

۶ ۔ دعا بہترین عبادت ہے ۔

۷ ۔ دعا تیز دھار والی انی سے بھی زیادہ موثر و کارگر ہوتی ہے ۔

۸ ۔ تمہیں لازماً دعا مانگنی چاہیے کیونکہ اللہ سے طلب دعا بلاؤ مصیبت کو برطرف کرتی ہے ۔

۹ ۔ تمہیں انبیا کے ہتھیار سے آراستہ ہونا چاہیے اور وہ ہتھیار ہے دعا ۔

۱۰ ۔ دعا عبادت کا مغز ہے ۔

۱۱ ۔ اللہ نے بہت سی نعمتوں کو دعا سے وابستہ کیا ہے اور دعا کو فرض کیا ہے تاکہ بندے اسکے فیض سے بہرہ مند ہوں ۔

۱۲ ۔ دعا انبیا کی سیرت ہے ۔ اولیا کا شیوہ ہے ۔ خاصان خدا کا دستور ہے ۔ روح نیاز مندی ہے ۔ حسن عبودیت ہے ۔ نماز کا لازمی جزو ہے ۔ عاجزی کا اظہار ہے ۔ بندگی کا اقرار ہے ۔ تقرب خداوندی اور خوشنودی پرور دگار کا ذریعہ ہے ۔ حقیر اور فانی انسان کا رب عظیم و جلیل سے رابطہ ہے ۔

امام زین العابدینؑ کے معجزات

فطرت کے کچھ اصول ہیں۔ اور وہ اٹل ہیں۔ پوری دنیا کا نظام انہی فطری اصولوں کی پابندی سے چل رہا ہے۔ مثلاً ہماری آنکھیں ہیں اور بینا ہیں۔ تو ہم ان سے دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ہم وہیں تک دیکھ سکتے ہیں جہاں تک کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ مثلا ہم یہ نہیں دیکھ سکتے کہ دیوار کے پار کیا ہو رہا ہے۔ دیوار کے پار دیکھنے سے سارے انسان عاجز ہیں۔ اگر کوئی انسان یہ کہے کہ میں دیکھ سکتا ہوں کہ دیوار کے پار کیا ہو رہا ہے تو وہ یا جادوگر ہے یا صاحب معجزہ۔ جادو اور معجزہ دونوں فطری اصولوں کو توڑ کے اپنی کارکردگی دکھاتے ہیں اور ہم اسے دیکھ کر اسی لئے حیران ہوتے ہیں کہ اس شخص نے ان فطری اصولوں کو کیسے توڑ دیا جنکا ہر انسان پابند ہے۔ جادوگر یہ کمال شیطان کی مدد سے دکھاتا ہے اور صاحب معجزہ پروردگار سے دعا کرتا ہے۔ کہ جس نے فطرت کو یہ اصول بنا کر دیئے ہیں وہی انہیں توڑ کر اپنی مطلق شہنشاہی کا مظاہرہ کرے۔

رسول، پیغمبر، نبی، امام، ولی، وصی سبھی خدا کے مقرر کردہ ہوتے ہیں۔ انہیں لوگوں کی ہدائیت کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ وہ خدا کا پیغام بندوں کو پہنچاتے ہیں اور ان کو سیدھی راہ پر چلنے کی تاکید کرتے ہیں۔ لیکن انسان جو بہت نا شکرا ہے اور اس شیطان کے دام فریب میں بھی پھنسا ہوا ہوتا ہے جو انسانوں کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ سو انسان اتنی آسانی سے نبی کی بات نہیں مانتا۔ پہلے تو وہ بحث کرتا ہے۔ دلیلیں لاتا ہے۔ اپنا قیاس ظاہر کرتا ہے۔ نبی کو جھٹلاتا ہے۔ جب انسان نبی کی سچی بات اور اسکو تقویت دینے والی سادہ منطق کو اپنے من مانے قیاس اور کمزور دلیلوں کی کج بحثی کے سہارے مسترد کرتا ہے تو نبی کے پاس اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کا آخری طریقہ جو

رہ جاتا ہے وہ معجزہ ہوتا ہے۔ گویا معجزہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں عقل، منطق، حجت، دلیل، بحث، ثبوت، سب ختم ہو جاتے ہیں۔ معجزہ نبی یا امام کی صداقت کا اتنا طاقت ور ثبوت ہوتا ہے کہ اکثر معجزے دیکھنے والے ایمان لے آتے ہیں۔ لیکن انتہائی بد بخت اور شقی ایسے بھی ہوتے ہیں جو معجزے کو دیکھکر بھی اپنی بات پر اڑے رہتے ہیں اور معجزے کو جادو یا سحر کہکر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نبی یا معصوم کی بات ماننے سے بچ گئے۔ لیکن یہیں وہ ٹھوکر کھاتا ہے۔ معجزے کو دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہ لانے والا عذاب خداوندی کو اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے۔

پتھر پہاڑ دریا سمندر چاند سورج ستارے سب فطرت کے زیر اثر ہیں۔ جانور پنی جبلت کے اسیر ہیں اور انسان ارادے کا تابع ہے۔ انسان کے اردے کو خدا نے آزاد چھوڑا ہے۔ چاہے وہ نیکی کا ارادہ کرے یا بدی کا ارادہ کرے۔ باقی پوری کائنات بے ارادہ ہے۔ چیزیں اپنی فطرت کے اور جانور اپنی جبلت کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہیں۔ جسکے کہنے پر درخت چلنے لگے یا پتھر بولنے لگیں۔ موسم خزاں میں فوری طور پر پھل لگ جائیں۔ کھاری پانی کے کنویں مں لعاب دھن ڈالنے سے پانی میٹھا ہو جائے۔ بھیڑیا بکری کی حفاظت کرنے لگے۔ اسکا مطلب ہے کہ وہ شخصیت خدا سے اتنی قربت رکھتی ہے کہ اصول فطرت اور تقاضائے جبلت جنکی زنجیروں میں پوری کائنات گرفتار ہے۔ ان کو اس نے تھوڑی دیر کیلئے توڑ دیا۔ یہ نظام کائنات میں انقلاب کے مترادف ہے۔ اور معجزہ یہی باور کرانے کیلئے ہوتا ہے کہ یہ آدمی اسی کا بھیجا ہوا ہے جس نے نظام کائنات ترتیب دیا ہے۔

معجزہ صداقت کی محکم دلیل ہے خدا کے بھیجے ہوئے ہونے کا ثبوت ہے۔ حق پر ہونے کی نشانی ہے۔ برگزیدہ خدا ہونے کی علامت ہے۔ انسانوں کی عقیدت میں اضافے کا سبب ہے۔ اور چونکہ معجزہ دکھانے کیلئے پروردگار سے دعا کی جاتی ہے

اسلئے انسان کے اللہ سے تعلق کا باعث ہے۔ منصوص من اللہ اور مقرب کردگار بندوں کی شان ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نبی مرسل پیغمبر یا ولی خدا سے کسی بندے نے راہ حق پر آنے کے لئے آخری شرط کے طور پر معجزہ دکھانے کی خواہش کی ہو اور اللہ کے مقرب بندے نے خدا کی اجازت سے معجزہ نہ دکھایا ہو۔ بلکہ بعض دفعہ تو خدا نے اپنے بھیجے ہوئے بندوں کی شان دکھانے کیلئے ان بندوں کے کہے بغیر چیزوں کی ماہیت کو بدل دیا۔

داؤدؑ پر لوہا نرم ہوا۔ سلیمانؑ کے ہوا تابع ہوئی۔ ابراھیمؑ کیلئے آگ گلزار بن گئی۔ موسیٰؑ کیلئے عصا اژدھا بن گیا۔ عیسیٰؑ کیلئے خوان نعمت نازل ہوا۔ یوشع بن نونؑ کیلئے آفتاب پلٹا۔ یعقوبؑ کا نور بصر لوٹ آیا۔ نوحؑ کیلئے تنور سے پانی ابل پڑا۔ یوسفؑ کی عصمت کی گواہی شیر خوار بچے نے دی۔ صالحؑ کیلئے پہاڑ سے ناقہ نکلا۔ اسماعیلؑ کے لئے جنت سے گوسفند آیا۔ اور حبیب رب کریم محمد مصطفےؐ کیلئے چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ معجزہ قدرت الٰہیہ کا ایک خوبصورت اور بر محل اظہار ہے۔ اور انبیا و اولیا کا شعار ہے۔ صاحبان معجزہ کے تذکروں کا ایک ضروری جزو ہے۔ چنانچہ جہاں بھی انبیا و معصومین کے حالات لکھے گئے وہیں انکے معجزات کا بھی ذکر ہوا۔

لیکن بعد میں کچھ ایسے لکھنے والے بھی آئے جو انگریزی تو تھوڑی سی ہی پڑھے ہوئے تھے لیکن مغرب زدہ زیادہ تھے۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ مافوق الفطرت واقعات کی چونکہ کوئی سائنسی توجیہ نہیں ہو سکتی اور زمانہ سائنس کا ہے لہذا لوگ ان معجزات کو مانیں گے نہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ انکی تحریر کا ہی مذاق اڑائیں۔ اس لیئے انہوں نے معجزات کا باب حذف کر دیا۔ انہوں نے معجزے کو خلاف منطق اور خلاف عقل سمجھا۔ حالانکہ اگر ذہنی غلامی سے پیدا ہونے والا احساس کمتری انہیں پریشان نہ کرتا تو یہ انکی سمجھ میں آ سکتا تھا کہ معجزہ آخری منطق ہے اور وہ مقام ہے جہاں عقل

ابتدائی سرگرمیاں کھڑی نظر آتی ہے۔

معجزہ حق ہے۔ کسی نبی یا وصی کے تذکرے کا ایک لازمی جزو ہے۔ لیکن سب سے اہم جزو نہیں۔ کیونکہ حقیقتاً نبی یا ولی کا طرز زندگی ہی ایک معجزہ ہوتا ہے۔ اس دنیا کی تمام ترغیبات کے درمیان رہتے ہوئے وہ لذائذ دنیا اور آسائش حیات سے اس طرح لاتعلق رہتا ہے کہ کسی دوسرے کیلئے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔

ہمارے رسول کیلئے سنگریزوں نے کلام کیا۔ شجر و حجر نے درود و سلام بھیجا۔ سورج مشرق سے پلٹا۔ ماہتاب دو ٹکڑے ہوا۔ ہزاروں بار کھانے میں ایسی برکت ہوئی کہ چند آدمیوں کے قابل کھانے کو سینکڑوں نے کھایا اور ختم نہ ہوا۔ قدموں کی برکت سے درخت ہرے بھرے ہو گئے۔ بند چشمے ابل پڑے۔ لاغر جانور مضبوط و توانا ہو گئے۔ ہر پیش گوئی پوری ہوئی۔ ہر خبر صحیح نکلی۔ ایک رات میں بیت المقدس اور آسمانوں کا سفر کیا۔

یہ سب معجزات ہر مسلم کا جزو ایمان ہیں۔ لیکن خلق رسول سب سے زیادہ حیران کن معجزہ تھا۔ روز سر پر کوڑا پھینکنے اور راہ میں کانٹے بچھانے والی بڑھیا کی عیادت کرنا۔ شق القمر سے بڑا معجزہ ہے۔ زیادہ حیران کن بات ہے۔ اور زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اسلئے کہ شق القمر کا معجزہ تو انہوں نے دیکھا جنھوں نے خواہش کی تھی۔ یا جو اس وقت موجود تھے۔ یہ مزاج پرسی اور عیادت تو ہزاروں برس بعد بھی کتابوں میں، تذکروں میں نہ صرف زندہ و موجود رہے گی بلکہ عام انسانوں کے ذہنوں اور دلوں کو متاثر بھی کرتی رہے گی۔ یہ عیادت ایک ستارہ نور ہے۔ لوگ ہمیشہ اس سے کسب فیض کر کے بہتر انسان بننے کی جدوجہد کرتے رہیں گے۔

کسی نبی یا رسول کے تذکرے میں اگر اسکے اخلاق و کردار کو پس پشت ڈال کر جو اسکی زندگی بھر کی کاوشوں کا ثمر ہوتا ہے صرف معجزوں کو ہی اہمیت دی جائے تو

اس کتاب کے پڑھنے والوں کی عقیدت تو بڑھتی ہے لیکن وہ خود ترقی نہیں کرتے ۔ وہ سوچتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا مقرب بندہ تھا ۔ خدا کا نور تھا ۔ معصوم تھا ۔ اس نے معجزے دکھائے ۔ بہت اچھا کیا ۔ ہم بھی اس کے عقیدت مند ہیں ۔ واہ واہ کرتے ہیں ۔ اور بس ۔ اس سے زیادہ ہم کیا کر سکتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم وہ معجزے دکھائیں ۔

لیکن اگر معجزوں اور الٰہی طاقت کے مظاہروں کے علاوہ ہم اس کے کردار اور اخلاق کو بھی اپنی استطاعت کے مطابق پر اثر انداز میں پیش کریں تو پڑھنے والے کو لازماً inspiration حاصل ہو گا ۔ ہمارا ممدوح اور محبوب اتنا اچھا تھا ۔ اس کے اعمال و افعال اس قدر پسندیدہ خدا تھے ۔ وہ احکام الٰہی پر اس طرح عمل کرتا تھا ۔ جن باتوں سے خدا نے منع کیا ہے ان سے اس طرح بچتا تھا ۔ اسکی عبادت کا یہ انداز تھا ۔ لوگوں سے یہ حسن سلوک تھا ۔ یتیموں ، بیواؤں پر اس طرح شفقت کرتا تھا ۔ فقیروں ناداروں کی ایسے مدد کرتا تھا ۔ دشمنوں کو اس طرح معاف کر دیتا تھا ۔ مشکل ترین حالات میں بھی سچی بات یوں کہتا تھا ۔ امانت کی ایسے حفاظت کرتا تھا ۔ ترغیبات دنیا اسکے لئے بھی تھیں ۔ لیکن وہ غریب ترین آدمی کے معیار پر رہتا تھا ۔ خود روکھی سوکھی کھاتا تھا ۔ باقی اوروں کو دے ڈالتا تھا ۔ خود موٹا جھوٹا پہنتا تھا ۔ باقی صدقہ کر دیتا تھا ۔ یہ تمام باتیں اثر ڈالتی ہیں ۔ آدمی پیروی کرتا ہے ۔ بہت نہیں تو تھوری سی ۔ ہمیشہ نہیں تو کبھی کبھی ۔ اور ایسے منارہ نور کی جیسے امام زین العابدینؑ تھے ۔ تھوڑی سی پیروی ، تھوری سی تاسّی ، تھوڑی سی تقلید ، تھوڑی سی اطاعت ، اور تھوڑا سا اتباع بھی ۔ ہمیں جیسے ہم ہیں اس سے بہت بہتر انسان بنا سکتا ہے ۔ فضائل و مناقب میں سب سے اہم وہ اخلاقی درجہ ہے جس پر وہ انسان فائز ہے ۔ اور یہ یقینی بات ہے کہ جو خلق عظیم کا ورثہ دار ہو گا وہ خدا کا اتنا مقرب بندہ بھی ہو گا کہ جس چیز کی دعا کرے گا وہ ہو جائے گی ۔ اور یہی قبولیت دعا معجزے کی بنیاد ہے ۔

خلق کی حاجت روائی تو امام کا خاندانی شعار تھا۔ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور عسرت و تنگدستی کی شکایت کی۔ آپ نے غلام سے کہا۔ " ہمارا کھانا لاؤ "۔ غلام نے دو سوکھی روٹیاں جو کی لا کے دیدیں۔ امامؑ نے اس شخص کو وہ دونوں روٹیاں دیدیں اور کہا خدا تجھے تنگدستی سے نجات دے گا۔ اس شخص نے سوچا کہ دو روٹیاں مجھے کیا فائدہ پہنچا سکتی ہیں۔ بہرحال عطیہ امامؑ تھی۔ لے لیں۔ راستے میں اس نے ایک روٹی کے عوض ایک مچھلی خریدی اور دوسری کے عوض نمک خریدا۔ تھوڑی دیر میں دروازے پر دستک ہوئی۔ مچھلی والا آیا تھا۔ اس نے کہا " بابا، یہ روٹی تو ہی رکھ لے۔ میرے کس کام کی۔ اور وہ مچھلی بھی بالکل سڑی ہوئی تھی۔ بیکار تھی۔ مچھلی بھی تو رکھ لے "۔ اسکے بعد نمک والا آیا۔ اس نے روٹی واپس کی اور کہا کہ یہ روٹی میں کیا کروں گا۔ اور نمک تھوڑا سا تھا۔ وہ بھی تو رکھ لے۔ اس آدمی نے دونوں روٹیاں اسی طرح لپیٹ کر رکھدیں جس طرح امامؑ سے لایا تھا۔ پھر وہ مچھلی کو صاف کرنے بیٹھا۔ اس مچھلی کے پیٹ میں سے دو بیش قیمت موتی برآمد ہوئے۔ ابھی وہ شخص ان موتیوں کے ملنے پر تعجب ہی کر رہا تھا کہ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ اس شخص نے سوچا کہ اب کون ہو سکتا ہے۔ جا کے دیکھا تو امامؑ کا خادم کھڑا تھا۔ اس نے کہا، امامؑ نے پیغام بھجوایا ہے کہ پروردگار نے تیرے رزق میں جس کشائش کا وعدہ کیا تھا وہ ہو گئی۔ اب ہمارا کھانا ہمیں واپس کر دے۔

ایک بار امامؑ کے ایک عقیدت مند ابو خالد کابلی نے عرض کیا کہ مولا میں اپنی والدہ سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔ اجازت عطا فرمائیں۔ امامؑ نے فرمایا۔ چند دن رک جا۔ شام کا ایک تاجر کل آئے گا اسکی بیٹی پر کسی بدروح نے قبضہ کر لیا ہے۔ وہ اعلان کرائیگا کہ جو اسکی بیٹی کو اچھا کر دے گا اسے بہت انعام دیا جائیگا۔ تم اس سے وعدہ کرا لینا کہ اگر لڑکی اچھی ہو جائے تو وہ تمہیں دس ہزار درھم دے۔ پھر اس لڑکی کا کان پکڑ کر کہنا۔ اے بدروح۔ امام زین العابدینؑ کا حکم ہے کہ تو اس لڑکی کو چھوڑ

دے۔ وہ بدروح چلی جائیگی ۔ اور لڑکی اچھی ہو جائے گی ۔ دوسرے دن ایسا ہی ہوا ۔ ابو خالد کابلی نے لڑکی کو اچھا کر دیا لیکن شام کے تاجر نے بے ایمانی کی ۔ اور معاوضہ نہ دیا ۔ ابو خالد نے امامؑ سے کہا ۔ امامؑ نے فرمایا ۔ پرواہ نہ کر ۔ وہ بدروح پھر قبضہ کر لے گی ۔ اب وہ تجھے پھر بلوائے گا ۔ اس بار پہلے رقم میرے پاس بطور امانت رکھوا دینا۔ چنانچہ دوسرے دن تاجر نے پھر ابو خالد کو بلوایا۔ اب کے ابو خالد نے رقم پیشگی لیکر امامؑ کے پاس رکھوائی ۔ اور لڑکی کا کان پکڑ کر کہا ۔ امام زین العابدینؑ کا حکم ہے کہ اسے چھوڑ دے ۔ وہ بدروح چلا گیا۔ امامؑ نے وہ رقم ابو خالد کابلی کو زاد راہ کے طور پر عطا کر دی ۔

ایک بار امامؑ حج کیلئے تشریف لے جا رہے تھے ۔ منزل عسفان پر قیام ہوا تو امامؑ نے اپنے غلاموں سے کہا کہ یہاں سے خیمے ہٹا لو کیونکہ یہاں جنوں کے خیمے بھی ہیں ۔ انکے لئے جگہ تنگ نہ ہو ۔ اسی وقت آواز آئی ۔ نہیں مولا ، جگہ بہت ہے ۔ آپ خیمے نہ ہٹائیں ۔ اور یہ تحفہ ہماری طرف سے قبول فرمائیں ۔ اسکے ساتھ ہی انگوروں اور اناروں کے طبق ظاہر ہوئے ۔

بلخ کا ایک شخص ہر سال حج کیلئے آتا اور امامؑ کی زیارت سے بھی شرف یاب ہوتا ۔ ایک بار اسکی بیوی نے کہا کہ یہ جو تم ہر سال امامؑ کیلئے تحفہ لیکر جاتے ہو کبھی امامؑ نے بھی تمہیں کچھ دیا ۔ اس نے کہا توبہ کر ، ایسا نہ ہو کہ یہ بات ہوا امامؑ تک پہنچا دے ۔ اسکے بعد جب وہ شخص حج کیلئے آیا تو زیارت امام کیلئے بھی حاضر ہوا ۔ آپ نے اسے کھانا کھلایا ۔ کھانے کے بعد آپ نے ہاتھ دھونے چاہے تو آفتابہ اس شخص نے اٹھا لیا ۔ اور پانی ڈالنا شروع کیا ۔ آپ نے اس سے پوچھا یہ کیا ہے ۔ وہ بولا کہ پانی ہے ۔ آپ نے کہا طشت کو غور سے دیکھ یہ یاقوت ہیں ۔ پھر اس نے پانی ڈالا ۔ آپ نے پوچھا ۔ اب بتا کیا ہے ۔ وہ بولا پانی ۔ آپ نے فرمایا غور سے دیکھ زمرد ہیں۔ پھر پانی ڈالا

آپ نے پوچھا کیا ہے وہ بولا پانی آپ نے فرمایا کہ یہ موتی ہیں ۔ پھر آپ نے یہ سب جواہر اسے دے دیئے اور کہا کہ اپنی زوجہ کو دے دینا ۔ اسکو شکوہ تھا کہ ہم نے اسکو کچھ نہیں دیا ۔ جب وہ شخص گھر واپس پہنچا تو بیوی کو سارے جواہرات دکھائے ۔ اور یہ واقعہ سنایا ۔ بیوی کو بھی قدم بوسی کا اشتیاق ہوا ۔ اگلے برس وہ بھی ساتھ آئی ۔ لیکن مدینے کے قریب پہنچی تو انتقال ہو گیا ۔ شوہر نے آکر امامؑ سے عرض کیا کہ یہ حادثہ ہو گیا ہے ۔ امامؑ نے دو رکعت نماز پڑھی اور فرمایا ۔ جا وہ تیرے انتظار میں بیٹھی ہے ۔ اس نے آکر دیکھا ۔ بیوی زندہ ہو چکی تھی ۔

ایک بار امامؑ حج کو تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک ڈاکو ملا ۔ اس نے کہا ۔ اونٹ سے اتر جاؤ ۔ میں تم کو قتل کروں گا ۔ آپ نے کہا ۔ اگر تجھے مال کی حاجت ہے تو آدھا لے لے ۔ میں معاف کرتا ہوں ۔ اس نے کہا نہیں میں تمہیں قتل کروں گا ۔ آپ نے کہا کہ اچھا اتنا زاد راہ چھوڑ دے کہ مکے پہنچ جاؤں ۔ باقی سارا مال لے لے ۔ میں معاف کرتا ہوں ۔ لیکن وہ اس پر بھی نہ مانا اور مصر رہا کہ اترو ۔ میں تم کو قتل کر کے سارا مال لوٹوں گا ۔ آپؑ نے پوچھا ۔ اچھا بتا کہ تیرا خدا کیا کر رہا ہے ۔ اس نے جواب دیا ۔ میرا خدا سو رہا ہے ۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ دو شیر نمودار ہوئے اور دونوں نے اسے پھاڑ ڈالا ۔

حبابہ والبیہ ایک عورت تھی ۔ اس نے جناب امیر علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ امام کی پہچان کیا ہے ۔ آپ نے کہا ایک پتھر اٹھا لا ۔ وہ اٹھا لائی تو اپنی انگوٹھی سے اس پر مہر لگائی دی اور فرمایا کہ یہ امام کی پہچان ہے کہ وہ پتھر پر اس طرح انگوٹھی سے مہر لگا سکتا ہے ۔ اسکے بعد وہ عورت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے پاس آئی ۔ دونوں بھائیوں نے پتھر پر مہر لگائی ۔ وہ امام زین العابدینؑ کے پاس بھی حاضر ہوئی ۔ آپ نے بھی اس پتھر پر مہر لگائی ۔ جس وقت حبابہ آپؑ کے پاس حاضر ہوئی اس وقت وہ ایک

سو تیرہ سال کی تھی ۔ اور اسکے چہرے پر برص کے داغ تھے ۔ امامؑ نے اپنا دست مبارک پھیرا ۔ وہ داغ دور ہو گئے ۔ پھر دعا کی ۔ خدا نے اسکو دوبارہ جوان کر دیا ۔

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد کچھ لوگ حضرت علیؑ کے فرزند اور امام حسینؑ کے بھائی محمد حنیفہ کو امام ماننے لگے تھے ۔ ان کی غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے ایک بار محمد حنیفہ امام زین العابدینؑ کے پاس آئے اور کہا ۔ بھتیجے ۔ میں امام حسینؑ کا بھائی ہوں ۔ تم سے پہلے امامت پر میرا حق ہے ۔ کیونکہ میں تم سے عمر میں بڑا ہوں ۔ رشتے میں بڑا ہوں ۔ امام زین العابدینؑ نے جواب دیا ۔ چچا آئیں اس کا فیصلہ حجر اسود سے کرا لیتے ہیں ۔ چنانچہ دونوں خانہ کعبہ میں آئے ۔ پہلے محمد حنیفہ نے حجر اسود سے کہا کہ تم جواب دو کہ ہم میں کون امام ہے ۔ حجر اسود خاموش رہا ۔ پھر امام زین العابدینؑ نے سلام کیا ۔ حجر اسود نے جواب سلام دیا ۔ آپ نے یہی سوال کیا ۔ حجر اسود نے فصیح جواب دیا کہ زین العابدینؑ امام برحق ہیں ۔

تاریخ سے یہ بات واضح ہے کہ جب بھی حجر اسود اپنے مقام سے علیحدہ ہوا ہے اسے اسکے مقام پر کسی نبی یا امام نے ہی نصب کیا ہے ۔ رسول اللہؐ کے دور میں آپ کی بعثت سے قبل کعبے کی تعمیر نو ہوئی تو ہر ایک چاہتا تھا کہ وہ حجر اسود کو اسکے مقام پر نصب کرے ۔ اسلئے کہ یہ بڑے شرف کی بات تھی ۔ پھر رسولؐ نے اپنی چادر میں حجر اسود رکھا ۔ ہر قبیلے کے سردار نے چادر کو پکڑا ۔ سب اٹھا کر اسکے مقام تک لائے ۔ پھر رسول اللہؐ نے خود اپنے ہاتھ سے اسے نصب کیا ۔

حجاج بن یوسف کی گولہ اندازی سے کعبے کو نقصان پہنچا تھا ۔ عبدالملک بن مروان کے حکم سے تعمیر نو ہوئی تو پھر یہی مسئلہ پیدا ہوا ۔ اسلئے کہ جب کبھی کوئی شخص حجر اسود کو اسکی جگہ نصب کرنا چاہتا تو پتھر قرار نہ پکڑتا ۔ آخر امام زین العابدینؑ تشریف لائے ۔ اور آپ نے حجر اسود کو اسکی جگہ پر نصب کیا ۔

برکت حاصل کرنے کیلئے لوگ آپ کے پاس آتے۔ ہاتھوں کو چومتے اور انکھوں سے لگاتے۔ لوگوں کا اعتقاد یہ تھا کہ امام زین العابدینؑ جس چہرے کو چھو لیں وہ کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا۔ نہ اسے آشوب چشم یا آنکھوں کی کوئی دوسری بیماری ہو سکتی ہے۔

ایک بار عبدالملک بن مروان طواف خانہ کعبہ کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ امام زین العابدینؑ بھی طواف میں مصروف ہیں۔ پہلے اس نے چاہا کہ امامؑ خود اسکے پاس آئیں۔ مگر آپ بادشاہ وقت کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ اس پر جھلا کر اس نے امامؑ کو بلوایا۔ اور اس بات کی شکایت کی۔ بلکہ قتل کی دھمکی تک دی۔ جب بادشاہ نے دیکھا کہ آپ پر اس دھمکی کا بھی اثر نہیں ہوا تو اس نے کہا اپ کبھی کبھی میرے پاس تشریف لایا کیجیے تاکہ کچھ دنیاوی نفع آپ کو حاصل ہو سکے۔ امامؑ نے صحن کعبہ میں اپنی ردا پھیلا دی اور اس میں کنکر ڈال کر اسے ڈھک دیا۔ پھر دعا کی کہ خدایا اسے اپنے دوستوں کی منزلت دکھا دے۔ وہ سنگریزے، آبدار موتیوں میں ڈھل گئے۔ پھر آپ نے فرمایا جسکی پیش خدا یہ منزلت ہو وہ دنیا والوں کا کیسے محتاج ہو سکتا ہے۔ یہ کہا اور اٹھ کر چل دئے اور عبادات میں مشغول ہو گئے۔

ارشادات

★★ جو شخص خدا کو پہچانتا ہو اور پھر معرفت خدا اسکو غنی نہ کرے تو ایسا شخص شقی ہے۔

★★ خدا کی اطاعت میں بندے کو کبھی کوئی ضرر ہوتا ہی نہیں۔

★★ فانی انسان کیلئے کوئی شان نہیں۔ اگر ہے تو صرف پروردگار کیلئے۔

★★ مجھے تعجب ہے اس آدمی کی عقل پر جو دار فنا کیلئے تو کام کرتا ہے اور دار بقا کا خیال چھوڑے ہوئے ہے۔

★★ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو طعام کی مضرت کا تو یقین رکھتا ہے لیکن گناہ کی رسوائی کا یقین نہیں رکھتا۔

★★ اے ایمان والو۔ شیطان کے بہکائے میں نہ آؤ۔ یہ لوگ تمہیں دنیا کی طرف مائل کرنے والے ہیں۔ جو شخص خدا کی طرف رجوع کرتا ہے وہ زمانے کے تصرفات کا اثر نہیں لیتا۔

★★ جس نے اللہ کی معرفت حاصل کی وہ اس سے ڈرے گا بھی۔ اور یہ خوف اسکو عمل نیک کی طرف لے جائے گا۔

★★ اہل علم وہی لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کو پہچانا۔ اسکی طرف رغبت کی اور نیک عمل کیا۔ گناہ کر کے اس دنیا میں بہتری تلاش نہ کرو۔

★★ اللہ سے ڈرو اور اپنے نفس کی درستگی کیلئے قدم آگے بڑھاؤ۔

خداوند تعالیٰ نے جنت کو صرف اپنے اطاعت گزار بندوں کیلئے خلق کیا ہے۔ خواہ وہ بندہ حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ اور دوزخ نافرمانوں کیلئے ہے۔ خواہ وہ اولاد قریش ہی سے ہو۔ جس وقت روز قیامت صور پھونکا جائے گا۔ تو سب نسب قطع ہو جائیں گے۔ اور نسب کے بارے میں کوئی پرسش نہ ہو گی۔ واللہ کوئی چیز کسی کو نفع نہ دیگی۔ سوائے نیک عمل کے۔

** اگر کوئی تمہاری عزت کرے تو سمجھو کہ اس نے تم پر احسان کیا۔

** غنی وہ ہے جو قانع ہو۔

** جو قلیل رزق پر خدا سے راضی رہے خدا بھی اسکے قلیل عمل سے راضی رہتا ہے۔

** دولت مند وہ ہے جو اللہ کے دیئے پر قناعت کرے۔

** آزادوں کی عبادت معرفت کے بعد ہوتی ہے۔ اسی لئے عالم کے قلم کی روشنائی شہید کے خون سے گراں قدر ہے۔

** ایک ساعت غور و فکر کرنا ستر برس کی عبادت سے بہتر ہے۔

** خدا کی مخلوقات پر غور کرو۔ اور خدا کی الوہیت میں فکر نہ کرو کیونکہ تم اسکے درجے کی حد مقرر نہیں کر سکتے۔

** عقل ایک آئینہ ہے جس میں مومن اپنی اچھائیاں برائیاں دیکھتا ہے۔

** ایک بار آپ سے پوچھا گیا۔ سب سے کامیاب انسان کون ہے۔ آپ نے فرمایا وہ جو دنیا کو اپنی بلندی قدر و منزلت کیلئے حاصل نہ کرے۔

** آپؑ نے اپنے صاحب زادے امام محمد باقرؑ سے فرمایا۔ پانچ اشخاص کو ہرگز دوست

نہ بنانا۔ فاسق کو، بخیل کو، جھوٹے کو، بیوقوف کو، قاطع رحم کو۔ فاسق تمیں بڑی بڑی چیزوں کا لالچ دے گا اور پھر تم کو ایک لقمے کی عوض فروخت کرے دے گا۔ بخیل اسی مال کو دبا کے رکھے گا جسکی تمہیں ضرورت ہو گی اور پھر تم کو ذلیل و رسوا بھی کرے گا ۔ جھوٹے کی مثال سراب سی ہے۔ بیوقوف جب تمیں فائدہ پہنچانا چاہے گا تو اسکی بیوقوفی سے تم کو نقصان ہی پہنچے گا۔ قاطع رحم وہ ہے جو اپنے عزیزوں سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ ایسا انسان خدا کی کتاب میں ملعون لکھا ہے۔

قاتلان حسین پر لعنت

جب عبداللہ بن زیاد نے جامع مسجد کوفہ میں منبر پر امام حسینؑ اور حضرت علیؑ کو دروغ گو کہا۔ تو عبداللہ بن عفیف نے جنکی ایک آنکھ جمل میں اور ایک صفین میں جنگ کی نذر ہو گئی تھی، اٹھ کر کہا۔ حرامزادے۔ تو جھوٹا تیرا باپ جھوٹا اور وہ جس نے تجھے حاکم بنایا۔

ظالم اس قدر کڑوے سچ کو کیسے برداشت کرتا۔ اس نے عبداللہ بن عفیف کے قتل کا حکم دے دیا۔ اس حکم کو سن عبداللہ بن عفیف نے ابن زیاد سے کہا۔ میں نے تیری پیدائش سے بھی پہلے خدا سے دعا مانگی تھی کہ وہ مجھے درجہ شہادت حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور قاتل دشمن خدا اور بدترین مخلوق ہو۔ لیکن جب میری آنکھیں ضائع ہو گئیں تو میں مایوس ہو گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے مایوس نہ ہونے دیا۔ اور میری دعا قبول فرمائی۔

اے مہاجر و انصار کی مبارک نسلو۔ خدا سے فریاد کرو اور اس کافر مطلق سے انتقام لو جس کو جناب رسول خداؐ نے لعین ابن لعین فرمایا تھا۔

دربار یزید میں ابو برزہ اسلمی نے کہا۔ یزید۔ ان دانتوں سے اپنی چھڑی ہٹا لے۔ بخدا میں نے رسول اللہؐ کو دیکھا ہے کہ آپ حسنؑ و حسینؑ کے دانتوں اور ہونٹوں کا بوسہ لیتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ تم دونوں جوانان جنت کے سردار ہو۔ خدا تمہارے قاتلوں کو ہلاک کرے۔ ان پر لعنت کرے اور انہیں جہنم میں داخل کرے۔ اور ان کا انجام کار برا ہو۔ یزید نے کہا تم رسولؐ کے صحابی نہ ہوتے تو قتل کرا دیتا۔ ابو برزہ اسلمی نے جواب دیا۔ میرے ساتھ تو صحبت رسولؐ کا اتنا لحاظ کر رہا ہے۔ اور

امام حسینؑ کی قرابت کا بھی خیال نہیں رکھا گیا اور ان کو بے گناہ قتل کرا دیا گیا۔

زید بن ارقم نے ابن زیاد کے دربار میں کہا ۔ اے قوم عرب اور اے غلاموں کے غلام تم نے پسر نابغہ کو پسند کیا اور پسر مرجانہ کو سلطنت اسلامی اسی لئے دی تھی کہ اس نے اخیار امت کو قتل کیا۔ اور اشرار امت کو اپنا ملازم بنایا۔ اور تم کو اس لئے آزاد کر دیا کہ تم کو ہمیشہ ذلیل و خوار رکھے ۔ خدا اپنی رحمت سے اس شخص کو دور رکھے جو مکرو فریب اور ذلت و عار کو اپنا شعار کرے۔

جناب زینبؑ نے دربار میں فرمایا۔ تعریفیں اس خدا کیلئے زیبا ہیں جو تمام دنیا کا پروردگار ہے ۔ اور درود وسلام ہو رسول خداؐ اور انکی آلؑ پر۔ کتنا سچ فرمایا ہے خداوند عالم نے کہ جنھوں نے برائیاں کیں ۔ آیات خدا کو جھٹلایا۔ اور مضحکہ اڑایا ان لوگوں کا انجام کار یہ ہو گا کہ وہ سب کے سب جہنم میں داخل ہوں گے۔

یزید نے طیش میں آکر کہا۔ ان قیدیوں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے۔

نعمان بن بشیر نے کہا۔ ان کے ساتھ اسی طرح پیش آ جس طرح رسول اللہؐ پیش آیا کرتے تھے۔

مروان بن حکم کے بھائی۔یحیی بن حکم نے ایک دن یزید کے سامنے یہ اشعار پڑھے ۔ مقام طف میں کربلا کے شہیدوں کی جو لاشیں پڑی ہیں وہ ابن زیاد جیسے غلام اور ذلیل النسب آدمی کی بہ نسبت ہم سے زیادہ قریب ہیں۔ سمیہ کی نسل تو سنگریزوں سے زیادہ ہو جائے اور افسوس کہ نسل فاطمہ میں کوئی نہ رہے۔

جاثلیق نصرانی نے بھرے دربار میں یزید سے کہا۔

تجھ پر اور تیرے دین پر افسوس ہے اے یزید کہ تو نے اس کو قتل کیا جسکی دل شکنی خدا سے ، رسولؐ سے ، علیؑ سے اور فاطمہؑ سے گوارا نہ ہوئی ۔ اے

حسین مظلومؑ ۔ تم گواہ رہنا کہ میں تمہارے قاتل پر خدا کی طرف سے لعنت کا خواستگار ہوں ۔

راس الجالوت نے یزید کو للکارا ۔

اے یزید تیرا خیال ہے کہ جن سے معاہدہ تھا اور جو ذمی تھے انکے قتل پر تو رسول خداؐ بروز قیامت غضبناک ہوں گے اور اپنے فرزند کے قاتل سے نہ پوچھیں گے کہ تو نے کیوں اسے قتل کیا۔

یزید نے اسے قتل کرا دیا۔

ایک عورت یزید کے دربار میں داخل ہوئی ۔ اور اس نے اپنا خواب بیان کیا۔ کہ میں نے دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھلے اور اس میں سے پانچ بادشاہ اترے ۔ ان کے ہاتھ میں آگ تھی ۔ اور انہوں نے کہا کہ خدا نے حکم دیا ہے کہ یزید کے گھر کو جلا دو ۔ یزید نے اس عورت کے قتل کا حکم دیدیا ۔ عورت نے پوچھا کہ کسی طرح تو یہ حکم واپس لے سکتا ہے ۔ یزید بولا کہ اگر تو منبر پر علیؑ و اولاد علیؑ کو برا بھلا کہے ۔ وہ عورت منبر پر آئی اور اس نے کہا ۔ اے لوگو تم کو معلوم ہو کہ یزید نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں حضرت علیؑ اور انکے اہل بیتؑ کو برا کہوں ۔ حالانکہ وہ ساقی کوثر ہے ۔ اور بروز قیامت لوائے حمد اسی کے ہاتھ میں ہو گا ۔ اور اولاد اسکی سردار جوانان بہشت ہے ۔ آگاہ ہو تم لوگ کہ لعنت ہے خدا کی اور لعنت ہے لعنت کرنے والوں کی یزید پر اور ان پر جنھوں نے اسکی بیعت کی ۔ اور قتل حسینؑ کا قدم اٹھایا۔

یزید نے اسے قتل کرا دیا۔

ابن زیاد نے مروان سے کہا۔

یزید کا بیٹا خالد بھی یزید کی طرح جھوٹا بے وفا اور بد عہد ہو گا۔ یزید نے

قتل حسینؑ کے سلسلے میں مجھے پچاس خط لکھے۔ جب میں نے اسکے حکم کی تعمیل کر دی تو وہ الٹا مجھی کو الزام دینے لگا۔ اور کہنے لگا کہ ابن زیاد نے بغیر میری اجازت کے امام حسینؑ کو شہید کیا۔ یزید کی مثال شیطان کی سی ہے۔ کہ شیطان انسان سے گناہ کرنے کو کہتا ہے۔ اور جب انسان کر چکتا ہے تو شیطان کہنے لگتا ہے کہ جو کچھ اس نے کیا میں اس سے بری ہوں۔ میں تو رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

فضیلت تو وہی ہے جسکی قاتل بھی گواہی دے

شمر نے اپنے نیزے پر سر حسینؑ نصب کیا اور فخریہ یہ اشعار پڑھے۔

" میں طویل نیزے والا ہوں ۔ میں اسکا قاتل ہوں جسکا دین خالص تھا میں نے ابن سید الوصیین کو قتل کیا۔ اور اسکا سر امیر المومنین (یزید) کیلئے لئے جا رہا ہوں۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے ۔ حسینؑ کا دین خالص تھا۔ وہ ابن سید الوصیین تھا۔ یہ گواہیاں کون دے رہا ہے ۔ جس نے قتل کیا ہے ۔ حق کا عروج یہی ہے کہ قتل کرنے والا بھی تعریف پر مجبور ہے۔

یزید نے کہا۔ وہ سر جو چاندی کے طشت میں میرے سامنے رکھا ہوا ہے کتنا حسین اور خوبصورت ہے ۔ دونوں رخسار گلاب کے پھول معلوم ہوتے ہیں ۔ اے حسینؑ تم نے جنگ کو کیسا پایا۔ میں نے حسینؑ کے خون سے اپنی پیاس بجھائی ۔ کاش وہ لوگ جو جنگ حنین میں تھے آج یہاں موجود ہوتے۔ تو دیکھتے کہ میں نے حسینؑ کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔

یزید کی اپنی زبان سے نکلے ہوئے ان اشعار میں حسینؑ کی توصیف بھی ہے۔ اور یزید کی شقی القلبی کا اعتراف بھی ہے۔ اس نے کہا۔" ہم نے علیؑ سے خون کا بدلہ لے لیا۔ اور ان سواروں کو قتل کیا جو شیر تھے۔"

یہ ہیں خاندان رسالت کے فضائل ۔ جو رہتی دنیا تک ذہنوں کے افق پر سورج کی طرح جگمگاتے رہیں گے ۔ یہ شیروں کا گھرانہ ہے ۔ علیؑ خدا کے شیر تھے ۔ عباس ابن علیؑ شیر خدا کے تیر تھے ۔ قاتل اپنے کینے اور عداوت کے باوجود شجاعت کا

معترف ہے۔

حصین ابن نمیر نے کہا۔" سچ ہے کہ یہ لوگ بڑے سیر چشم ہیں۔ خلافت جیسی انمول چیز کو کیسی بے پروائی سے ٹھکرا دیا۔" حصین ابن نمیر وہ شقی ازلی جس نے حضرت علی اکبرؑ کے سینے پر سناں لگائی تھی۔ شہزادے کو قتل کیا تھا۔ اس نے علیؑ ابن الحسینؑ کو بعد یزید خلافت کی پیشکش کی تو امامؑ نے کہا۔ دنیوی بادشاہت سے ہم اہل بیت رسولؐ کو کیا تعلق۔ تیری درخواست ہرگز قبول نہیں کروں گا۔

عبدالملک نے حجاج بن یوسف کو لکھا۔" میں نے آل ابو سفیان کو دیکھا ہے کہ انہوں نے بنی ھاشم کے خون سے ہاتھ رنگے تو وہ خود بہت تھوڑے عرصے میں برباد ہو گئے۔"

دشمنوں کو بڑی شدت سے احساس ہے کہ یہ خاصان خدا ہیں۔ ان کو ستانے والا چین نہیں پا سکتا۔ لیکن دنیا کی ہوس مجبور کر دیتی ہے کہ اپنی حکومت کے استحکام کیلئے انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے۔ ساری فضیلتیں معلوم ہیں۔ فضیلتوں کا اعتراف ہے لیکن دنیا بھی عزیز ہے۔ اتنی کہ اس پر عقبیٰ نثار کرنے کو تیار ہیں۔

عبدالملک بن مروان نے عمر بن علی سے کہا۔ تم صدقات رسالتماب اور علی مرتضیٰؑ کی ولایت کا دعوی کرتے ہو اور امام زین العابدینؑ کے خلاف ہو اور یہ کہتے ہو کہ وہ علیؑ کے پوتے ہیں اور تم بیٹے ہو۔ لہذا تم زیادہ مستحق ہو۔ تو سنو۔ یہ شعر سنو۔ پھر عبدالملک نے یہ شعر پڑھا۔

" باطل کو حق کا جامہ نہ پہنا اور حق کو چھوڑ کر باطل سے تمسک نہ کر"۔ اور صدقات رسول اور صدقات علی کی تولیت کے دعوے کا فیصلہ علی بن الحسینؑ کے حق میں کر دیا۔ عمر بن علی اسکے حاشیہ نشین تھے۔ یہاں عبدالملک کو یاد ہے کہ علی بن حسینؑ حق

پر ہیں لیکن جب حاسدان اہلبیت جھوٹی خبریں پہنچاتے ہیں کہ علی ابن الحسینؑ سے تیری بادشاہت کو خطرہ ہے تو گرفتار کرا لیتا ہے۔

حجاج بن یوسف نے عبدالملک کو لکھا جب تک علی ابن الحسینؑ زندہ ہیں تو ہرگز من مانی نہیں کر سکتا۔

ابن زیاد کو جب یزید نے مکہ کو تباہ کرنے کیلئے بھیجنا چاہا تو ابن زیاد نے کہا۔ یزید نے قتل حسینؑ تو میرے نامہ اعمال میں لکھوا دیا۔ اب چاہتا ہے کہ میں مکہ پر بھی حملہ کروں۔ میرے لئے قتل حسینؑ کا گناہ بہت ہے۔ اب میں اس پر کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔ اب خیال آیا کہ قتل حسینؑ گناہ ہے۔

بشیر ابن مالک نے ابن زیاد کے سامنے سر حسینؑ کو پیش کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھے۔

"اے امیر میری رکاب کو سونے اور چاندی سے بھر دے۔ میں نے ایسے بلند مرتبہ بادشاہ کو قتل کیا ہے جس نے بچپن میں دونوں قبلوں کی جانب نماز پڑھی ہے۔ میں نے ایسے شخص کو قتل کیا ہے جو ماں اور باپ دونوں کی طرف سے بہترین انسان اور اپنے نسب کے اعتبار سے تمام دنیا میں سب سے بڑھا چڑھا ہوا تھا"۔ نیکیوں میں حسینؑ کی سبقت نسب میں حسینؑ کی برتری اسلام میں حسینؑ کا رتبہ۔ ان سب چیزوں کی گواہی قاتلوں کی زبان پر ہے۔ اور ظلم و ستم بھی جاری ہے۔ یہ تضاد کیسا عجیب ہے۔ اتنے فضائل جاننے کے بعد بھی قتل کرتے ہو۔

یزید نے دیکھا کہ امام زین العابدینؑ گفتگو کر رہے ہیں اور تسبیح کو گردش بھی دیتے جا رہے ہیں۔ تو اس نے اعتراض کیا۔ امامؑ نے کہا۔ میرے باپ نے مجھے

بتایا ہے کہ رسول اللہؐ صبح کو ذکر خدا کے بعد تسبیح پڑھتے تھے۔ میں انکی پیروی کرتا ہوں۔ اب یزید کیا کہے۔ جھلا کر اس نے کہا۔

میں تم لوگوں میں کوئی شخص ایسا نہیں پاتا ہوں جو جواب میں میرا منھ نہ توڑ دے۔ بات صرف حاضر جوابی کی نہیں ہے۔ بات حق پر ہونے کی ہے۔ بات دلیل کے مستحکم ہونے کی ہے۔ اہل بیتؑ معترض کیلئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ اور کوئی بات جو سچ ہو وہ کہنے سے ڈرتے نہیں۔

امام زین العابدینؑ کا خط مومنین کے نام

اے ایمان والو۔ شیطانوں کے بہکائے میں نہ آؤ۔ یہ لوگ تمہیں دنیا کی طرف مائل کرنے والے ہیں۔ اس چیز سے ڈرو جس سے تمہیں اللہ نے ڈرایا ہے۔ ان چیزوں کو ترک کر دو جنکے نہ کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ دنیا کو جائے قرار اور وطن سمجھکر اسکی چیزوں پر بھروسہ مت کرو۔ اس میں جو کچھ ہے تمہارے نقصان کیلئے ہے۔ تم زمانے کے انقلابات سے آگاہی حاصل کرو۔ یہ دنیا اپنے اہل کے ساتھ کھیلتی ہے۔ ذلیلوں کو ابھارتی ہے۔ شریفوں کو ذلیل کرتی ہے۔ روزمرہ نئے نئے واقعات تمہارے سامنے آتے رہیں گے۔ فتنہ و فساد مصائب و آلام، ظلم و جور، بادشاہ وقت کا خوف، شیطان کا وسوسہ۔ یہ سب اسلئے ہیں کہ تمہارا دل پریشان ہو۔ اور تم ھدائیت کو بھول جاؤ۔

جو شخص خدا کی طرف رجوع کرتا ہے وہ زمانے کے تصرفات کا اثر نہیں لیتا۔ وہ ہمیشہ زہد سے مدد لیتا ہے۔ فکر سے کام لیتا ہے۔ صبر سے نصیحت قبول کرتا ہے۔ دنیا کی چند روزہ زندگی کو ترک کر دیتا ہے۔ اور اس کی لذتوں سے دور رہتا ہے۔ آخرت کی نعمتوں کی طرف ہمیشہ راغب رہتا ہے۔ موت کا انتظار کرتا ہے۔ ظالموں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کو برا سمجھتا ہے۔ دنیا کو بری نظر سے دیکھتا ہے۔ فتنوں بدعتوں اور بادشاہوں کے ظلم کو اپنی نگاہ میں رکھتا ہے۔

ایمان والو، اللہ سے مدد چاہو۔ اسی کی اطاعت کی طرف رجوع کرو۔ وہی اطاعت کا سزا وار ہے۔ گناہوں سے پرہیز کرو۔ اس سے پہلے کہ حسرت و ندامت لاحق ہو اور اللہ کے سامنے پہنچو۔ جس قوم نے خدا کی نافرمانی کی۔ اور آخرت پر دنیا کو ترجیح دی۔ اس کا انجام خراب ہوا۔ اللہ کی معرفت اور نیک عمل دو محبت و لے

دوست ہیں ۔ جس نے اللہ کی معرفت حاصل کی وہ اس سے ڈرے گا بھی اور یہ خوف اسکو نیک عمل کی طرف لے جائے گا ۔ اہل علم وہی لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کو پہچانا ، اسکی طرف رغبت کی اور عمل نیک کیا ۔ خدا قرآن میں فرماتا ہے اللہ سے ڈرنے والے اسکے بندوں میں علما ہیں ۔ گناہ کر کے اس دنیا میں بہتری تلاش نہ کرو ۔ ہمیشہ ایسے کام کی طرف رغبت کرو جس میں اطاعت خدا ہو ۔ اپنی عمر کے دن غنیمت سمجھو ۔ اور ایسے کاموں کی کوشش کرو ۔ جن سے روز قیامت تمہیں عذاب خدا سے نجات ملے ۔

آگاہ ہو کہ تم بھی خدا کے بندے ہو اور ہم بھی ۔ تم پر اور ہم پر کل وہی حاکم ہو گا ۔ ہم سب اسکے سامنے کھڑے ہوں گے ۔ پس کھڑے ہونے سے پہلے جواب کیلئے تیار ہو جاؤ ۔ وہ ایسا دن ہو گا کہ کوئی شخص بے اذن خدا کلام نہ کر سکے گا ۔ اس دن خدا کسی جھوٹے کی تصدیق نہ کریگا ۔ اور کسی سچے کو جھوٹا نہ بنائے گا ۔ کسی مستحق کے عذر کو رد نہ کرے گا ۔ اور کسی غیر مستحق کے عذر کو مانے گا نہیں ۔ اس نے اپنی حجت رسولوں اور ان کے اوصیا کے ذریعے پوری کر دی ہے ۔ پس خدا کے بندو اللہ سے ڈرو اور اپنے نفسوں کی درستگی کے لئے قدم آگے بڑھاؤ ۔

اللہ اور اللہ کے دوستوں کی اطاعت اختیار کرو ۔ اللہ سے توبہ اور استغفار کرو ۔ وہی توبہ قبول کرنے والا اور گناہوں کو بخشنے والا ہے ۔ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو اچھی طرح جانتا ہے ۔ خود کو نافرمانوں کی صحبت ظالموں کی اعانت اور بدکاروں کی ہم نشینی سے بچاؤ ۔ ان کے فتنوں سے ڈرو ۔ یہ سمجھ لو کہ جس نے اولیا اللہ کے خلاف کیا ۔ اللہ کے دین کے سوا دوسرا دین جاری کیا ۔ اسکے ولی کو چھوڑ کر دوسرا ولی بنایا ۔ اسے ایسی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا جسکے شعلے رات دن اسکے جسم کو کھائیں گے ۔

امام کا ایک موعظہ

لوگو، تمہاری بازگشت اللہ کی طرف ہونے والی ہے۔ پس جو اچھے یا برے کام کسی نے یہاں کئے ہیں وہ سب وہاں اسکے سامنے ہونگے۔ لوگو تمہاری موت بہت سرعت کے ساتھ تمہاری طرف آ رہی ہے۔ عنقریب یہ تم کو پکڑے گی اور فرشتہ موت تمہاری روح قبض کر لے گا۔ پھر تم اکیلے قبر میں جا لیٹو گے۔ منکر و نکیر تمہارے پاس آئیں گے اور تم سے سوالات کرینگے۔ یہ امتحان بڑا سخت ہو گا پہلے وہ تمہارے رب کے متعلق پوچھیں گے۔ پھر اس نبیؐ کے متعلق جو تمہاری طرف بھیجا گیا تھا۔ پھر اس دین کے متعلق جس پر تم تھے۔ پھر کتاب کے متعلق جو خدا کی طرف سے تمہارے لئے بھیجی گئی۔ پھر اس امامؑ کے متعلق جسے تم دوست رکھتے تھے۔ پھر تمہاری عمر کے متعلق سوال ہو گا کہ کن کاموں میں صرف کی۔ کیا کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ پس ذرا اپنے نفسوں پر غور کر لو۔ اور امتحان سے پہلے جواب کیلئے تیار ہو جاؤ۔ اگر تم مومن ہو۔ دین دار ہو۔ صادقین کے پیرو ہو۔ دوستان خدا کے دوست ہو۔ تب تمہاری زبان ٹھیک سے جواب دے گی۔ اور خدا کی طرف سے تم کو جنت کی بشارت ملے گی۔ ملائکہ بہشت کی خوشیوں کے ساتھ تمہارا استقبال کرینگے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو زبان لڑکھڑا جائیگی۔ جواب نہ دے سکو گے۔ ایسی حالت میں دوزخ کی خبر دی جائیگی۔ عذاب کے فرشتے آئیں گے۔ دوزخ کا گرم پانی اور پیپ ان کے ساتھ ہو گی۔ اے بنی آدم۔ مرنے کے بعد بڑا سخت وقت آ رہا ہے۔ قیامت کے دن لوگوں کے دل لرزتے ہوں گے۔ سخت رسوائی کا سامنا ہو گا۔ صور پھونکا جائے گا۔ قبروں سے لوگ نکالے جائیں گے۔ سب کے دم گھبرا رہے ہوں گے۔ اس روز نہ کوئی فدیہ قبول ہو گا نہ معذرت سنی جائے گی۔ نہ توبہ قبول ہو گی۔ اس روز نیکی کا بدلہ نیکی اور بدی کا بدلہ بدی سے

مل کر رہے گا۔ لوگو! گناہوں سے بچو جن سے خدا نے تمیں روکا ہے۔ اور شیطان کے
مکروفریب سے بچو اور غفلت کرنے والوں میں سے نہ بنو۔

التماس سورہ فاتحہ
برائے
عزیز فاطمہ
بنتِ ضامن علی
(زوجہ مرزا عبد عباس)

دعائے امام زین العابدین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یا دائم یا دیموم یا حیی یا قیوم یا کاشف الغم و یا فارج الھم ویا باعث الرسل و یا صادق الوعد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بسم اللہ و با اللہ ومن اللہ والی اللہ و فی سبیل اللہ ٥ اللھم الیک اسلمت نفسی و الیک وجھت وجھی و الیک فوضت امری اللھم فاحفظنی بحفظ الایمان من بین یدی و من خلفی وعن یمینی و عن شمالی و من فوقی و من تحتی و من قبلی و ادفع عنی بحولک و قوتک فانہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم ۔

صدقہ جاریہ

طاؤس یمانی نے حج کے زمانے میں ایک بار امام زین العابدینؑ کو دیکھا کہ آپ حجر اسود کے قریب نماز پڑھ رہے ہیں۔ سجدہ کر رہے ہیں۔ اپنے رخساروں کو زمین پر رگڑ رہے ہیں۔ اور اپنی ہتھیلیوں کو جانب آسمان بلند کر کے یوں دعا کر رہے ہیں کہ۔

عبیدک بفنائک مسکینک بفنائک فقیرک بفنائک صغیرک بفنائک سائلک بفنائک

طاؤس یمانی کہتے ہیں کہ میں نے جب بھی کسی امر کیلئے ان کلمات کے ساتھ دعا کی تو وہ مستجاب ہوئی۔ اور آسانی سے میرا کام ہوگیا۔

آج بھی برادران ایمانی امام زین العابدینؑ کے اس صدقہ جاریہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ امام کی بتائی ہوئی ایک اور دعا یہ ہے۔

الٰہی کیف ادعوک و انا انا وکیف اقطع رجائی منک وانت انت

الٰہی اذالم اسئلک فتعطینی فمن ذالذی اسئلہ فیعطینی

الٰہی اذا لم ادعوک فتستجب لی فمن ذالذی ادعوہ فیستجیب لی

الٰہی اذالم اتضرع الیک فترحمنی فمن ذالذی اتضرع الیہ فیرحمنی

الٰہی فلما فلقت البحر لموسیٰ علیہ السلام ونجیتہ اسئلک ان تصلی علی محمد و آل محمد و ان تنجینی مما انا فیہ و تفرج عنی فرجاً عاجلاً غیر اجل بفضلک و رحمتک یا ارحم الراحمین۔

ایک تسبیح درود کی پڑھ کر یہ دعا سو بار پڑھے پھر ایک تسبیح درود کی پڑھے

اور دعا کرے انشا اللہ مستجاب ہو گی۔

ترجمہ اس دعا کا یہ ہے کہ " الہی میں تجھے کیسے پکاروں جبکہ میں میں ہوں۔ اور تجھ سے امید کیسے منقطع کر دوں جبکہ تو تو ہے۔ الہی جبکہ میں نے تجھ سے نہیں مانگا پھر بھی تو نے دیا۔ پس وہ کون ہے جس سے مانگوں اور وہ مجھے دے۔ الہی جب میں نے تجھے پکارا نہیں اور تو نے پھر قبول کیا۔ پس وہ کون ہے جسے پکاروں اور وہ قبول کرے۔ الہی جب میں گڑگڑایا بھی نہیں پھر بھی تو نے رحم کیا۔ تو اب کون ہے جسکے سامنے گڑگڑاؤں اور وہ رحم کرے۔ الہی جس طرح تو نے موسیٰ کیلئے دریا کو پھاڑ دیا اور ان کو نجات دی میں سوال کرتا ہوں کہ تو درود بھیج محمد و آل محمد پر اور مجھے نجات دے اس سے کہ جس میں میں پھنسا ہوا ہوں اور مجھے خوشی دیدے جلدی سے بغیر دیر کے۔ اپنے فضل سے اور اپنی رحمت سے۔ اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے۔"

کوئی بہت بیمار ہو تو سوا گز سفید کپڑا، سوا روپیہ، کوئلہ، ماش کی دال اور ہلدی سید سجاد کے نام پر خیرات کرتے ہیں۔ اور صحت کی دعا مانگتے ہیں۔

سب لوگ مانگتے ہیں صحت کی بھیک جن سے

ہوتے ہیں دیکھو ایسے بیمار کربلا کے

زیارت امام زین العابدین

السلام علیک یا بن رسول اللہ اسلام علیک یا بن نبی اللہ السلام علیک یا بن امیر المومنین السلام علیک یا بن الحسین الشہید اسلام علیک ایھا الشہید و ابن الشہید السلام علیک ایھا المظلوم و ابن المظلوم لعن اللہ امتہ قتلتک و لعن اللہ امتہ ظلمتک و لعن اللہ امتہ سمعت بذالک فرضیت بہ

زیارت جامعہ امام زین العابدینؑ ، امام محمد باقرؑ و امام جعفر صادقؑ

السلام علی اولیا اللہ و اصفیائہ اسلام علی امنا اللہ و احبائہ
اسلام علی انصار اللہ و خلفائہ اسلام علی محال معرفتہ اللہ
السلام علی مساکن ذکر اللہ السلام علی مظھری امراللہ و نھیہ
السلام علی الدعاہ الی اللہ السلام علی المستقرین فی مرضات اللہ
السلام علی المخصین فی طاعتہ اللہ السلام علی الا ولا علی اللہ
السلام علی الذین من والاھم فقد والی اللہ و من عاداھم فقد عادی اللہ و من

کتابیات

اردو میں جو کتابیں اس موضوع پر دستیاب ہیں:

۱۔ مقدمہ صحیفہ کاملہ — مفتی جعفر حسین

۲۔ مقدمہ صحیفہ کاملہ — نسیم امروہوی

۳۔ امام زین العابدینؑ — ضیاالحسن موسوی

۴۔ امام زین العابدینؑ — عبدالعزیز سید الاھل

۵۔ امام زین العابدینؑ — ادارہ تحریر موسسہ در راہ حق قم (ترجمہ احمد علی احمد عابدی)

۶۔ امام زین العابدینؑ کی زندگی کا تحقیقی مطالعہ — آیت اللہ سید علی خامنہ ای

۷۔ سیرت سجادؑ — سید احمد حسین ترمزی

۸۔ صحیفۃ العابدینؑ — سید اولاد حیدر فوق بلگرامی

۹۔ صدائے سید سجادؑ — محمد یوسف حریری

۱۰۔ اہلبیت اطہار کی مختصر سوانح حیات — عقیقی بخشائش

۱۱۔ تاریخ عاشورہ — ڈاکٹر محمد ابراھیم آیتی

۱۲۔ چوتھے امام کی مختصر سوانح عمری — مولانا ظفر حسن امروہوی

۱۳۔ رسولؐ و اہل بیت رسولؐ (حصہ سوم) مولانا سید علی جعفری

۱۴۔ محافل و مجالس (حصہ اول) سید ذیشان حیدر جوادی

۱۵۔ انوار امامت علی حسن اختر امروہوی

۱۶۔ چودہ ستارے نجم الحسن کراروی

۱۷۔ لواعج الاحزان سید محمد مہدی

۱۸۔ بارہ امام علی احمد حسین ترمذی

۱۹۔ ذکر معصوم علامہ اختر امروہوی

۲۰۔ الحسین عمر ابو النصر

۲۱۔ احیائے دین استاد شہید مطہری

۲۲۔ کردار کی روشنی مرتضی حسین

۲۳۔ علی ابن ابی طالبؑ علی اختر زیدی

۲۴۔ اصول کافی محمد ابن یعقوب کلینی

۲۵۔ حیات علی ابن الحسینؑ ضمیر اختر نقوی

۲۶۔ امام زین العابدینؑ کی سیاست محمد باقر شمس

۲۷۔ حیات علی ابن الحسینؑ ساعدی

۲۸۔ تاریخ طبری محمد ابن جریر الطبری

۲۹۔ تاریخ کامل کامل ابن اثیر

عرفهم فقد عرف الله و من جهلهم فقد جهل الله و من اعتصم بهم فقد اعتصم بالله و من تخلی منهم فقد تخلی من الله اشهد الله انّی سالما لمن سالمکم و حرب لمن حاربکم موٴمن لبسرکم و علانیتکم مفوض فی ذالک کله الیکم لعن الله عدو آل محمد من الجن والانس وابرالی الله منهم وصلی الله علی محمد و آله الطاہرین۔

کتاب ـ چشم و چراغِ کربلا

مصنف ـ مرزا حیدر عباس

پیدائش ـ ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۲ء بھرت پور (انڈیا)

تعلیم ـ ایم اے انگریزی ـ ایم اے اردو

پیشہ ـ پرنسپل گورنمنٹ ڈگری سائنس کالج ملیر

پتہ ـ ۱۴ ـ سی ہارون ہائٹس سیکٹر ۱۱ "کے" نارتھ کراچی

مطبوعہ کتابیں ـ خوابوں کی گلیاں (افسانے)

دھوکے بازوں کا شہر (افسانے)

زیرِ طبع ـ خندہ جبینی (مزاحیہ مضامین / کالم)

فصلِ عزا (سلام / رباعیاں)

محفوظ بک ایجنسی

مارٹن روڈ ـ کراچی ـ فون : ۴۲۴۲۸۶